یادگار: شہید پاکستان حکیم محمد سعید

اشاعت کا ۶۲ واں سال

ماہ نامہ ہمدرد نونہال

خاص نمبر

صدر نشین: سعدیہ راشد

مدیر اعلیٰ: مسعود احمد برکاتی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

شمارہ ۶ — جون ۲۰۱۴ عیسوی

جلد ۶۲ — شعبان المعظم ۱۴۳۵ ہجری

قیمت خاص نمبر ۵۰ روپے

قیمت عام شمارہ ۳۵ روپے

سالانہ (عام ڈاک سے) ۳۸۰ روپے

سالانہ (رجسٹری سے) ۵۰۰ روپے

سالانہ (دفتر سے خود لینے والا) ۳۲۰ روپے

سالانہ (غیر ممالک سے) ۵۰ امریکی ڈالر

ٹیلی فون ——— 36620945 – 36620949

36616004 – 36616001

ایکسچینج ——— (006 , 062 , 054)

ٹیلی فیکس نمبر ——— (92-021) 36611755

ای میل ——— info@hamdardfoundation.org

ویب سائٹ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان ——— www.hamdardfoundation.org

ویب سائٹ ہمدرد لیبارٹریز (وقف) ——— www.hamdardlabswaqf.org

ویب سائٹ ادارہ سعید ——— www.hakimsaid.info

دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

"ڈاک خانے کے نئے قاعدوں کی وجہ سے اب ہمدرد نونہال کی قیمت صرف بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں قابل قبول ہوگی۔ VPP بھیجنا ممکن نہیں ہے۔"

[illegible]

سعدیہ راشد پبلشر نے [illegible] پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی سے شائع کیا

سرورق کی تصویر	سیف اللہ فاروقی، امان اللہ فاروقی، راولپنڈی

ISSN 02 59-3734

اس شمارے میں کیا کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نونہالوں کے دوست اور ہمدرد
جاگو جگاؤ
شہید حکیم محمد سعید کی یاد رہنے والی باتیں

مہمان کی خاطر تواضع کرنا ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ کسی غریب سے غریب آدمی کے ہاں بھی مہمان آتے ہیں تو وہ ان کی زیادہ سے زیادہ خاطر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ بعض وقت میزبان نے خود بھوکا رہ کر مہمان کو کھلایا اور مہمان کو احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ اس کا میزبان خود بھوکا رہ گیا ہے۔

میزبان کی طرح مہمان کو بھی ایک مہذب انسان کی حیثیت سے اعلا اخلاق کا نمونہ ہونا چاہیے۔ مہمان کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے میزبان کے لیے زحمت اور تکلیف کا باعث نہ بنے۔ بے وقت نہ پہنچے، زیادہ نہ ٹھیرے۔ بعض لوگ کسی کے ہاں جانے سے پہلے اس کو اطلاع نہیں کرتے۔ بغیر اطلاع کے پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح میزبان بعض وقت پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بعض وقت یہ ہوتا ہے کہ جس کے ہاں مہمان پہنچے، وہ عین اسی وقت کسی ضروری کام سے جانے والا تھا۔ مہمان کو دیکھ کر اس کو مجبوراً رکنا پڑا اور اس کا کام خراب ہوا۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ جس وقت کوئی بن بلایا مہمان پہنچا، وہ وقت میزبان کے آرام کا تھا اور وہ تھک ہار کر ذرا سی دیر آرام کرنے لیٹا تھا یا وہ وقت اس کے کھانے کا تھا، مہمان کی وجہ سے وہ وقت پر کھانا نہیں کھا سکا۔

کراچی جیسے بڑے شہروں میں ایک خراب عادت لوگوں کی یہ بھی ہوگئی ہے کہ رات کو دیر سے کسی کے ہاں جاتے ہیں۔ رات کو دس گیارہ بجے کسی کے گھر جانے میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتے، حال آں کہ یہ طریقہ کسی لحاظ سے بھی درست نہیں ہے۔ ہمیشہ اطلاع کر کے کسی کے ہاں جاؤ یا اطلاع نہیں کر سکتے ہو تو کم سے کم اندازہ کر کے صحیح وقت پر جاؤ۔ زیادہ دیر نہ بیٹھو۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔ چلتے وقت میزبان کا شکریہ ادا کرو۔

میزبان کا فرض ہے کہ وہ مہمان کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئے اور مہمان کے چلتے وقت اس کو دروازے تک پہنچائے۔ ☆

(ہمدرد نونہال دسمبر ۱۹۹۴ء سے لیا گیا)

پہلی بات

مسعود احمد برکاتی

اس مہینے کا خیال

خاص نمبر پیش کرتے ہوئے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا خاص بات لکھوں؟ بہرحال خاص بات یہی ہے کہ خوب موٹا تازہ خاص نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے، آپ کا انتظار ختم ہوا۔ خاص نمبر پریس سے آتے ہی میں سب سے پہلے صدر ہمدرد محترمہ سعدیہ راشد کو پیش کروں گا۔ انھوں نے خاص نمبر کی تیاری شروع کرنے سے اب تک پوری دل چسپی کے ساتھ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ مجھے یقین ہے کہ خاص نمبر دیکھ کر وہ بھی شہید حکیم محمد سعید کی طرح خوش ہوں گی۔ حکیم صاحب "ہمدرد نونہال" کے بانی تو تھے ہی، اس کو نونہالوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے میں مستقل اور مسلسل شریک بھی رہتے تھے۔ ہمدرد نونہال کو نونہالوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور دل چسپ بنانے کی کوششوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ جب خاص نمبر نکلنے والا ہوتا تو میں چاہتا تھا کہ اس میں حکیم صاحب کی تحریر بھی ضرور ہو۔ میں ان سے درخواست کرتا اور وہ اپنی بے حساب مصروفیتوں کے باوجود خاص نمبر کے لیے ضرور لکھتے۔ حکیم صاحب کی تحریر زیادہ تر ان کے اپنے بچپن کے کسی واقعے کے بارے میں ہوتی تھی۔ بعد میں، میں نے حکیم صاحب کی ان تحریروں کو جمع کر کے ایک چھوٹی سی کتاب "وہ بھی کیا دن تھے" بنادی تھی، جو بہت پسند کی جارہی ہے۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

محترمہ سعدیہ راشد بھی خاص نمبر کے لیے لکھنے کا وقت نکال ہی لیتی ہیں۔ ان کی تحریر سبق آموز ہوتی ہے اور نونہال بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سعدیہ صاحبہ بھی بہت مصروف رہتی ہیں۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے فلاحی کاموں کے علاوہ ہمدرد یونی ورسٹی کے معیار کو بلند سے بلند معیار پر لے جانے میں بہت وقت دیتی ہیں۔ اسٹاف کی رہنمائی اور بہتر خدمت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ سعدیہ صاحبہ ہمدرد یونی ورسٹی کی چانسلر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ پبلی کیشنز ڈویژن کی نگرانی بھی ان کا وقت لیتی ہے۔ ہمدرد نونہال کے علاوہ ہمدرد صحت اور تین علمی رسائل کی اشاعت کے لیے سعدیہ راشد صاحبہ کو وقت نکالنا پڑتا ہے۔

ہمدرد نونہال خاص نمبر پیش کرتے ہوئے مجھے پوری اُمید ہے کہ نونہالوں کو بہت پسند آئے گا۔ خاص نمبر کے ۲۷۲ صفحات کا اعلان کیا گیا تھا لیکن آپ کے ہاتھوں میں ۳۰۴ صفحات کا خاص نمبر ہے۔ خاص نمبر کا تحفہ بھی بہت خاص ہے، کیوں کہ وہ ایک پوری کتاب ہے، مزے دار کہانیوں کی کتاب۔ یہ تحفہ "ہمدرد دواخانہ وقف" کی طرف سے ہے، جس کے لیے ہم محترم ڈاکٹر نوید الظفر صاحب (منیجنگ ڈائرکٹر، ہمدرد وقف) کے ممنون ہیں۔

قلمی معاونین کا شکریہ بھی کرتا ہوں۔ خاص نمبر جو کچھ ہے وہ ہمارے ان دوستوں ہی کا دیا ہوا ہے۔ میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ نونہال بھی ان کا شکریہ ادا کریں۔ میں ان ادیب اور شاعر دوستوں سے معذرت کرتا ہوں جن کی تحریر کسی مجبوری کی وجہ سے خاص نمبر میں شامل نہ ہو سکی۔ آیندہ شماروں میں ان شاء اللہ ان کی تحریریں شامل ہوں گی۔

خاص نمبر کی ترتیب و تیاری میں میرے ساتھی بھی شب و روز لگے رہے۔ سلیم فرخی، سیدہ نقوی، شکیل صدیقی، محمد اکرم خاں، عبدالجبار، فیصل علی احمد اور سید بابر علی نے اپنے اپنے حصے کے کام محنت اور خوبی سے انجام دیے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

☆☆☆

سونے سے لکھنے کے قابل زندگی آموز باتیں

روشن خیالات

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی صدقہ ہے۔

مرسلہ : ہادی اقبال، کراچی

حضرت ابوبکر صدیقؓ

سوال کا نرمی سے عمدہ جواب دینا حسنِ اخلاق ہے۔

مرسلہ : اویس نور دل گلانی، میر پور ماتھیلو

حضرت عمر فاروقؓ

غصے کے وقت انسان کے اخلاق کا صحیح پتا چلتا ہے۔

مرسلہ : ملک اکرم، لیاقت آباد

شیخ سعدیؒ

کسی کو اپنے نیک کام سے خوش کرنا، ہزار سجدے کرنے سے بہتر ہے۔ مرسلہ : علینہ حلیم رحیم یار خان

امام غزالیؒ

صبر کی کڑواہٹ، جسم کی مٹھاس اور عمل کی تلخی وہ دوا ہے، جس سے دل کی خرابی کا علاج ہوتا ہے۔ مرسلہ : عرشیہ بنت حبیب الرحمٰن، کراچی

بابا فرید گنج شکرؒ

اچھائی کرنے کے لیے ہمیشہ کسی بہانے کی تلاش میں رہو۔ مرسلہ: فرازیہ عائشہ اقبال، عزیز آباد

شہید حکیم محمد سعید

کتاب کھولتے رہیے، زندگی میں کامیابی کا ہر دروازہ کھلتا چلا جائے گا۔ مرسلہ: قمر تازہ دلی، کراچی

ارسطو

تمھارا دشمن خواہ مچھر سے بھی چھوٹا ہو، مگر اسے ہاتھی سے بھی بڑا سمجھو۔

مرسلہ: سیدہ ادیبہ بتول، کراچی

بطلیموس

مال دار بننا چاہتے ہو تو اپنی ضروریات کو کم کرو۔

مرسلہ: چنگیز بہار، بلوچستان

کنفیوشس

ایک اندھا اگر دوسرے اندھے کی قیادت کرے گا تو دونوں ہی غار میں گریں گے۔

مرسلہ : کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

نعتِ رسول ﷺ

حکیم خاں حکیم

کبھی جو ہم نے مدینے کے خواب دیکھے ہیں
دل و نگاہ میں کھلتے گلاب دیکھے ہیں

نظر نظر میں کئی تھے سوال پوشیدہ
نظر نظر سے اُمڈتے جواب دیکھے ہیں

جنھوں نے آپؐ کا دامن کبھی نہیں چھوڑا
وہ لوگ ہم نے بڑے کام یاب دیکھے ہیں

یہ سوچ کر کہ خدا کا نہ دین محو ہوا
مرے حضورؐ نے دکھ بے حساب دیکھے ہیں

درِ رسولؐ پہ پہنچے تو رحمتوں کے حکیم
زمینِ دل پہ برستے سحاب دیکھے ہیں

زندگی کا اُجالا

مسعود احمد برکاتی

"اللہ کی قسم! اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی غمگین نہیں کرے گا۔ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں، قرض داروں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کی دعوت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں اور مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔"

یہ الفاظ ایک بیوی کے ہیں۔ ایک ایسی بیوی کے جس نے ۲۵ برس تک اپنے شوہر کی زندگی دیکھی اور برتی تھی۔ یہ بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں اور انھوں نے یہ الفاظ اپنے سرتاج اور تمام عالموں کے سردار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمائے تھے۔ کسی کے کردار اور اخلاق کی سچی گواہی اس کی بیوی سے بڑھ کر کس کی ہو سکتی ہے۔

اخلاق صرف کسی سے اچھی طرح ملنے اور میٹھی زبان میں بات کرنے کا ہی نام نہیں ہے، بے شک یہ بھی اخلاق کا حصہ ہے، لیکن اخلاق پوری زندگی پر حاوی ہے۔ زندگی کا ہر کام، ہر واقعہ، ہر قول، ہر قدم اخلاق کے دائرے میں آتا ہے۔ اخلاق کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل خوبی اور سچائی کے ساتھ کیا جائے۔ اخلاق اُجالا ہے۔ اس اُجالے میں انسان کا ہر کام چمکنے لگتا ہے اور اس چمک سے خود وہ انسان ہی نہیں، دوسرے انسانوں کی زندگی بھی چمک دار ہو جاتی ہے۔ اخلاق کا دائرہ بہت وسیع ہے،

بہت پھیلا ہوا ہے۔ اس دائرے سے باہر انسان کا کوئی عمل نہیں ہے، اس لیے اگر کسی انسان کے اخلاق پر رائے دینی ہو تو اس کی صرف باتوں پر نہ جاؤ، اس کے دوسرے عمل بھی دیکھو۔ اس کے بیوی بچوں سے پوچھو، اس کے پڑوسیوں سے معلوم کرو، اس کے دوستوں کی رائے لو، اس کے گاہکوں سے، اس کے افسروں سے، اس کے ماتحتوں سے، اس کے مخالفوں سے، یہاں تک کہ اس کے دشمنوں سے سوال کرو۔ ان کے جوابوں کی روشنی میں اس انسان کے اخلاق کا فیصلہ کرو۔

اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اخلاق کا بہترین نمونہ ہے، اعلا ترین مثال ہے۔ یہ نمونہ کامل بھی ہے اور دائم بھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو ہمارے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ آپؐ کی نقل اور پیروی کو اللہ نے اپنی پیروی قرار دیا ہے۔ حضورؐ نے بھرپور زندگی بسر کی۔ آپؐ دنیا سے الگ ہو کر کونے میں نہیں بیٹھ گئے۔ آپؐ نے ایک فرد کی حیثیت سے، ایک تاجر کی حیثیت سے، ایک شوہر کی حیثیت سے، ایک بھائی کی حیثیت سے، ایک بزرگ اور باپ کی حیثیت سے، ایک دوست کی حیثیت سے، ایک حاکم کی حیثیت سے، غرض انسان کی ہر حیثیت سے زندگی بسر کی۔ آپؐ سے خود اللہ تعالیٰ نے کہلوایا:

''کہہ دو میں تمھارے ہی جیسا انسان ہوں۔'' (سورۂ کہف: آیت نمبر ۱۱۰)

حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنایا اور انسانیت کے سب سے بڑے مرتبے پر فائز کیا تھا اور آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے نمونہ بنایا تھا، اس لیے

آپؐ عام لوگوں کی زندگی سے دور ہو کر کس طرح نمونہ بن سکتے تھے۔ آپؐ نے عام انسانوں کی سی زندگی بسر کی۔ نہ دنیا کو چھوڑا اور نہ مشکل راستہ اپنایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور کو جب دو باتوں میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار دیا جاتا تو آپؐ ان میں سے جو بات آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے، بشرطے کہ وہ گناہ نہ ہو۔

آپؐ ہر کام میں اپنے ساتھیوں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ حصہ لیتے اور کبھی اپنی بڑائی نہ جتاتے۔ دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے۔ باتیں ٹھیر ٹھیر کر اس طرح فرماتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو یاد رکھ سکے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ حضورؐ کے چچا زاد بھائی اور داماد تھے۔ حضورؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی تربیت فرمائی تھی۔ ۲۳ سال سے زیادہ مدت تک آپؐ کا ساتھ رہا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کسی کو بُرا نہیں کہتے تھے۔ کسی کے عیب نہیں نکالتے تھے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وہی باتیں کرتے تھے جن کا کوئی فائدہ ہو۔ کوئی دوسرا بات کرتا ہوتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا آپؐ خاموشی سے سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے، آپؐ بھی مسکرا دیتے، جن باتوں پر تعجب کرتے آپؐ بھی کرتے، کوئی باہر کا آدمی اگر بے باکی سے بات کرتا تو آپؐ گوارا کر لیتے، دوسروں کے منھ سے اپنی تعریف سننا آپؐ کو اچھا نہیں لگتا تھا، لیکن اگر کوئی آپؐ کے احسان یا انعام کا شکریہ ادا کرتا تو آپؐ قبول فرما لیتے۔ آپؐ کسی کی بات

درمیان سے نہ کاٹتے۔ آپؐ نہایت سخی تھے۔ سچے تھے۔ نرم مزاج تھے۔

کسی سے ملتے وقت ہمیشہ پہلے سلام کرتے، مصافحہ کرتے۔ کوئی شخص جھک کر آپؐ کے کان میں کچھ کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منھ نہ ہٹا لے۔ کسی سے مصافحہ کرتے تو اس وقت تک اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے۔

نبوت سے پہلے بھی لوگ آپؐ کے اعلا اخلاق کے قائل تھے۔ آپؐ تجارت فرماتے تھے۔ جن لوگوں سے آپؐ کا واسطہ پڑتا تھا وہ آپ کی سچائی، دیانت اور امانت کے گواہ تھے، اسی لیے قریش نے آپؐ کو متفقہ طور پر ''امین'' کا خطاب دیا تھا۔

ایک بار ایک شخص سے آپؐ نے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں۔ چند دن بعد وہ تقاضے کے لیے آیا۔ آپؐ نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا کہ اس کا قرض ادا کر دیں۔ صحابیؓ نے اس شخص کو جو کھجوریں دیں، وہ اتنی عمدہ نہیں تھیں جتنی اس شخص نے حضورؐ کو دی تھیں۔ اس شخص نے لینے سے انکار کر دیا۔ صحابیؓ نے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی کھجوریں لینے سے انکار کرتے ہو۔

وہ شخص کہنے لگا: ''ہاں، رسول اللہؐ انصاف نہیں کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے۔''

حضورؐ نے یہ الفاظ سنے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپؐ نے فرمایا: ''یہ بالکل سچ ہے۔''

☆

ہمارے قلم کار — نئے اور پرانے

(بلا ترتیب)

ہمدرد نونہال ۱۹۵۲ء میں جاری ہوا ہے۔ اب تک اس میں جن ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ اگر کچھ نام رہ گئے ہوں تو ہمیں مطلع فرمائیں۔ یہ نام آئندہ شائع کر دیے جائیں گے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی، محمد احمد سبزواری، اعجاز الحق قدوسی، خالدہ سلطانہ، عبدالواحد سندھی، حامد اللہ افسر، علی ناصر زیدی، محشر بدایونی، مسلم ضیائی، اشرف صبوحی، سید علی اسد، عشرت رحمانی، پروفیسر حبیب اللہ رشدی، محمد حسین حسان، تسلیم الٰہی زلفی، قمر ہاشمی، اختر احمد برکاتی، شاعر لکھنوی، عبداللہ خاور، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، سید ابوالانشاء، وحیدہ نسیم، ماہر القادری، ساقی فاروقی، عبدالحمید نظامی، عارف حجازی، الطاف فاطمہ، ایم اسلم، کوثر چاند پوری، سحر انصاری، مناظر صدیقی، حسن ذکی کاظمی، سلطان جمیل نسیم، رفیع الزماں زبیری، طالب ہاشمی، تنویر پھول، سلیم فرخی، پروفیسر انجم اعظمی، فتح علی انوری، ڈاکٹر اسلم فرخی، غلام حسین میمن، ادیب سمیع چمن، مرزا ظفر بیگ، حکیم ابراہیم شاہ، اشتیاق احمد، ضیاء الحسن ضیاء، وقار محسن، نذیر انبالوی، ذکیہ بلگرامی، عباس العزم، شان الحق حقی، ثاقبہ رحیم الدین، ڈاکٹر اسد اریب، خانزادہ سمیع الوری، حمیرا اسید، امان اللہ نیر شوکت، ناصر زیدی، انوار آس محمد، نسرین شاہین، انور فرہاد، حکیم خاں حکیم۔ معراج (خواجہ محمد عارف)، کھتری عصمت علی پٹیل، انور شعور، فیض لدھیانوی، عبدالغنی شمس، عفت گل اعزاز، سرور بجنوری، احمد خاں خلیل، احمد ہمدانی، سید رشید الدین احمد، ابرار محسن، سرشار صدیقی، عنبر چغتائی، ثمینہ پروین، نوشاد عادل، جدون ادیب، محمد عمران اسحاق۔

☆

حکیم

شاعر لکھنوی

ہاتھ میں اس کے نبض کی رفتار
کرتا جاتا ہے دھڑکنوں کا شمار

یہ اشاروں سے بھانپتا ہے مرض
نام سے اس کے کانپتا ہے مرض

دُکھ پرکھنے کا جانتا ہے ہنر
ہے بھروسا خدا کی رحمت پر

کیوں نہ ہو نسخۂ شفا کافی
اس کا ایمان ہے "ہوالشافی"

فکرِ صحت ہے اس کے فن کا کمال
یہ نہیں کھینچتا مریض کی کھال

اپنی طب پر ہے اعتبار اس کا
دوسروں پر نہیں مدار اس کا

دھن ہے اس کو کہ جڑ سے جائے مرض
بینک بیلنس سے نہیں ہے غرض

دوسرے دیس کی دواؤں کا
قوم پر تجربہ نہیں کرتا

چھوٹی بُوٹی ہو یا بڑی بُوٹی
اپنے ہی دیس کی جڑی بُوٹی

جو بھی ہوتی ہے شرق میں پیدا
اس کی فطرت اُسی کی ہے شیدا

مشرقی ملک کی دواؤں سے
کبھی پرہیز سے، غذاؤں سے

جس کا جیسا مزاج ہوتا ہے
اُس کا ویسا علاج ہوتا ہے

اُس کو آتی نہیں ریاکاری
یہ بڑھاتا نہیں ہے بیماری

دُکھ بٹانا ہے خاص کام اس کا
اپنی خدمت سے ہے مقام اس کا

اس کو جاں سے عزیز ملت ہے
اس کی سائنس اس کی خدمت ہے

بابا! من کی آنکھیں کھول!

شہید حکیم محمد سعید

نونہالو! میرے بچپن میں ایک فقیر تھا۔ صدائیں لگاتا تھا: ''بابا! من کی آنکھیں کھول!'' میں سوچا کرتا تھا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ آنکھیں تو تن کی ہوتی ہیں۔ ہر انسان کے ماتھے کے نیچے ایک محفوظ جگہ میں لگی ہوئی ہیں، پھر یہ من کی آنکھیں کیا ہیں؟ فقیر صدائیں لگاتا اور میں سوچ میں پڑ جاتا۔ پھر جب میں نے قرآن حکیم پڑھنا شروع کیا تو ایک آیت مبارکہ پڑھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لوگ حق سے دور ہو جاتے ہیں اور ہدایت قبول نہیں کرتے وہ نہ سن سکتے ہیں، آنکھیں ہیں، مگر دیکھ نہیں سکتے اور نہ بول سکتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ تن کی آنکھیں اور ہیں اور من کی آنکھیں کوئی اور! اور من کے کان بھی اور ہیں۔ نونہالو! بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئی۔

بابا! من کی آنکھیں کھول!

بڑا ہوا تو فقیر کی یہ صدا سمجھ میں آئی۔ نونہالو! ایک تو بصارت ہوتی ہے، یعنی آنکھوں کی روشنی۔ ایک ہوتی ہے بصیرت۔ یعنی دانائی، ہوش مندی، دور جا کر سوچنے کی قوت۔ یہ من کی آنکھیں ہیں۔ یہ انسان کے چہرے کے ساتھ لگی نہیں ہوتی ہیں۔ دل کے اندر ہوتی ہیں۔ یہ دل کی آنکھیں اندھیروں میں بھی چیزیں دیکھ لیتی ہے۔ بصیرت بڑی چیز ہوتی ہے۔

بصارت سے بڑی چیز! ایک انسان تکلیف میں ہے، مگر اس کی تکلیف بصیرت ہی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ بصارت تکلیف کو دیکھ نہیں سکتی۔ فرض کر و کہ تمھارے سر میں درد

ہے۔تم کہتے ہو: ''حکیم صاحب! میرے سر میں درد ہے۔''

میں سوال کرتا ہوں: ''اچھا درد مجھے دکھاؤ؟''

نونہالو! کیا تم مجھے اپنا درد دکھا سکتے ہو؟ نہیں دکھا سکتے۔ اگر میری بصیرت سالم ہے تو میں تمھارا درد دیکھ سکتا ہوں۔ یہ من کی آنکھیں ہی ہیں جو ہر طرح دیکھ سکتی ہیں۔ غریبوں کی فریادیں، ناداروں کی فاقہ کشیاں، محروموں کی آرزوئیں، مجبوروں کی آہیں، اگر ماتھے کی آنکھیں دیکھ سکتیں تو پاکستان میں کوئی فقیر نہ ہوتا۔ یہ تمام چیزیں دیکھنے کے لیے بصیرت چاہیے۔ یعنی ضمیر اور دل کی آنکھیں۔

بابا! من کی آنکھیں کھول!

نونہالو! اب تمھاری سمجھ میں آ گئی۔ فقیر کہتا ہے دل کی آنکھیں کھولو، تاکہ تم کو بنی نوع انسان کا دکھ درد محسوس ہو۔

نونہالو! کیا یہ آنکھیں روز نہیں دیکھتیں کہ ہزاروں، لاکھوں انسان چھت کے نیچے

نہیں، آسمان تلے سو رہے ہیں اور سخت سردی ان کو اکڑا رہی ہے؟ تن کی آنکھیں روز ہی دیکھتی ہیں کہ نونہال سڑکوں پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ ماتھے والی آنکھیں روز یہ تماشا دیکھتی ہیں کہ محترم انسان بے آبرو ہو رہا ہے۔ قتل کیا جا رہا ہے، اغوا کیا جا رہا ہے، پریشان کیا جا رہا ہے۔ نونہالو! پاکستان میں یہ آنکھیں نابینا ہیں۔ اسی لیے تو فقیر صدا لگاتا ہے: بابا! من کی آنکھیں کھول، تاکہ تجھے بے بس انسانوں کا دکھ نظر آئے۔ ☆

شہیدِ پاکستان کی یاد میں

مہتاب عالم مہتاب

حکمت کے لیے ایک نمایاں نوید تھا
ہمدرد نونہال کا یہ جو سعید تھا

اللہ کے کرم سے تھے حاصل ، کئی ہنر
رکھتا تھا خوب ، وقت کی رفتار پر نظر

لکھنے کا اور پڑھنے پڑھانے کا کام تھا
تاریکیوں میں دیپ جلانے کا کام تھا

ایمان میں ، یقین میں وہ باکمال تھا
اپنی مثال آپ تھا یا بے مثال تھا

انسانیت کا درس تھا ہر دم زبان پر
سو جان سے قربان تھا ، ملت کی آن پر

بے کار نہیں ہے یہ شہادت سعید کی
ہر دور میں رہی ہے ضرورت شہید کی

عالم کا یہ کلام شہیدوں کے نام ہے
تم جیسے محسنوں کو ہمارا سلام ہے

☆

عمارت نمبر بتیس

انوار آس محمد

یہ ۱۹۷۰ء کا ذکر ہے۔ کراچی کے علاقے لیاقت آباد میں الکرم اسکوائر کی بلڈنگ کے پیچھے بہت ساری زمین تھی، جس پر حکومت نے تین تین بلاک بنا دیے تھے۔ وہاں لوگ آباد ہونا شروع ہو گئے تھے، لیکن کچھ فلیٹ خالی بھی تھے۔ آپ اس واقعے کے بارے میں کسی بزرگ سے یا وہاں کے پرانے رہنے والوں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ آج تو وہاں بہت سارے فلیٹ بن چکے ہیں۔ جس وقت کی یہ بات ہے اُس زمانے میں تمام بلاکوں کے درمیان سو گز سے زیادہ فاصلہ تھا اور ہر بلاک کے ساتھ ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا۔

وہیں ایک عمارت تھی، جس کی بنیاد بہت کم زور تھی اور وہ زمین میں دھنسنے لگی تھی۔ وہ تقریباً چار فیٹ زمین میں دھنس چکی تھی۔ اُس عمات کو خالی کروالیا گیا تھا اور اُس میں لکڑی کی موٹی موٹی بلّیاں بطور ستون لگا کر اسے دھنسنے سے روکا گیا تھا۔ جلد ہی وہ دھنسنے والی عمارت

سارے علاقے میں مشہور ہو گئی۔ لوگ اُس کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے تھے اور ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق اُس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بھی کرتا تھا۔ کوئی کہتا کہ مزدوروں کی غلطی ہے، کوئی کہتا کہ ناقص سیمنٹ بجری لگائی گئی ہے اور کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس عمارت میں آسیب کا سایہ ہے۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں۔

میں بھی اُسی علاقے میں رہتا تھا۔ میرے ابو کو آفس کی طرف سے وہاں ایک فلیٹ ملا تھا۔ میں اپنی سائیکل پر اُس عمارت کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اُن دنوں میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ یہ کہانی دھنسنے والی عمارت کی نہیں، یہ کہانی عمارت نمبر ۳۲ کی ہے، جو دھنسنے والی عمارت نمبر ۳۱ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ عمارت نمبر ۳۲ ابھی تک خالی تھی اور مجھے وہ بھوت گھر سے کم نہیں لگتی تھی۔ ہماری عمارت کا نمبر ۳۳ تھا اور یہ تینوں عمارتیں ایک

ہی قطار میں کھڑی تھیں۔

یہ بات آپ کو بتائی جا چکی ہے کہ لوگ دھنسی ہوئی عمارت کو دیکھنے آتے تھے۔ پھر ہوا یوں کہ اس علاقے سے بچے غائب ہونا شروع ہوگئے۔ شروع شروع میں یہ بات اتنی مشہور نہ ہوئی، مگر جب زیادہ بچے اغوا ہونے لگے تو لوگوں میں اُس عمارت کی وجہ سے خوف پھیل گیا اور رفتہ رفتہ وہاں لوگوں نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ زندگی معمول پر تھی۔ میں گرمی کی ایک دوپہر میں اپنی سائیکل پر گھر جا رہا تھا کہ مجھے اچانک دھنسی ہوئی عمارت دیکھنے کا خیال آیا۔ گو کہ میں بہت ڈرا ہوا تھا، لیکن پھر بھی دل چاہا کہ ایک بار وہاں جایا جائے۔ میں نے سائیکل کا رخ اُس عمارت کی طرف موڑ دیا۔ میں دو ہی منٹ میں اُس عمارت کے سامنے تھا۔ وہاں اُس وقت کوئی بھی نہ تھا اور دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گرمی کی دوپہر میں لوگ گھروں سے کم نکلتے تھے۔ میں عمارت کو بغور دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک زوردار

چیخ سنائی دی۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ چیخ عمارت نمبر ۳۲ سے آئی تھی۔ میرا خوف سے بُرا حال ہو گیا۔ میں نے فوراً اپنی سائیکل چلا دی۔ مجھے عمارت نمبر ۳۲ کی کھڑکی میں کوئی کھڑا ہوا بھی نظر آیا۔ میں اتنی رفتار سے جا رہا تھا کہ میں نے اس پر دھیان نہیں دیا اور اپنے گھر آ کر ہی سانس لیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عمارت نمبر ۳۲ تو خالی تھی پھر اُس کی تیسری منزل کی کھڑکی میں کون کھڑا تھا؟ میں اکثر اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک دن میں نے اپنی امی سے پوچھا: ''امی! ہمارے برابر والی عمارت اب تک خالی ہے کیا؟''

''نہیں بیٹا! اب وہاں تیسری منزل پر، رابرٹ صاحب اور اُن کی بیوی ماریہ آ گئے ہیں، باقی بلڈنگ خالی ہے۔'' امی نے جواب دیا۔

''کیا وہ عیسائی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! وہ مجھ سے ملنے آئے تھے، تم اُس وقت گھر پر نہیں تھے۔''

''اُن کے بچے بھی تھے؟'' دور بیٹھے ابو بھی گفتگو میں شریک ہو گئے۔

''نہیں، بے چاروں کی کوئی اولاد نہیں۔'' امی نے اُن پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔

اوہ! تو وہاں لوگ آ گئے ہیں اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میں نے سوچا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ چھٹی والے دن رابرٹ صاحب اپنی بیگم کے ساتھ ہمارے گھر چلے آئے۔ اُس دن میں نے پہلی بار انھیں دیکھا۔ وہ دونوں امی ابو سے باتیں کر رہے تھے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ رابرٹ صاحب جنھیں میں اب انکل بھی کہہ رہا تھا،

مجھے اور میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو گھور رہے ہیں۔ مجھے بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بچوں کے غائب ہونے کی باتیں بھی کر رہے تھے اور اغوا کرنے والوں کو بُرا بھلا بھی کہہ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے انکل رابرٹ اور آنٹی ماریہ بہت مشکوک سے لگے۔ جاتے جاتے انھوں نے ہم سب بہن بھائیوں کو پیار بھی کیا۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو مجھے اندازا ہوا کہ انکل رابرٹ کا ہاتھ بہت سخت تھا۔ اس دن ان لوگوں کے بارے میں مزید باتیں پتا چلیں۔ وہ یہ کہ انکل رابرٹ اور ماریہ آنٹی پہلے راولپنڈی میں رہتے تھے۔ دونوں کالج میں پڑھاتے تھے، مگر اب وہ ریٹائر ہو کر کراچی شفٹ ہو چکے تھے۔ پینشن سے ان کا گزارا ہو رہا تھا۔ ان کی نہ کوئی اولاد تھی اور نہ رشتے دار تھا۔ وہ دنیا میں اکیلے تھے۔ امی بھانپ چکی تھیں کہ مجھے رابرٹ انکل پسند نہیں آئے۔

''کیا بات ہے عامر؟'' انھوں نے مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں امی! بس مجھے انکل رابرٹ سے ڈر لگا۔'' میں نے امی سے دل کی بات کہہ دی۔

''ارے بھئی وہ کیوں؟'' امی نے حیرت سے پوچھا۔

پھر میں نے ہمت کر کے امی کو اس دن کی بات بتا دی، جب میں نے چیخ سنی تھی۔

''بیٹا! ہو سکتا ہے رابرٹ صاحب ہی چیخ سن کر کھڑکی پر آ گئے ہوں۔''

''امی! مجھے لگا تھا کہ چیخ ان کے گھر ہی سے آئی ہے۔'' میں نے کہا۔

میری بات پر امی مسکرا دیں اور کہا: ''عامر! بلاوجہ شک نہیں کرتے۔''

امی کی باتوں سے میں مطمئن تو نہیں ہوا تھا، لیکن ایک دلاسا ضرور مل گیا، لیکن اب

میں عمارت نمبر ۳۲ کے پاس سے نہیں گزرتا تھا۔ میں سب کچھ بھول کر اپنی پڑھائی پر توجہ دے رہا تھا۔ کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ بچوں کے اغوا ہونے کی خبریں بھی آتی رہتی تھیں۔ ایک دن میں تیز تیز سائیکل چلاتے ہوئے گھر واپس آ رہا تھا کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا کہ انکل رابرٹ دھنسی ہوئی عمارت سے نکل رہے ہیں۔ ان کو وہاں سے آتا دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں نے بلا ارادہ سائیکل روک دی۔

''گڈ آفٹرنون؟'' انھوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔

میں نے ان سے پوچھا: ''انکل! آپ یہاں؟''

''بس بیٹا! یوں ہی آ گیا تھا، یہ عمارت دیکھنے۔'' انھوں نے کہا۔

''جی اچھا۔'' میں اتنا کہہ کر وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ انھوں نے مجھے روکا۔ اس بلڈنگ میں کوئی نہیں جاتا تھا، کیوں کہ وہ گر بھی سکتی تھی۔ پھر وہاں رابرٹ انکل کیوں گئے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جب انھوں نے مجھے روکا تو میری جان نکل گئی۔

''جی انکل!'' میں نے کہا، لیکن ساتھ ہی میں تیار تھا کہ سائیکل چلا دوں۔ وہ بھانپ گئے کہ میں رکنا نہیں چاہتا، اس لیے انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کو کہہ دیا اور میں ایک منٹ بھی وہاں نہیں رکا۔

وہ رات بہت عجیب تھی۔ رات کے سناٹے میں پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیاں عمارت نمبر ۳۲ کے پاس آ کر رکیں۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے۔ پولیس نے وہاں چھاپا مارا اور دوسری منزل سے اغوا شدہ ۴ بچے برآمد کر لیے۔ پولیس پوری بلڈنگ کی

تلاشی لے رہی تھی۔ بلڈنگ میں کوئی نہیں تھا۔ انکل رابرٹ اور آنٹی ماریہ تالا لگا کر کہیں جا چکے تھے۔

"یہاں اس بلڈنگ میں کوئی رہتا ہے؟" پولیس انسپکٹر نے لوگوں سے پوچھا۔

ہر شخص نے یہی کہا کہ عمارت نمبر ۳۲ تو خالی ہے اور وہاں کوئی نہیں رہتا۔ لوگوں کی باتیں سن کو میرا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں نے اپنے ابو کی طرف دیکھا، وہ بھی خاموش کھڑے تھے اور انھوں نے مجھے بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ شاید وہ کوئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ کیا انکل رابرٹ اور آنٹی ماریہ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا؟ وہ تو عمارت نمبر ۳۲ کی تیسری منزل پر رہتے تھے۔ میں نے سوچا۔

"ہم اس عمارت کو فی الحال بند کر کے سیل لگا رہے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق ایک مرد اور عورت شہر بھر سے بچے اغوا کر رہے ہیں۔ آپ لوگ ذرا ہوشیار رہیے گا۔" پولیس انسپکٹر نے وہاں جمع ہونے والے لوگوں کو بتایا۔

اس کے بعد پولیس نے عمارت نمبر ۳۲ کو بند کر دیا۔ ابو نے مجھے گھر آ کر بتایا کہ رابرٹ صاحب ایک ہفتے پہلے ہی فلیٹ خالی کر کے چلے گئے تھے، اس لیے وہ پولیس کے سامنے خاموش رہے۔ اس بات کو کئی ہفتے گزر گئے۔ جب میں اسکول آتے جاتے دھنسی ہوئی عمارت اور عمارت نمبر ۳۲ کو دیکھتا تو مجھے ان دونوں میں کوئی گہرا تعلق لگتا تھا۔

ایک شام میں اپنے محلے کے دوستوں کے ساتھ میدان میں فٹ بال کھیل رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہر عمارت کے درمیان سو گز سے زیادہ کا فاصلہ تھا، اس لیے ہر کھیل ہم آسانی سے کھیل لیا کرتے تھے۔ میں گول کیپر بنا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر عمارت نمبر ۳۲

کی تیسری منزل پر گئی تو وہاں مجھے کوئی کھڑکی میں کھڑا نظر آیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ میں نے تمام لڑکوں کو اپنے ساتھ جمع کیا اور سب کو بتایا کہ وہاں کوئی ہے۔ بس پھر کیا تھا، پوری فٹ بال ٹیم عمارت کے سامنے تھی۔ وہاں تو اب بھی پولیس کا تالا لگا ہوا تھا۔ پھر میں نے لڑکوں کو یہ بھی بتایا کہ ایک بار میں نے یہاں سے چیخ بھی سنی تھی جو کسی بچے کی تھی۔ سب لڑکے میری باتیں سن کر حیران تھے۔ اس کے بعد ہم سب اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔ میں جب گھر آیا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا، کیوں کہ انکل رابرٹ اور آنٹی ماریہ ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ امی ابو کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

''گڈ ایوننگ!'' انکل نے مجھے دیکھ کر کہا۔ میں نے بھی جواباً گڈ ایوننگ کہا اور مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں آ کر میں بستر پر ڈھیر ہو گیا اور سوچنے لگا کہ انکل رابرٹ یہاں ہیں تو ان کے فلیٹ کی کھڑکی پر کون کھڑا تھا؟ ایک بار پھر میرا دماغ اُلجھ گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں امی میرے کمرے میں آئیں اور انھوں نے مجھے بتایا کہ انکل رابرٹ اب ہماری ہی عمارت کی تیسری منزل پر رہنے آ رہے ہیں۔ انھیں یہ علاقہ پسند آ گیا ہے۔ ہماری تیسری منزل خالی ہونے والی تھی۔ پھر دو ہفتے بعد ہی انکل رابرٹ ہماری بلڈنگ میں آ بسے۔ میں بالکل خوش نہیں تھا۔ اب حال یہ ہو گیا کہ اکثر انکل رابرٹ سے سیڑھیوں پر ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں ان سے دور دور رہتا تھا، مگر وہ ہمیشہ میرے قریب آ جاتے تھے۔ ایک دن وہ ہاتھ میں ایک تھیلی لے کر نیچے اُتر رہے تھے، جس میں سے بہت بدبو آ رہی تھی۔

''انکل! کیا ہے اس تھیلی میں؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"گندا سڑا ہوا گوشت ہے، دیکھو گے۔" انھوں نے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا، جیسے میرا پوچھنا ان کو بُرا لگا ہو۔

"جی نہیں۔" یہ کہتا ہوا میں اپنے گھر میں داخل ہوا اور امی کو بتایا کہ انکل نے کس طرح بات کی۔

"ہاں، آج ان کا موڈ خراب ہے۔ ان کا مچھلی کھانے کو دل چاہا تھا، مگر مچھلی والے نے ان کو سڑی ہوئی مچھلی دے دی، اب غصے میں واپس کرنے گئے ہیں۔" امی نے ساری تفصیل بتا دی۔

"اوہ! اچھا۔" میرے منھ سے نکلا۔

میری ان دنوں دلی خواہش تھی کہ انکل رابرٹ فلیٹ کی عمارت چھوڑ کر چلے جائیں۔

اچانک میری زندگی کا سب سے خطرناک حادثہ ہوا، جس کو بتاتے ہوئے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ اس رات لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے بجلی نہیں تھی۔ گرمی بہت شدید تھی اور چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات نو بجے کا وقت تھا۔ میں گرمی کی وجہ سے باہر نکل آیا تھا، تاکہ باغیچے میں بیٹھ جاؤں۔

"بیٹا عامر! زیادہ دور مت جانا۔" امی نے کہا۔

جیسے ہی میں عمارت سے باہر آیا، میں نے انکل رابرٹ کو دھنسی ہوئی عمارت کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ میں بھی دبے پاؤں ان کے پیچھے چلنے لگا۔ میں ان سے فاصلے پر تھا۔ وہ دھنسی ہوئی عمارت کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں ان سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا اور عمارت نمبر ۳۲ کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ یکا یک کسی نے پیچھے سے میرے

سر پر پنچ مارا اور میرا سر چکرا گیا۔ میں پیچھے مڑا تو اپنے پیچھے اندھیرے میں ایک عورت کو کھڑا دیکھا۔

"آنٹی ما...... ریہ۔" میرے منھ سے نکلا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک کمرے میں بند پایا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور منھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، یہاں تک کہ کان میں بھی روئی ٹھنسی ہوئی تھی۔ میں کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا، صرف رو سکتا تھا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور نہ جانے اب میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کاش! میں امی کی بات مان لیتا اور گھر کے پاس ہی رہتا۔ امی نے مجھے دور جانے سے منع کیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، مگر اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں کہاں ہوں، کس علاقے میں ہوں۔

مجھے صبح شام ایک کالا سا موٹا آدمی کھانا دے جاتا تھا۔ پانی کا ایک کولر کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ مجھے بھوک ہی نہیں تھی، مگر جب تک کچھ نہ کھاتا وہ موٹا میرے ساتھ کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے زبردستی کچھ نوالے کھانا پڑتے تھے، تاکہ وہ چلا جائے۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا تھا اور میں کچھ پوچھتا بھی تو مجھے ڈانٹ کر چپ کروا دیتا۔ اب میں بالکل نڈھال ہو کر کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ رو رو کر میرا بُرا حال تھا۔ میں ہر حال میں اپنے گھر جانا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کام انکل رابرٹ کا ہی ہے۔

میری وہاں تیسری رات تھی کہ اچانک مجھے پولیس کی سائرن بجاتی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ گاڑی نزدیک ہی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ کان میں روئی ٹھنسی ہونے کے باوجود میں سائرن سن سکتا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرے کمرے کا دروازہ دھڑام

سے کھلا اور چند پولیس والے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ابو اور انکل رابرٹ بھی تھے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ صرف اتنا پتا تھا کہ اللہ نے میری سن لی تھی اور میں اب آزاد ہو چکا تھا۔ جب پولیس مجھے کمرے سے باہر لائی تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہی، میں دھنسی ہوئی عمارت کی تیسری منزل پر قید کیا گیا تھا۔ موٹے کالے آدمی اور عورت کو بھی پولیس نے گرفتار کر لیا تھا وہ دوسرے کمرے میں تھے۔ یہی دونوں بچوں کو اغوا کرتے تھے اور خالی عمارت میں چھپا دیتے تھے، تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔

پولیس ہمیں ضروری کارروائی کے لیے تھانے لائی تھی۔ وہاں مجھے پتا چلا کہ مجھے اغوا کرنے والے وہی موٹا آدمی اور عورت تھی۔ آنٹی ماریہ نے نہیں، بلکہ اس عورت نے میرے سر پر ڈنڈا مارا تھا۔ وہ اندھیرے میں تھی، اس لیے میں اس کو آنٹی ماریہ سمجھا تھا۔ وہ میرے ابو سے مجھے چھوڑنے کے پانچ لاکھ روپے مانگ رہے تھے۔ جب کہ انکل رابرٹ ہی پولیس کو دھنسی ہوئی عمارت پر لے کر آئے تھے۔ وہاں انکل رابرٹ نے بتایا کہ انھیں بہت دنوں سے شک تھا کہ دھنسی ہوئی عمارت میں کوئی آتا جاتا ہے وہ عمارت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ پھر ان کی نظر ایک روز موٹے آدمی پر پڑی تو وہ پولیس کو لے آئے اور پولیس نے مجھے چھڑوا لیا۔

''بیٹا! رابرٹ صاحب کا ہم پر احسان ہے، ورنہ نہ جانے تمھارے ساتھ کیا ہوتا۔'' ابو نے مجھے بتایا۔

میں نے انکل رابرٹ کا شکریہ ادا کیا اور اُن سے لپٹ گیا۔ میں نے ان کو کتنا غلط

سمجھا تھا۔ انکل رابرٹ نے بچوں کو اغوا کرنے والوں کو بھی پکڑوا دیا تھا۔ پولیس نے بھی انکل رابرٹ کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ہم لوگ گھر آ گئے۔ امی نے مجھے بہت پیار کیا۔ میں گھر آ کر بہت خوش تھا۔

اس واقعے کے بعد میں انکل رابرٹ کی بہت عزت کرنے لگا تھا اور ان پر شک کرنا چھوڑ چکا تھا۔ میں ان کے کام بھی کرتا تھا، کیوں کہ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اب میں ان کا بیٹا بن گیا تھا۔ ایک روز میں انکل رابرٹ کے ساتھ عمارت نمبر ۳۲ کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اچانک چیخ سنائی دی۔ میں نے فوراً فلیٹ کی طرف دیکھا تیسری منزل کی کھڑکی پر کوئی کھڑا ہوا تھا، جو میری نظر پڑتے ہی ہٹ گیا۔ پھر میری نظر عمارت کے دروازے پر گئی، وہاں اب تک پولیس کا تالا لگا ہوا تھا۔ کون ہے جو بند دروازے سے اندر چلا جاتا ہے۔ میں نے سوچا اور جب میں نے انکل رابرٹ کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے۔

''انکل! آپ نے چیخ سنی؟'' میں نے پوچھا۔

انھوں نے سر ہاں میں ہلا دیا اور بولے: ''بیٹا! میں تو اس فلیٹ میں رہ بھی چکا ہوں۔ یہ عمارت خالی ہے۔ یہاں کوئی نہیں رہتا۔ جب میں یہاں رہنے آیا تھا تو ہمیں بھی عجیب عجیب آوازیں آتی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی اور بھی یہاں رہتا ہو۔ شاید یہاں دوسری دنیا کے لوگ آباد ہیں۔ جو کبھی کبھی اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ ہمیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم کسی کو بھی تنگ نہ کریں۔ تو پھر کوئی ہم کو بھی تنگ نہیں کرے گا، اس لیے ہم نے فلیٹ خالی کر دیا تھا۔''

انکل رابرٹ بتا رہے تھے اور میں حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ☆

امّی جان

سعدیہ راشد

نونہالو! اب تک آپ اپنی نئی جماعتوں میں پہنچ چکے ہوں گے۔ نئی کتابیں بھی خریدنی ہوں گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ آج کل آپ اپنی کتابوں پر براؤن پیپر سے کور چڑھاتے ہیں یا نہیں۔ جب میری بچیاں چھوٹی تھیں تو انھیں نئی کتابوں پر کور چڑھانے اور اُن پر اپنا نام لکھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ تینوں بچیاں اپنی کتابوں کو ترتیب سے رکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ اور یہ لکھتے لکھتے مجھے یاد آیا کہ میری امّی جان بھی میرے ساتھ بیٹھ کر اسی اہتمام سے کتابوں پر کور چڑھواتیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کہانی کی کتاب بھی بغیر کور کے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب کتاب پڑھ لی جائے تو اس کو کتابوں کے ریک میں سجا دیں۔ وہ بالکل نئی لگیں گی۔

آج کل امّی جان کی باتیں بہت یاد آرہی ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ تکیے کے غلاف کی سلائی کے لیے سوئی دھاگا ہاتھ میں لیتے ہی امی جان کی یاد آگئی۔ جب میں اُن کے لیے سوئی میں دھاگا پروتی تو وہ لہک کر کہتیں: ''درزی نے اپنے شاگرد سے کیا کہا؟'' میں اُسی انداز سے کہتی: ''کیا کہا؟'' جواب میں وہ فرماتیں: ''کبھی لمبا دھاگا نہیں پرونا۔'' غور کریں تو یہ بڑی سمجھ داری کی بات ہے۔ لمبے دھاگے میں اکثر گرہ لگ جاتی ہے اور جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔

ابا جان کو مہمان نوازی کا بہت شوق تھا۔ امی جان جب کھانا خود پکاتیں تو مٹر کے دانے نکالنا، شامی کباب بنانا یا سبزی کاٹنا ہم بچیوں کے حصے میں آتا۔ بینگن کاٹتے ہوئے

امی جان بتاتیں: ''چینگن نے کہا کہ اگر کوئی متواتر مجھے چالیس روز تک کھائے تو نابینا ہو جائے۔ بینگن کی ڈنڈی فوراً بولی کہ اگر میں نہ ہوں تو؟ مطلب یہ کہ بینگن کے ساتھ اس کی سبز ڈنڈی ضرور پکائیں۔''

میری امی جان مجسم اخلاق تھیں۔ آج بھی اُن کے اخلاق اور ان کا پیار یاد آتا ہے۔ مجھ سے کہتیں: ''اگر تمھارا اخلاق اچھا ہوگا تو سب تمھارے اپنے ہوں گے اور اگر تمھارا اخلاق اچھا نہ ہوگا تو اپنے بھی پرائے ہو جائیں گے۔''

یہ بات میں اپنی بچیوں کو بھی سمجھاتی ہوں کہ تمھارے نانا ابا تو پوری قوم کو اخلاق کا درس ''آوازِ اخلاق'' کی تحریک سے دے گئے۔

مجھے ابا جان بھی بہت یاد آتے ہیں اور باتوں کے ساتھ ان کی سادگی، شفقت اور محبت بھی یاد آتی ہے۔ ابا جان نے جس طرح اپنی زندگی کو انسانوں کی خدمت کے لیے وقف کیا تھا، میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اپنی زندگی اسی سانچے میں ڈھالوں۔ ابا جان کی خواہش بھی یہی تھی۔ جب ابا جان نے مجھے دفتر میں بٹھانا شروع کیا تو فرمایا: ''یہاں میں ابا جان نہیں ہوں اور تم ہمدرد کی کارکن ہو۔ تمھیں ہمدرد کو سب سے زیادہ اہمیت دینا چاہیے۔''

امی جان اور ابا جان دونوں ہی ہمیں اچھے انسان بنانا چاہتے تھے۔ ایسے انسان جو اپنے سے زیادہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ میری کوشش بھی یہی رہی ہے کہ میری بچیاں بھی ایسی اخلاقی خوبیوں سے مالا مال ہوں۔

نونہالو! میرا دل چاہتا ہے کہ آپ سب بھی بہت اچھے انسان بنیں۔ ہمدرد نونہال پڑھتے ہیں نا، یہ آپ کی مدد کرے گا۔ ☆

گرمی

رفیع یوسفی محرم

گرمی آئی ، گرمی آئی
دھوپ سے بھاگو میرے بھائی!
دیکھو کتنی دھوپ کڑی ہے
اب کے برس بھی خوب پڑی ہے

اپنے سر پر کیپ سجاؤ
دھوپ سے اپنے سر کو بچاؤ
جب بھی گھر سے باہر جاؤ
ہاتھ میں چھتری لے کر جاؤ

گرمی میں بھی خوب مزے ہیں
چیزوں سے بازار سجے ہیں
رنگ برنگا گولا گنڈا
میٹھا میٹھا ، ٹھنڈا ٹھنڈا

شربت ، لسی پیتے جاؤ
مزے مزے کی قلفی کھاؤ
اچھی ، ستھری چیزیں کھاؤ
شکر خدا کا ، کرتے جاؤ

دھوپ ڈھلے پھر کرکٹ کھیلو
محرم کو بھی ساتھ میں لے لو

علم دریچے

زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے کی عادت ڈالیے اور اچھی اچھی مختصر تحریریں جو آپ پڑھیں، وہ صاف نقل کرکے یا اس تحریر کی فوٹو کاپی ہمیں بھیج دیں، مگر اپنے نام کے علاوہ اصل تحریر لکھنے والے کا نام بھی ضرور لکھیں۔

نعتِ رسولِ مقبولؐ

شاعر : فاضل عثمانی

پسند : عفرا سہیل

لیا جب محمدؐ کا نام ، اللہ اللہ
فرشتوں نے بھیجا سلام ، اللہ اللہ
رسولوں میں مہرِ درخشاں کی صورت
تو نبیوں میں ماہِ تمام ، اللہ اللہ
رکھی جس نے اسوہ پہ اُنؐ کے نظر
ہوا دہر میں نیک نام ، اللہ اللہ
غلاموں کا اُنؐ کے، شرف پوچھنا کیا
بنے وہ جہاں کے امام ، اللہ اللہ
رہا اُنؐ کی صحبت میں جو چند ساعت
ملا اُس کو عیشِ دوام ، اللہ اللہ
بدل حشر تک ہو سکے گا نہ جس کا
محمدؐ وہ نظام لائے ، اللہ اللہ
نہیں ہے کسی بات کا اُس کو دھڑکا
جسے ورد ہے اُنؐ کا نام ، اللہ اللہ
نہ بھولیں گے فاضل تجھے ایک مدت
حرم کے قعود و قیام ، اللہ اللہ

انصاف

مرسلہ : محمد حبیب عباسی، سکھر

حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں ان کے دو صاحبزادے بصرہ گئے۔ ان دنوں بصرے کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ تھے۔ انھوں نے دونوں بھائیوں کو خزانے میں سے کچھ رقم دے کر کہا کہ اس رقم سے مالِ تجارت خرید کر مدینے لے جاؤ، وہاں فروخت کرنا، نفع اپنے پاس رکھ لینا اور اصل رقم واپس بھیج دینا۔ دونوں صاحبزادوں نے ایسا ہی کیا۔

حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو بیٹوں سے پوچھا کہ کیا ابوموسیٰ کا باقی لوگوں کے ساتھ ایسا

ہی برتاؤ ہے یا تمھیں خلیفہ کے بیٹے سمجھ کر یہ سلوک کیا ہے؟

دونوں صاحبزادے خاموش رہے۔

چناں چہ حضرت عمرؓ نے اصل رقم اور نفع دونوں سرکاری خزانے میں جمع کرا دیے۔

انسانیت

مرسلہ : محمد رضا علی سرگانہ، ملتان

شیخ سعدیؒ کو ان کے والد نے بچپن میں انگوٹھی خرید کر دی۔ شیخ سعدیؒ کہیں کھیل رہے تھے کہ کسی اُچکے نے مٹھائی کا لالچ دے کر انگوٹھی اُتار لی۔

باپ نے سنا تو کہا: " بیٹا! اتنی قیمتی انگوٹھی ایک دھیلے کی مٹھائی کی خاطر کھو دی۔ خیر اب جو ہوا سو ہوا، مگر میری بات یاد رکھو، جس طرح میں نے تمھیں انگوٹھی دی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایک موتی دیا ہے، جس کا نام انسانیت ہے۔ دنیا کی چھوٹی چھوٹی لذتیں مٹھائی کی طرح ہیں، جو شیطان اُس اُچکے کی طرح تمھارے واسطے لیے پھرتا ہے، تاکہ وہ موتی تم سے چھین لے۔ خبردار! یہ انمول موتی مت گنوانا۔"

مہکتی کلیاں

مرسلہ : ایمان شاہد، جہلم

- قدم، قلم اور قسم ہمیشہ سوچ کر اُٹھاؤ۔
- آپ کے الفاظ ہی آپ کی شخصیت ہیں۔
- افراد اور اقوام تاریخ سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق سبق حاصل کرتے ہیں۔
- شہید دوسروں کے لیے جان دیتا ہے اور سخی دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔
- اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر مت آزماؤ، جس نے تمھیں بولنا سکھایا۔
- ہر لفظ سوچ سمجھ کر ادا کرو، کیوں کہ کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں آتا۔

ڈاکٹر علامہ اقبال اور استاد

مرسلہ : ثناء عقیل، سیالکوٹ

شمس العلما مولوی میر حسن ڈاکٹر علامہ اقبال کے استاد تھے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال اپنے استاد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ علامہ اقبال ہی کی سفارش پر حکومت نے مولوی صاحب کو

شمس العلما کا خطاب دیا۔ ایک دفعہ علامہ اقبال اپنے چند دوستوں کے ساتھ سیالکوٹ کے ایک بازار میں اس حالت میں بیٹھے تھے کہ صرف ایک پاؤں میں جوتا تھا۔ اچانک علامہ اقبال نے دور سے مولوی صاحب کو آتے دیکھا۔ وہ اسی حالت میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچے، ادب سے سلام کیا اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ مولوی صاحب کو ان کے گھر پہنچا کر اپنے دوستوں کے پاس آگئے۔

سنہری باتیں

مرسلہ : شازیہ مختار، پنڈ دادن خان

❁ سب کچھ کھونے کے بعد بھی اگر آپ کے اندر حوصلہ باقی ہے تو سمجھ لیجیے کہ ابھی آپ نے کچھ نہیں کھویا۔

❁ چپ رہنا بھی اتنا ہی بڑا کام ہے، جتنا بحث کرنا۔

❁ مصائب سے مت گھبراؤ، ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔

❁ حکمت اور دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

❁ مواقع کو استعمال کرنے کا نام قیادت ہے اور موقع کو برباد کرنے کا نام حماقت ہے۔

❁ اگر تم اپنا راز اپنے دشمن سے چھپانا چاہتے ہو تو راز کو اپنے دوست سے بھی نہ کہو۔

عبدالستار ایدھی

مرسلہ : عنبر کامران، کراچی

☆ محترم عبدالستار ایدھی سب کی پسندیدہ شخصیت کا نام ہے۔

☆ عبدالستار ایدھی بھارت کی ریاست گجرات کے قصبے بانٹوا میں ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔

☆ جب عبدالستار ایدھی بھارت سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔

☆ ۱۹۵۰ء میں برادری کے لوگوں کے ساتھ مل کر "بانٹوا خدمت کمیٹی" اور "بانٹوا میمن کور" کی بنیاد رکھی اور بہت تھوڑے پیسوں سے ایک چھوٹی سی ڈسپنسری بھی بنائی۔

☆ ۱۹۹۷ء کی "گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ" میں ایدھی ایمبولنس دنیا کی سب سے بڑی رضا کار ایمبولینس قرار پائی۔

☆ عبدالستار ایدھی کی بے مثال زندگی ، نیک نامی اور عظیم کردار کے پیچھے ان کی "ماں" کی دعاؤں کا بہت اثر ہے۔

اردو زبان

مرسلہ : کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

☾ اردو کا لفظ ترکی زبان کے لفظ "اوردہ" سے نکلا ہے، جس کا مطلب پڑاؤ یا لشکر ہے۔

☾ اردو زبان کی ابتدا دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں سے ہوئی۔

☾ اردو تقریباً چار سو سال پرانی زبان ہے۔

☾ علم کا کوئی اہم موضوع ایسا نہیں، جس پر اردو میں تحریر موجود نہ ہو۔

☾ دنیا کی کئی مشہور یونی ورسٹیوں میں اس اردو زبان سکھانے کے انتظامات موجود ہیں۔

☾ مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک میں اردو زبان سمجھی جاتی ہے۔ تحریکِ پاکستان کو فروغ دینے میں اردو نے اہم کردار ادا کیا۔ بعض مغربی ممالک میں تو اردو کے اخبارات بھی نکلتے ہیں۔

☾ برصغیر میں مسلمانوں کے دورِ حکومت خصوصاً مغلوں کے آخری دو سو سال (۱۶۵۷ء سے ۱۸۵۷ء) میں اردو بہت پروان چڑھی۔

محنت

شاعر : اسماعیل میرٹھی

پسند : سیدہ اریبہ بتول، سیدہ وسیم حیدر شاہ

لیاری ٹاؤن، کراچی

مکڑی نے کیا جالا تانا
آخر اس نے کیوں کر جانا
کیا اچھا ، تانا بانا
اس سے مجھ کو ملے گا کھانا
جس نے مکڑی پیدا کی ہے
اس نے اتنی عقل بھی دی ہے
روزی کا کیوں تجھ کو غم ہے؟
جب تک تیرے دم میں دم ہے
مکڑی سے بھی کیا تو کم ہے؟
ہاتھ میں کاغذ اور قلم ہے
سیکھ لے بابا! علم و ہنر تو
محنت کر تو ، محنت کر تو

☆☆☆

اِدھر اُدھر سے

آپ جانتے ہیں؟

مرسلہ : نادیہ اقبال، کراچی

ہمارے بعض قصبوں اور دیہاتوں کے نام بہت عجیب و غریب ہوتے ہیں مثلاً ''پنچو میاں کی ملیاں، بھائی پھیرو، میاں والی، محمد رحیم کلرا، تخت بھائی، ٹوبہ ٹیک سنگھ، کابنا کاچھا وغیرہ، مگر یہ تو کچھ بھی نہیں۔ نیوزی لینڈ میں ایک گاؤں ہے اور یہاں ملک کے قدیم باشندے رہتے ہیں، جو ''مواری'' کہلاتے ہیں۔ ذرا اس گاؤں کا نام تو پڑھیے: ''ٹوا ماٹا دھا کاٹنگی منگا کو آؤ آٹا ماٹے اپوکائی دھنوا کی تان اتا نا ہو'' یہ مذاق کی بات نہیں حقیقت ہے۔

گدھے سے اظہارِ محبت

مرسلہ : فضا فاروق، غریب آباد

قاہرہ میں دو مصری گلوکاروں کے درمیان گدھے سے اظہارِ محبت کے گانے پر جھگڑا ہو گیا۔ گدھے کو اپنی شرافت، برداشت اور محنت کی وجہ سے مصری لوگ بہت پسند کرتے ہیں، اسی لیے اپنے گانے میں گدھوں سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔ یہاں ایک دل چسپ واقعہ سامنے آیا، جس میں دو مصری گلوکار گدھے سے اظہارِ محبت کا ملتا جلتا گیت گانے کے بعد لڑ پڑے اور عدالت میں جا پہنچے۔ صغیر نامی مصری گلوکار نے عدالت میں پہلے دعوا کیا کہ اس نے پندرہ برس پہلے گدھے سے اظہارِ محبت کا گیت گایا تھا، جس کے بول تھے: ''میں اپنے گدھے سے محبت کرتا ہوں۔'' جب کہ حال ہی میں عبدالرحیم نے یہ گانا اس طرح گایا: ''مجھے تم سے محبت ہے گدھے''

اس طرح دونوں گانوں کے الفاظ ملتے جلتے ہیں۔ گدھے سے اظہارِ محبت کے گانے پر دونوں گلوکاروں کے

جھگڑے کو حقوق کے تحفظ کی تنظیم نے خاصا اُچھالا ہے۔

اچھوتا خیال

مرسلہ : مہک اکرم، لیاقت آباد

ایک شخص بیساکھیوں کے سہارے چلا جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے اپنا ایک پُرانا دوست مل گیا۔ دوست کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ جس ٹرین میں وہ سفر کر رہا تھا، دوسری ٹرین سے اس کی ٹکر ہو گئی۔

بہرحال، اس حادثے کی وجہ سے اُسے دس ہزار روپے ملے اور اس کی بیوی کو پانچ ہزار روپے۔

دوست نے پوچھا: "تو کیا تمھاری بیوی بھی زخمی ہوئی تھی؟"

اس شخص نے جواب دیا: "وہ زخمی ہوئی تو نہیں تھی، مگر اس افراتفری کے عالم میں بھی مجھے اُس کے دانتوں پر ایک زوردار لات جمانے کا خیال سوجھ ہی گیا۔"

دادا کی کہانی

مرسلہ : تحریم خان، نارتھ کراچی

ٹوپی بیچنے والا درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا کہ اچانک کچھ بندروں نے اس کی ساری ٹوپیاں اُٹھائیں اور سر پر رکھ کر درخت پر چڑھ گئے۔ بندر انسان کی نقل کرتے ہیں۔ یہ خیال آیا تو آدمی نے اپنی ٹوپی اُتار کے نیچے پھینکی۔ بندروں نے بھی ویسا ہی کیا اور وہ آدمی اپنی ٹوپیاں لے کر چلا گیا۔ گھر جا کر اس نے یہ واقعہ اپنے پوتے کو سنایا۔

چند سال بعد اسی آدمی کا پوتا بھی ٹوپیاں بیچتا ہوا اس درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ بندر پھر ٹوپیاں اُٹھا کر لے گئے۔ اسے اپنے دادا کی سنائی ہوئی بات یاد آ گئی اور اس نے اپنے سر کی ٹوپی اُتار کر نیچے پھینکی۔ ایک بندر نیچے آیا، ٹوپی اُٹھائی اور لڑکے کو ایک تھپڑ مار کر بولا: "تُو کیا سمجھتا ہے، ہمارے دادا نے ہم کو ٹوپی والا واقعہ نہیں سنایا ہوگا؟"

مادری زبان

مرسلہ : عائشہ اقبال، عزیز آباد

اردو زبان کے مشہور شاعر میرا جی کا تعلق لاہور سے تھا۔ کسی نے ان سے پوچھا: ''ان کی مادری زبان کون سی ہے؟''

انھوں نے سنجیدگی سے جواب دیا: ''میری مادری زبان اردو ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ میری والدہ میری مادری زبان نہیں سمجھتیں۔''

دشمن سے لڑائی میں

مرسلہ : لبنیٰ جبین، کراچی

درزی نے کہا: ''میں تمھارے بخیے اُدھیڑ دوں گا۔''

قسائی نے کہا: ''میں تمھاری ہڈیاں توڑ دوں گا۔''

ڈینٹر نے کہا: ''میں تمھارے ڈینٹ نکال دوں گا۔''

مستری نے کہا: ''میں تمھارے نٹ کس دوں گا۔''

ڈرائیور نے کہا: ''میں تمھیں ٹائر کے نیچے کچل دوں گا۔''

دھوبی نے کہا: ''میں تمھیں نچوڑ کر رکھ دوں گا۔''

جادوگر نے کہا: ''میں تمھیں جلا کر راکھ کر دوں گا۔''

ملاح نے کہا: ''میں تمھیں غوطے دے دے کر مار دوں گا۔''

دودھ والے نے کہا: ''میں تمھیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔''

انسان اور جانور

مرسلہ : اُمیمہ ریان، ناظم آباد، کراچی

اشرف المخلوقات کے مقابلے میں جانور مندرجہ ذیل خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں:

☆ انھیں کبھی فکر نہیں ہوتی کہ گھڑی میں کیا بجا ہے۔

☆ وہ موت کے کسی احساس کے بغیر مر جاتے ہیں۔

☆ اُن کے آخری لمحات غیر ضروری رسموں اور ناخوش گوار تقریبات سے محفوظ ہوتے ہیں۔

☆ اُن کی تجہیز و تکفین پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔

☆ اُن کے مرنے کے بعد کوئی ان کی وصیت کے بارے میں مقدمے بازی نہیں کرتا۔☆

جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ

مسعود احمد برکاتی

آج میں آپ کو ایک ایسی شخصیت سے ملاتا ہوں، جن کے کام سُن کر آپ کو خوشی کے ساتھ کچھ حیرت بھی ہوگی۔ ان صاحب سے میری ملاقات تو کم کم ہوتی ہے، لیکن ان کے کاموں کو دیکھ دیکھ کر اور سُن سُن کر حیران رہ جاتا ہوں، مگر یہ حیرت خوشی سے بھری ہوتی ہے اور خوشی کیوں نہ ہو، انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ کتابیں کیا ہیں، ادب کے موتی ہیں۔ ان کتابوں میں سے کچھ کے نام آپ کو بتاؤں گا۔ پہلے اس نادر شخصیت کا نام تو پڑھ لیجیے۔ جی ہاں، یہ ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی۔

جمیل صاحب کو علم کا شوق بچپن ہی سے ہے، انھوں نے نہ صرف کتابیں خوب پڑھیں بلکہ یہ بھی خیال رکھا کہ سندیں یا ڈگریاں بھی حاصل کریں۔ نونہال بھی جمیل جالبی کے نام سے نامانوس نہیں ہیں۔ جالبی صاحب نے بڑی بڑی کتابوں کے علاوہ نونہالوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

ہمدرد نونہال میں آپ ان کی کہانیاں پڑھ چکے ہیں۔ جالبی صاحب کی بچوں کے لیے بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے تین کتابوں کے نام یاد ہیں:

(۱) حیرت ناک کہانیاں۔ ۱۹۸۳ء میں چھپی تھی۔

(۲) نہ ہوئی قرولی۔ ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔

(۳) بارہ کہانیاں۔ یہ کتاب ۱۹۹۸ء میں چھپی۔

جالبی صاحب نوعمری سے ہی مطالعے کے شوقین اور اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کے عادی ہیں۔ انھوں نے نوجوانی ہی میں اردو کے عظیم ادیبوں، جیسے مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد حسین آزاد اور ان کے بعد مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، پروفیسر احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، حسن عسکری جیسے اہم مصنفوں کی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں اور آج بھی اچھی اچھی اور بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ جالبی صاحب انگریزی کے بڑے بڑے مصنفوں کی کتابیں بھی پڑھ رہے ہیں۔ اس طرح جالبی صاحب کا ذہن بہت کشادہ اور وسیع ہو گیا اور انھیں علم کے سمندر کے پھیلاؤ اور گہرائی کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو ایم اے کے ساتھ ساتھ قانون کی ڈگری ایل ایل بی اور اس کے بعد پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں بھی ملیں۔ لیکن ان ڈگریوں نے ان کے ذہن پر یہ

منفی اثر نہیں ڈالا کہ اب مزید مطالعے کی ضرورت نہیں ہے، انھوں نے سب کچھ پڑھ لیا۔ اصل میں جب انسان کا علم بڑھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے اب تک پڑھا ہے، وہ کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ اب تک نہیں پڑھا، وہ بہت ہے، اس لیے مجھے ابھی اور پڑھنا چاہیے، اور وہ خوب پڑھتا ہے۔ جالبی صاحب کی یہی سوچ ہے، اس لیے وہ اب بھی اپنی دوسری مصروفیات کے باوجود مطالعہ ضرور کرتے ہیں۔ مشکل سے یقین آتا ہے کہ وہ بارہ بارہ گھنٹے مسلسل مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ لکھنے کا بھی یہی حال ہے۔ جالبی صاحب کا قلم بھی ان کے ذہن کا ساتھ دیتا ہے۔ اور وہ خوب لکھتے ہیں۔

جالبی صاحب کی لکھی ہوئی کتابیں اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کے علاوہ جالبی صاحب نے اردو ادب کی ایک جامع اور مفصل تاریخ بھی لکھی ہے، جس کا نام ''تاریخِ ادب اردو'' ہے، اس کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اپنی کم زور صحت کے باوجود انھوں نے اس کتاب پر کام جاری رکھا۔ مکمل ہو کر یہ کتاب ادبِ اردو کی ایک جامع اور مکمل تاریخ ہوگی اور لوگ اس سے ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے رہیں گے۔ یہ کتاب اردو کے طالب علموں کے لیے ہی نہیں عالموں کے لیے بھی مفید ہے۔ ہمارے بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی رائے یہ ہے کہ اردو ادب کی اتنی جامع تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔

جالبی صاحب کو ادب کے علاوہ تعلیم و تدریس سے بھی لگاؤ رہا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے کراچی کے ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ اس کے علاوہ محکمۂ انکم ٹیکس میں افسر بھی رہے۔ اردو ڈکشنری بورڈ کے صدر بھی رہے۔ مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ کی حیثیت سے بھی جالبی صاحب نے اردو زبان کی ترقی اور وسعت کے لیے اہم کام کیے۔

اہم سرکاری عہدوں پر کام کرنے کے باوجود جالبی صاحب نے اپنا خاص شوق یعنی مطالعہ اور کتابیں لکھنا نہ چھوڑا۔ مقتدرہ قومی زبان کی سربراہی کے زمانے میں انھوں نے "قومی انگریزی اردو لغت" بھی مرتب کرائی۔ انتظامی اور دفتری ذمے داریوں کو خوبی سے ادا کرنے کے ساتھ ساتھ قلم اور کاغذ سے تعلق رکھنا ایسی عجیب اور نادر خوبیاں ہیں جو اس دور میں تو بہت ہی نایاب ہیں۔

جالبی صاحب کے بارے میں یہ بات بھی پڑھ لیجیے کہ ان کے دادا سوات کے ایک گاؤں سیداں سے صوبہ یوپی میں آئے تھے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جمیل صاحب علی گڑھ میں یکم جولائی ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ پھر والدین کے ساتھ سہارنپور آ گئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ جمیل صاحب نے میٹرک سائنس سے کیا اور والد نے ان کو فرسٹ ایئر سائنس میں میرٹھ کے ایک کالج میں داخل کرا دیا، لیکن جمیل صاحب کو سائنس سے ذرا دل چسپی نہیں تھی۔ ان کا دل پڑھائی سے ہی اُچاٹ ہونے لگا۔ آخر انھوں نے والد کو بتائے بغیر خاموشی سے سائنس چھوڑ کر آرٹس میں داخلہ لے لیا اور ان کے اصلی جوہر کھلنے لگے اور وہ تعلیم کے میدان میں آگے بڑھتے ہی گئے۔

تعلیم پوری کر کے روزی کے لیے جمیل صاحب نے سرکاری محکمے میں ملازمت کر لی، خوب ترقی کی اور انکم ٹیکس کے محکمے سے کمشنر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ اس

کے بعد وہ یکسوئی سے علم و ادب کے شعبوں میں سرگرمِ عمل رہے۔ اب جالبی صاحب کی پوری توجہ اپنی کتابوں کی تصنیف و تالیف پر مرکوز ہے، خاص طور پر "تاریخ ادب اردو" کو مکمل کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی اہم تصانیف میں سے چند کے نام یہ ہیں:
(۱) پاکستانی کلچر (۲) تنقید اور تجربہ (۳) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (اردو کی سب سے پرانی کتاب کی تلاش اور نئی ترتیب) (۴) ارسطو سے ایلیٹ تک (۵) جانورستان (ترجمہ) (۶) قدیم اردو کی لغت۔

جالبی صاحب کی زندگی کا اہم ترین مقصد علم و ادب کا فروغ ہے۔ ان کی زندگی سادگی اور یکسوئی سے گزری ہے۔

جالبی صاحب کو حکومت پاکستان کی طرف سے کئی اعزازات ملے ہیں، جن میں سے "ہلالِ امتیاز" سب سے بڑا ہے۔ ☆

میں وعدہ کرتی ہوں

ڈاکٹر طاہر مسعود

کسی شہر میں ایک میاں بیوی رہتے تھے۔ دونوں ہر وقت آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ بیوی غصے کی تیز اور میاں بے پروا تھے۔ میاں کبھی کوئی کام وقت پر نہیں کرتا تھا، جس پر بیوی کو غصہ آ جاتا تھا اور وہ اسے صلواتیں سنانے بیٹھ جاتی۔ اصل میں قصور وار دونوں ہی تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنا قصور تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ شادی کے پانچ سال بعد ان کے ہاں ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ بیٹے کا نام انھوں نے سرمد رکھا۔ سرمد ذرا بڑا ہوا تو بے حد ذہین نکلا۔ وہ اپنے ماں باپ کو لڑتے دیکھتا تو بہت حیران ہوتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے والدین چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیوں لڑ پڑتے ہیں۔ آخر وہ امن اور محبت کے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔

سرمد سے ماں باپ دونوں کو بہت پیار تھا۔ آخر کیوں نہ ہوتا، وہ ان کا اکلوتا بیٹا جو تھا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ سرمد اسکول جانے لگا۔ اس کا داخلہ تیسری جماعت میں ہوا۔ اس نے اپنی محنت اور ذہانت سے اسکول کے اساتذہ کے دل جیت لیے اور وہ بھی سرمد کو عزیز رکھنے لگے۔ وہ دوسرے بچوں کو سرمد کی ذہانت اور محنت کی مثالیں دینے لگے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود سرمد اکثر اُداس رہتا تھا۔ اس کی وجہ گھر کا ماحول تھا، جس سے وہ خوش نہیں تھا۔

اس نے کئی بار اپنے والدین کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ آپس میں نہ لڑا کریں،

لیکن والدین بھلا کہاں ماننے والے تھے۔ جب سرمد کو صلح کرانے میں ناکامی ہوئی تو وہ اور زیادہ اُداس رہنے لگا۔ اب وہ کسی سے بھی زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ چپ چپ سا رہتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت، اسکول میں اردو کی مس شہناز نے بھانپ لی۔ ایک دن جب پیریڈ ختم ہوا اور وہ بستہ اُٹھا کر کلاس روم سے باہر جانے لگا تو مس شہناز نے اسے آواز دی: "سرمد! اِدھر آؤ۔"

"جی مس!" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"کیا بات ہے سرمد! آج کل تم اتنے خاموش کیوں رہتے ہو۔ آج کل تم نہ ہنستے بولتے ہو، نہ کھیل کود میں حصہ لیتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے۔ دیکھو مجھ سے کچھ چھپانا نہیں، میں تمھاری مس ہوں۔"

ہمدردی کے یہ بول سن کر سرمد کا جی بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رخساروں پہ بہنے لگے۔ یہ دیکھ کر مس شہناز نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولیں: "کیا کسی نے تم سے کچھ کہا ہے۔ آخر تم رو کیوں رہے ہو؟"

"نہیں مس! مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔" سرمد نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا بات ہے۔ آخر تم بتاتے کیوں نہیں۔"

اس پر سرمد نے مس شہناز کو گھر کی ساری صورتِ حال بتا دی۔ یہ سب کچھ سن کر مس شہناز بھی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ انھوں نے کہا: "بیٹے! یہ تو بڑی بُری بات ہے۔ تمھارے بڑوں کو آپس میں اس طرح لڑنا نہیں چاہیے، مگر خیر تم اطمینان رکھو۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔"

مس شہناز نے سرمد سے اس کے گھر کا پتا پوچھا اور کہا کہ وہ اس سلسلے میں گھر میں کچھ نہ بتائے۔

اتوار کے دن سرمد گھر میں اُداس بیٹھا تھا۔ اس کے ابو اخبار پڑھ رہے تھے اور امی باورچی خانے میں کام کر رہی تھیں۔ سرمد کی اُداسی کی وجہ یہ تھی کہ صبح ہی ناشتے کی میز پر اس کی امی اور ابو میں لڑائی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں کو لڑنے جھگڑنے سے روکنے کی کوشش کی تو اُلٹی اسے ڈانٹ پڑ گئی۔ اس بے وجہ کی ڈانٹ سے اس کا دل بُرا ہو گیا تھا اور وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا جائے۔ یکایک کال بیل بج اُٹھی۔ وہ اُٹھ کر دروازے پہ گیا تو مس شہناز کھڑی تھیں۔

''کیا تمھارے امی ابو گھر پر ہیں؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی لڑ کر فارغ ہوئے ہیں۔'' سرمد نے جواب دیا۔

سرمد نے مس شہناز کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اپنے امی ابو کو مس کے آنے کی اطلاع دی۔ ابو ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو مس شہناز اپنی نشست سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''کیا آپ ہی سرمد کے ابو ہیں؟'' انھوں نے پوچھا۔

''جی ہاں، فرمائیے، آپ نے کیسے زحمت کی۔'' سرمد کے ابو نے کہا۔

''آپ اپنی بیگم کو بھی بلا لیں۔ مجھے آپ دونوں سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' مس شہناز بولیں۔

امی آئیں تو ان کا مزاج خراب تھا۔ انھوں نے بڑی سرد مہری سے مس شہناز سے

ہاتھ ملایا۔

"سرمد بیٹے! آپ ذرا کمرے سے باہر جائیں۔" مس شہناز نے کہا۔

سرمد سعادت مندی سے کمرے سے نکل گیا۔ دونوں میاں بیوی اس ہدایت پر حیران ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مس شہناز کیوں آئی ہیں؟ وہ کیا چاہتی ہیں؟ اور انھوں نے سرمد کو کمرے سے باہر نکل جانے کو کیوں کہا ہے۔

"بات یہ ہے۔" مس شہناز نے کہا: "میں آپ دونوں سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے سرمد نے بتایا ہے کہ آپ دونوں کی آپس میں بنتی نہیں ہے اور آپ ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ سرمد نے اس بات کا گہرا اثر لیا ہے۔ پہلے وہ کلاس میں ہنستا بولتا تھا، چہکتا تھا۔ اب وہ چپ چپ رہنے لگا ہے۔ دیکھیے! سرمد آپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ آپ لوگ کم از کم اسی کی خاطر آپس میں نہ لڑا کریں۔"

یہ سن کر سرمد کے والد نے سر جھکا لیا، لیکن اس کی امی بگڑ کر بولیں: "آپ ہمارے گھریلو معاملے میں دخل دینے والی کون ہوتی ہیں۔ ہم لڑیں یا مریں۔ ہم جانیں اور ہمارا کام۔"

"دیکھیے ناراض نہ ہوں۔" مس شہناز نے کہا: "میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اگر آپ لوگ یوں ہی لڑتے رہے تو سرمد ایک دن نفسیاتی مریض بن جائے گا۔ آپ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

اس بات پر سرمد کی امی ٹھنڈی پڑیں اور کہنے لگیں: "میں کہاں لڑتی ہوں۔ یہ ان کے ابو ہیں جو کوئی کام وقت پر نہیں کرتے۔ کام ٹالنا ان کی عادت ہے۔ اس پر مجھے غصہ آ جاتا ہے اور یوں لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔"

سرمد کے ابو بولے: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کروں گا، لیکن آپ ان سے بھی کہیں کہ یہ ہر وقت غصہ نہ کیا کریں۔"

"میں غصہ کرتی ہوں۔" سرمد کی امی تیز لہجے میں بولیں: "آپ اپنے آپ کو نہیں دیکھتے۔ اپنی حرکتیں نہیں دیکھتے۔"

"میں کہتا ہوں بیگم! زبان سنبھال کر بات کرو۔" سرمد کے ابو نے بھی تیز لہجے میں کہا۔

"زبان تم سنبھالو۔ میں نے ایسی کیا بات کہہ دی۔" سرمد کی امی بولیں۔

مس شہناز نے جو یہ منظر دیکھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے تند و تیز جملوں سے جو شور ہوا تو سرمد نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر وہی کچھ ہو رہا تھا، جس کا مشاہدہ کئی برسوں سے کر رہا تھا۔

جب دونوں چپ ہوئے تو مس شہناز بولیں: "معاف کیجیے گا، آپ دونوں کی لڑائی دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آپ دونوں اس قابل نہیں ہیں کہ سرمد آپ کے ساتھ رہے۔ سرمد کی خاطر اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ یہ میرے ساتھ رہے گا۔ آپ کے درمیان رہ کر خدا نہ کرے اس لڑکے کا ذہنی توازن بگڑ جائے گا۔"

یہ سن کر ماں باپ دونوں سکتے میں آ گئے۔ سرمد کی امی بولیں: "بچہ ہمارا ہے۔ آپ کون ہوتی ہیں، اسے ساتھ لے جانے والی۔"

اسی لیے تو میں آپ سے اجازت مانگ رہی ہوں۔" مس شہناز نے دھیرے سے کہا۔

اتنے میں سرمد اندر داخل ہوا۔ اس نے مس شہناز کا ہاتھ پکڑا اور کہا: "مس!

آ یئے چلتے ہیں۔ مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔''

یہ دیکھ کر تو سرمد کی امی کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے: ''سرمد! میرا بیٹا...... کیا تو مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا؟''

انھوں نے سرمد کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''تو پھر آپ لوگ وعدہ کریں کہ آیندہ ایک دوسرے سے نہیں لڑیں گے۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' سرمد کی امی نے بے اختیار سرمد کا منھ چومتے ہوئے کہا۔

بیوی کے الفاظ سن کر سرمد کے ابو نے بھی سرمد کو گود میں لے کر پیار سے چپٹا لیا۔

ان کا پیار دیکھ کر مس شہناز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ ☆

کہیں چلا نہ جائے

ایک لڑکے نے الیکٹرونکس کی دکان میں فون کر کے پوچھا: ''آپ کے پاس فرج ہے؟''

دکان دار نے جواب دیا: ''ہاں ہے۔''

لڑکے نے کہا: ''چل رہا ہے؟''

دکان دار نے کہا: ''جی، چل رہا ہے۔''

لڑکا بولا: ''پکڑ کر رکھیے، کہیں بھاگ نہ جائے۔'' اور فون رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکے نے پھر فون کیا۔ دکان دار نے اُٹھایا تو وہی لڑکا بولا: ''فرج ہے؟''

دکان دار نے آواز پہچان کر غصے سے کہا: ''نہیں ہے۔''

لڑکا بولا: ''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ پکڑ کر رکھیے، کہیں چلا نہ جائے۔''

مرسلہ: مریم عبدالرب، کراچی

ہائے سولن!

امجد علی امجد

یونان میں ''سولن'' نامی ایک شخص گزرا ہے۔ وہ ایک مانا ہوا قانون داں، فلسفی اور شاعر تھا۔ ایک بار قبرص کے بادشاہ ''کری سس'' نے سولن کو اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ سولن نے دعوت قبول کر لی۔ ملاقات کے دن بادشاہ اپنا قیمتی لباس جس میں ہیرے جواہر جڑے ہوئے تھے، پہن کر تخت پر جلوہ افروز ہوا اور پورے شاہانہ انداز سے سولن کا انتظار کرنے لگا۔ سولن آیا اور اطمینان و بے نیازی سے بادشاہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے بادشاہ کے تکبر اور شان و شوکت پر کوئی توجہ نہ دی۔ بادشاہ بے چین ہو گیا۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا: ''سولن کو ہمارے خزانے دکھائے جائیں۔''

وزیر نے سولن کے سامنے سونے چاندی اور ہیرے موتیوں کا ڈھیر لگوا دیا۔ یہ چمک دمک بھی سولن کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ بے پروا بیٹھا رہا۔ بادشاہ سے نہ رہا گیا۔ اس نے بلند آواز سے سولن کو مخاطب کیا: ''سولن! تم یونان کے نام ور فلسفی ہو، بتاؤ تمھارے نزدیک دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی کون ہے؟''

سولن نے پُر وقار لہجے میں کہا: ''اے بادشاہ! میرے ملک میں ''طیلس'' نام کا ایک آدمی بہت خوش نصیب تھا۔ وہ بہادر، نیک، خوش اخلاق اور اچھے بچوں کا باپ تھا۔ اس نے اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دے دی۔''

''اس کے بعد دوسرا سب سے خوش نصیب آدمی کون ہے؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

سولن نے کہا: ''دو بھائی سب سے زیادہ خوش نصیب ہیں۔ انھوں نے اپنی ماں کی

خدمت کرتے کرتے جان دی۔"

بادشاہ غصے میں آ گیا: "کیا تم ہمیں خوش نصیب نہیں سمجھتے؟"

سولن نے وضاحت کی: "خوش نصیب وہ ہوتا ہے، جس کے ساتھ خوش نصیبی زندگی کے آخری لمحے تک رہے۔ جس کی زندگی ابھی ختم نہ ہوئی ہو، اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ انسان کی زندگی ہمیشہ ایک ہی حالت پر برقرار نہیں رہتی۔"

بادشاہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے سولن کے ساتھ انتہائی نفرت و حقارت کا سلوک کیا۔

کچھ عرصے بعد شہنشاہ سائرس نے قبرص فتح کر لیا اور بادشاہ کری سس کو زندہ جلا دینے کا حکم دیا۔ کری سس کو جلانے کے لیے لکڑیوں پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے منھ سے ایک دردناک چیخ نکلی: "ہائے سولن!"

فاتح شہنشاہ نے ہاتھ اُٹھا کر کارروائی اچانک روک دی اور کری سس کے قریب جا کے سوال کیا: "ہائے سولن، سے تمھاری کیا مراد ہے؟" کری سس نے اسے پورا واقعہ سنا دیا۔ سائرس یہ واقعہ سن کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے کری سس کی جان بخش دی اور اس کے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آیا۔ ☆

ریاضی کا ایک کھیل

۲۵۹ کو اپنی عمر سے ضرب دیں۔ جو جواب آئے اس کو ۳۹ سے ضرب دیں۔ آپ کی عمر ۳ بار نظر آئے گی۔

مثلاً اگر آپ کی عمر دس سال ہے تو ۱۰ کو ۲۵۹ سے ضرب دیں۔ جواب آئے گا: ۲۵۹۰۔ اب اس عدد کو ۳۹ سے ضرب دیں تو آپ کی عمر کا عدد تین بار نظر آئے گا۔ دیکھیے: ۱۰۱۰۱۰ = ۳۹×۲۵۹۰۔

مرسلہ: فرزانہ اقبال، کراچی

بیت بازی

مشقت کی ذلت جنھوں نے اٹھائی
جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی

شاعر: مولانا الطاف حسین حالی — پسند: سیدہ ادیبہ بتول، کراچی

ویرانیاں دلوں کو بھی کچھ کم نہ تھیں ادا
کیا ڈھونڈنے گئے ہیں مسافر خلاؤں میں

شاعرہ: ادا جعفری — پسند: فضا فاروقی، لیاقت آباد

شکست و فتح مرا مسئلہ نہیں ہے فراز
میں زندگی سے نبرد آزما رہا، جو رہا

شاعر: احمد فراز — پسند: روبینہ ناز، کراچی

میری فطرت، میرا مسلک، میرا منشا یہی ہے
آدمی جتنے بھی ہیں، انسان بن جائیں سبھی

شاعر: [illegible] — پسند: [illegible]

وہ کون ہے دنیا میں جسے غم نہیں ہوتا
کس گھر میں خوشی ہوتی ہے ماتم نہیں ہوتا

شاعر: ریاض خیرآبادی — پسند: زوبیہ شکیل، کریم آباد

میں اپنی نیکیاں کرتا چلوں کسی کے نام
مرے گناہوں میں شاید کوئی کمی آئے

شاعر: عارف شفیق — پسند: ناجیہ وسیم، کراچی

خودغرض، اہلِ ہوس، جھوٹے، منافق، بے وفا
کس قدر مشکل ہے جینا ایسے بیماروں کے بیچ

شاعر: افسر ماہ پوری — پسند: اکرم وارثی، لیاقت آباد

مطمئن ایسا کہ رہتا ہوں ہجوم شہر میں
مضطرب ایسا کہ سائے سے بھی ڈر جاتا ہوں

شاعر: اطہر نفیس — پسند: محمد سرور، میرپور خاص

حادثے سے بڑھ کر سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھیرے نہیں حادثہ دیکھ کر

شاعر: عنایت علی خاں — پسند: شاہ عمران، کراچی

نہیں رازداں سے شکوہ، مگر اتنا جانتا ہوں
نہ میں دل کی بات کہتا، نہ جہاں میں خوار ہوتا

شاعر: حفیظ سہارنپوری — پسند: محمد طلحہ، لانڈھی

پھر ہوا یوں کہ مجھ پہ ہی دیوار آ گری
لیکن نہ کھل سکا، پسِ دیوار کون ہے

شاعر: نجیب احمد — پسند: اسد اسحاق، نارتھ کراچی

لا کے ماتھے پہ شکن، وقت سے سمجھوتا کیا
غم کی تاریخ کے ہم اتنے گنہگار ہوئے

شاعر: نازش حیدری — پسند: الفی کامران، محمود آباد

کون سی بستی ہے ذرا آنکھ تو مل کر دیکھو
پیڑ ہر راہ میں موجود، مگر چھاؤں نہیں

شاعر: بشارت نواز — پسند: دعا عرفان، بفرزون

اپنی خامیوں کو پسِ پشت ڈال کر
ہر شخص کہہ رہا ہے، زمانہ خراب ہے

شاعر: خالد محمود — پسند: جواد، کراچی

تاریخوں کا اتفاق

غلام حسین میمن

☆ ۱۴- ستمبر ۷۸۶ء (بہ مطابق ۱۵ ربیع الاول ۱۷۰ھ) اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس تاریخ کو ایک عباسی خلیفہ ہادی کا انتقال ہوا، ایک عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے امورِ مملکت سنبھالا اور مستقبل کے عباسی خلیفہ مامون الرشید نے اس دنیا میں آنکھ کھولی۔

مختصر تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس تاریخ کو چوتھے عباسی خلیفہ ہادی کا ایک سال تین ماہ خلیفہ رہنے کے بعد انتقال ہو گیا۔ ہادی کا اصل نام موسیٰ تھا۔ پانچویں عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے خلافت سنبھالی اور اسی رات ترتیب کے اعتبار سے ساتویں خلیفہ مامون الرشید کی پیدائش عمل میں آئی۔ مامون کی عمر بہ مشکل چار دن ہی تھی کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ مامون، ہارون الرشید کا بیٹا تھا۔

☆ ہندستان کی تاریخ میں ۱۷۱۹ء (۱۱۳۱ھ) کا سال اس اعتبار سے اہم رہا ہے کہ اس سال تین بادشاہوں کو حکومتیں ملیں۔ یہ تین بادشاہ رفیع الدرجات، رفیع الدولہ اور روشن اختر تھے۔

☆ علامہ شبلی نعمانی اردو کے صاحبِ طرز ادیب اور عالم تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی کتاب ''سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' ہے۔ یہ ابھی نامکمل تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں ان کے لائق ترین شاگرد سید سلیمان ندوی نے یہ کتاب مکمل کی۔

علامہ شبلی نعمانی جس سال پیدا ہوئے وہ ۱۸۵۷ء کا سال تھا۔ جب ہندستان کے مسلمانوں نے جنگِ آزادی لڑی تھی۔ یہ جنگ ناکامی پر ختم ہوئی۔ حُسنِ اتفاق کہ علامہ شبلی

نعمانی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا تو وہ سال پہلی عالمگیر جنگ کے آغاز کا سال تھا۔

☆ علامہ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اس طرح ۹ نومبر علامہ محمد اقبال کی سال گرہ کا دن اور یہی تاریخ ان کی والدہ کی تاریخِ وفات بھی ہے۔ ان کی والدہ امام بی بی کا ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو سیالکوٹ میں انتقال ہوا۔ علامہ اقبال انھیں ''بے جی'' کے نام سے پکارتے تھے۔ والدہ سے محبت کا اظہار ان کی ۸۶ اشعار پر مشتمل نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' میں بھی ملتا ہے، جو علامہ محمد اقبال کے شعری مجموعے بانگِ درا میں شامل ہے۔ اس کا آخری شعر ہے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆ ۱۱- ستمبر کو قائداعظم محمد علی جناح کا انتقال ہوا تھا۔ قائداعظم پر اخبارات میں کئی مضامین لکھنے اور ان کی سوانحی کتابیں لکھنے کا اعزاز حاصل کرنے والے رضوان احمد کا انتقال بھی ۱۱- ستمبر ہی کو ہوا۔ عیسوی سنہ ۲۰۱۲ء تھا۔ ان کی خواہش بھی یہی تھی کہ اللہ کرے میرا انتقال بھی میرے قائد کی برسی کے دن ہو، تا کہ اس بہانے میں یاد رکھا جاؤں۔

☆ ۱۶ جنوری کو تحریکِ پاکستان کے ۲ رہنماؤں کا انتقال ہوا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۱۵ء کو مسلم لیگ کے بانی رکن نواب سلیم اللہ خان کا انتقال ہوا۔ دوسرے راہنما حسن امام تھے۔ ان کا انتقال ۱۶- جنوری ۱۹۸۵ء کو ہوا۔ وہ مسلم لیگ کی مختلف کمیٹیوں کے رکن اور ۱۹۹۶ء کے عام انتخاب میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

☆ ۱۶- اکتوبر تحریکِ پاکستان کے دو رہنماؤں کی تاریخِ وفات ہے۔ ایک نواب

محسن الملک، جو سر سید احمد خاں کے ساتھیوں میں سے تھے۔ انھوں نے ۱۶-اکتوبر ۱۹۰۷ء کو انتقال فرمایا اور دوسرے قائد ملت لیاقت علی خاں تھے، جنھیں ۱۶-اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی کے جلسہ عام میں شہید کر دیا گیا۔

☆ تحریک پاکستان کے دو رہنما ایسے بھی ہیں، جن کی ایک ہی ماہ میں تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات آتی ہے۔ ان میں ایک تو نواب زادہ لیاقت علی خاں ہیں، جو یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو کرنال میں پیدا ہوئے اور ۱۶-اکتوبر ۱۹۵۱ء کو انھوں نے راولپنڈی میں شہادت پائی۔ دوسری شخصیت مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح ہیں، جنھوں نے ۳۱ جولائی ۱۸۹۳ء کو کراچی میں آنکھ کھولی اور ۹ جولائی ۱۹۶۷ء کو اسی کراچی میں وفات پائی۔ ☆

کتوں کو پینشن دینے کا فیصلہ

انسانوں کو تو ریٹائرمنٹ کے بعد پینشن کا حق دار ٹھیرایا جاتا ہے۔ برطانیہ میں اب انسانوں کے ساتھ ساتھ پولیس کے کتوں کو بھی ریٹائرمنٹ کے بعد پینشن دی جائے گی۔ برطانیہ کے ایک علاقے نوٹنگھم شائر کے پولیس افسروں نے اپنے کتوں کو افسر کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے انھیں ریٹائرمنٹ کے وقت ۱۵۰۰ پاؤنڈ پینشن دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ نوٹنگھم شائر کی پولیس برطانیہ کی پہلی پولیس فورس بن گئی ہے، جس نے انھیں پینشن دینے کا فیصلہ کر کے تربیت یافتہ کتوں کو مجرم پکڑنے میں ان کے کردار کو تسلیم کر لیا ہے۔

مرسلہ : علی بن یونس

ایک چیل کی کہانی

ڈاکٹر جمیل جالبی

بچو! یہ اس چیل کی کہانی ہے، جو کئی دن سے ایک بڑے سے کبوتر خانے کے چاروں طرف منڈلا رہی تھی اور تاک میں تھی کہ اُڑتے کبوتر پر جھپٹا مارے اور اسے لے جائے، لیکن کبوتر بھی بہت پھرتیلے، ہوشیار اور تیز اُڑان تھے۔ جب بھی وہ کسی کو پکڑنے کی کوشش کرتی وہ پھرتی سے بچ کر نکل جاتا۔ چیل بہت پریشان تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

آخر اس نے سوچا کہ کبوتر بہت چالاک، پھرتیلے اور تیز اُڑان ہیں۔ کوئی اور چال چلنی چاہیے۔ کوئی ایسی ترکیب کرنی چاہیے کہ وہ آسانی سے اس کا شکار ہو سکیں۔

چیل کئی دن تک سوچتی رہی۔ آخر اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ وہ کبوتروں کے پاس گئی۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھی رہی اور پھر پیار سے بولی:

''بھائیو! اور بہنو! میں بھی تمھاری طرح دو پیروں اور دو پروں والا پرندہ ہوں۔ تم بھی آسمان پر اُڑ سکتے ہو۔ میں بھی آسمان پر اُڑ سکتی ہوں۔ فرق یہ ہے کہ میں بڑی ہوں اور تم چھوٹے ہو۔ میں طاقت ور ہوں اور تم میرے مقابلے میں کم زور ہو۔ میں دوسروں کا شکار کرتی ہوں، تم نہیں کر سکتے۔ میں بلی کو حملہ کر کے زخمی کر سکتی ہوں اور اسے اپنی نوکیلی چونچ اور تیز پنجوں سے مار بھی سکتی ہوں۔ تم یہ نہیں کر سکتے۔ تم ہر وقت دشمن کی زد میں رہتے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ پوری طرح تمھاری حفاظت کروں، تاکہ تم ہنسی خوشی، آرام اور اطمینان کے ساتھ اسی طرح رہ سکو، جس طرح پہلے زمانے میں رہتے تھے۔ آزادی تمھارا پیدائشی حق ہے اور آزادی کی حفاظت میرا فرض ہے۔ میں تمھارے لیے ہر وقت پریشان رہتی ہوں۔ تم ہر وقت باہر کے خطرے سے ڈرے سہمے رہتے ہو۔ مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ تم سب مجھ سے ڈرتے ہو۔

بھائیو! اور بہنو! میں ظلم کے خلاف ہوں۔ انصاف اور بھائی چارے کی حامی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ انصاف کی حکومت قائم ہو۔ دشمن کا منھ پھیر دیا جائے اور تم سب ہر خوف سے آزاد، اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کرسکو۔ میں چاہتی ہوں کہ تمھارے میرے درمیان ایک سمجھوتا ہو۔ ہم سب عہد کریں کہ ہم مل کر امن کے ساتھ رہیں گے۔ مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے اور آزادی کی زندگی بسر کریں گے، لیکن یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ تم دل و جان سے مجھے اپنا بادشاہ مان لو۔ جب تم مجھے اپنا بادشاہ مان لو گے اور مجھے شاہی حقوق اور پورا اختیار دے دو گے تو پھر تمھاری حفاظت اور تمھاری آزادی پوری طرح میری ذمے داری ہوگی۔ تم ابھی سمجھ نہیں سکتے کہ پھر تم کتنے آزاد اور کتنے خوش و خرم رہو گے۔ اسی کے ساتھ آزادی، چین اور سکون کی نئی زندگی شروع ہوگی۔"

چیل روز وہاں آتی اور بار بڑے پیار محبت سے ان باتوں کو طرح طرح سے دہراتی۔ رفتہ رفتہ کبوتر اس کی اچھی اور میٹھی میٹھی باتوں پر یقین کرنے لگے۔

ایک دن کبوتروں نے آپس میں بہت دیر مشورہ کیا اور طے کر کے اسے اپنا بادشاہ مان لیا۔

اس کے دو دن بعد تخت نشینی کی بڑی شان دار تقریب ہوئی۔ چیل نے بڑی شان سے حلف اُٹھایا اور سب کبوتروں کی آزادی، حفاظت اور ہر ایک سے انصاف کرنے کی قسم کھائی۔ جواب میں کبوتروں نے پوری طرح حکم ماننے اور بادشاہ چیل سے پوری طرح وفادار رہنے کی دل سے قسم کھائی۔

بچو! پھر یہ ہوا کہ کچھ دنوں تک چیل کبوتر خانے کی طرف اسی طرح آتی رہی اور ان کی خوب دیکھ بھال کرتی رہی۔ ایک دن بادشاہ چیل نے ایک بلّے کو وہاں دیکھا تو اس پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایسا زبردست حملہ کیا کہ بلّا ڈر کر بھاگ گیا۔ چیل اکثر اپنی

میٹھی میٹھی باتوں سے کبوتروں کو لبھاتی اور انھیں حفاظت اور آزادی کا احساس دلاتی۔

اسی طرح کچھ وقت اور گزر گیا۔ کبوتر اب بغیر ڈرے اس کے پاس چلے جاتے۔ وہ سب آزادی اور حفاظت کے خیال سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔

ایک صبح کے وقت جب کبوتر دانہ چگ رہے تھے، چیل ان کے پاس آئی۔ وہ کم زور دکھائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیمار ہے۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی اور پھر شاہانہ آواز میں بولی: ''بھائیو! اور بہنو! میں تمھاری حکمران ہوں۔ تم نے سوچ سمجھ کر مجھے اپنا بادشاہ بنایا ہے۔ میں تمھاری حفاظت کرتی ہوں اور تم چین اور امن سے رہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میری بھی کچھ ضرورتیں ہیں۔ یہ میرا شاہی اختیار ہے کہ جب میرا جی چاہے

اپنی مرضی سے تم میں سے ایک کو پکڑوں اور اپنے پیٹ کی آگ بجھاؤں۔ میں آخر کب تک بغیر کھائے پیے زندہ رہ سکتی ہوں؟ میں کب تک تمھاری خدمت اور تمھاری حفاظت کر سکتی ہوں؟ یہ صرف میرا ہی حق نہیں ہے کہ میں تم میں سے جس کو چاہوں پکڑوں اور کھا جاؤں، بلکہ یہ میرے سارے شاہی خاندان کا حق ہے۔ آخر وہ بھی تو میرے ساتھ

مل کر تمھاری آزادی کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس دن اگر اس بڑے سے چلنے پر میں اور میرے خاندان والے مل کر حملہ نہ کرتے تو وہ پتا نہ معلوم تم میں سے کتنوں کو کھا جاتا اور کتنوں کو زخمی کر دیتا۔"

یہ کہہ کر بادشاہ چیل قریب آئی اور ایک موٹے سے کبوتر کو پنجوں میں دبوچ کر

لے گئی۔ سارے کبوتر منھ دیکھتے رہ گئے۔

اب بادشاہ چیل اور اس کے خاندان والے روز آتے اور اپنی پسند کے کبوتر کو پنجوں میں دبوچ کر لے جاتے۔

اس تباہی سے کبوتر اب ہر وقت پریشان اور خوف زدہ رہنے لگے۔ ان کا چین اور سکون مٹ گیا تھا۔ ان کی آزادی ختم ہو گئی۔ وہ اب خود کو پہلے سے بھی زیادہ غیر محفوظ سمجھنے لگے اور کہنے لگے: "ہماری بے وقوفی کی یہی سزا ہے۔ آخر ہم نے چیل کو اپنا بادشاہ کیوں بنایا تھا؟ اب کیا ہو سکتا ہے؟"

☆☆☆

محنت کا پھل

فضیلہ کشمالہ ذکا بھٹی

پُرانے زمانے کا ذکر ہے کسی ملک کے ایک گاؤں میں ایک غریب اور بیوہ عورت رہتی تھی۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کی عمر نو سال، دوسرے کی دس سال اور تیسرے کی بارہ سال تھی۔

غریب عورت کپڑے پر ریشم کے دھاگوں سے بہت خوب صورت پھول پتیاں بناتی اور یہ کپڑا شہر لے جا کر بیچ ڈالتی۔ اس سے وہ اپنا اور اپنے تینوں بیٹوں کا پیٹ پالتی۔ تینوں لڑکے گاؤں کے ایک اسکول میں پڑھتے تھے۔

ایک دن غریب عورت بازار میں کپڑا بیچ کر کھانے پینے کی چیزیں خریدنے جا رہی

تھی کہ راستے میں تصویروں کی ایک دکان پر اس نے ایک بہت خوب صورت تصویر دیکھی۔ تصویر میں ایک خوش نما محل بنا ہوا تھا۔ محل میں بہت ہی خوب صورت باغیچہ تھا، جس میں رنگ برنگے پھولوں اور پھلوں کے پودے اور درخت تھے۔ ایک طرف بہت سے پرندے اور دوسری طرف ہرن کھڑے تھے۔ یہ سب اصلی معلوم ہو رہے تھے۔ عورت کو یہ تصویر بہت پسند آئی۔ اس نے سوچا کہ اگر میں کپڑے پر اس تصویر جیسا محل اور باغیچہ کاڑھ لوں تو کیسا اچھا لگے گا۔ یہ سوچ کر اس نے تصویر خرید لی۔ وہ عورت جب گھر آ رہی تھی تو اسے راستے میں خیال آیا، کیسا اچھا ہوتا اگر اس کے پاس ایک ایسا ہی خوب صورت محل ہوتا۔ وہ کتنے آرام چین سے اس میں رہتی، مگر یہ سب باتیں خواب کی طرح تھیں۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس نے اپنے بیٹوں کو وہ تصویر دکھائی۔ انھیں بھی تصویر پسند آئی اور سب نے اس کی بہت تعریف کی۔ اب اس عورت نے ایک بڑا سا کپڑا لے کر اس پر ریشم کے رنگین دھاگوں سے یہ محل بنانا شروع کر دیا۔ ایک سال گزر گیا، مگر محل تیار نہ ہو سکا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور رات دن محنت کر کے محل اور باغ کی تصویر کاڑھتی رہی۔ اس دوران وہ تھوڑا بہت دوسرا کڑھائی کا کام کر کے اپنے بیٹوں کو دے دیتی اور وہ بازار میں بیچ کر اس سے کھانے پینے کی چیزیں خرید لیتے۔

بڑی محنت مشقت کے بعد تین سال میں یہ تصویر مکمل ہوئی، جو اصلی تصویر سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ وہ اس کپڑے کو پھیلا کر دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کپڑے کو اُڑا کر لے گیا۔ عورت اور اس کے بیٹوں نے بہت کوشش کی کہ اس کپڑے کو پکڑ لیں، مگر وہ آسمان میں مشرق کی طرف اُڑتا چلا گیا۔ اس عورت کو بے حد

رنج ہوا اور وہ اپنی تین سال کی محنت کو یوں جاتے ہوئے دیکھ کر غم کے مارے بے حال ہوگئی۔ اس کے بیٹوں کو بھی بہت رنج ہوا۔ عورت نے اپنے بڑے بیٹے سے کہا کہ تم مشرق کی طرف جاؤ اور جیسے بھی ہو سکے تم میرا کپڑا واپس لاؤ۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

لڑکا اپنی ماں کے غم کو دیکھ کر بہت رنجیدہ تھا۔ چناں چہ وہ فوراً مشرق کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک مہینے کے بعد ایک پہاڑی پر بنے ہوئے محل کے پاس پہنچا۔ وہاں سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ محل کے باغ میں ایک طرف خوش رنگ سرخ سرخ خوبانیوں کا ایک درخت تھا۔ لڑکے کو بھوک بھی بہت لگی تھی۔

اس نے بوڑھی عورت سے اجازت لے کر بہت سی خوبانیاں پیٹ بھر کر کھائیں، پھر اس بوڑھی عورت نے اس لڑکے سے پوچھا: ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

لڑکے نے بتایا کہ میری ماں نے تین سال کی محنت کے بعد کپڑے پر ایک خوب صورت تصویر کاڑھ کر تیار کی تھی۔ اسے ہوا اس طرف اُڑا کر لے آئی۔

بڑھیا نے کہا: "ہاں مجھے معلوم ہے یہاں سے کچھ دور سرخ پہاڑیوں کے پاس جو سورج مکھی پہاڑ ہے، وہاں ایک محل ہے۔ اس میں پریوں کی شہزادی رہتی ہے۔ اس شہزادی کو یہ کپڑا بہت پسند آیا اور اس نے اُڑا لیا ہے۔ اب وہ اپنی سہیلی پریوں کے ساتھ مل کر اسی نمونے کا کپڑا کاڑھ رہی ہے، مگر تم وہاں بہت مشکل سے پہنچ سکو گے۔"

لڑکے نے کہا: "جس طرح بھی ہو میں وہاں ضرور جاؤں گا اور کپڑا لے کر آؤں گا، ورنہ میری ماں غم کے مارے زندہ نہ رہے گی۔"

بوڑھی عورت نے کہا: "شہزادی تک پہنچنے کے لیے تمھیں سب سے پہلے اپنے دو دانت نکالنے پڑیں گے۔ وہ دانت نکال کر اس پتھر کے گھوڑے کے منھ میں لگا دو، پھر یہ گھوڑا اپنی اصلی حالت میں آ جائے گا۔ تم اس پر سوار ہو کر محل کی طرف جاؤ، راستے میں سب سے پہلے تمھیں ایک آتش فشاں پہاڑ ملے گا، اس سے گزرنا بہت مشکل ہے۔ اگر تم نے ذرا سی بھی غفلت کی تو یہ پہاڑ تمھیں جلا کر راکھ کر دے گا۔ اس پہاڑ سے ہمت کے ساتھ گزر گئے تو پھر ایک برفانی سمندر ملے گا، جو تمھیں برف کی طرح ٹھنڈا کر دے گا۔ اگر تم اس سے بھی گزر گئے تو پھر تم پریوں کی شہزادی کے محل تک پہنچ جاؤ گے۔"

لڑکا یہ باتیں سن کر گھبرا گیا۔ یہ دیکھ کر بوڑھی عورت نے کہا: "میں تم کو ایک بکس دیتی ہوں، جس میں سونا بھرا ہوا ہے۔ تم اسے لے جاؤ اور ماں بیٹے ساری عمر چین آرام سے زندگی بسر کرو۔ کپڑے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں مت ڈالو۔"

لڑکا اس پر راضی ہو گیا اور بوڑھی عورت سے سونے کا بکس لے لیا۔ اس نے سوچا میں یہ سونا لے کر اپنے گھر کیوں جاؤ؟ کیوں نہ شہر چلا جاؤں اور آرام سے تنہا رہ کر اپنی زندگی گزار دوں، یہ سوچ کر وہ سونے کا بکس لیے ہوئے شہر چلا گیا۔

بہت دن ہو گئے جب اس عورت کا بیٹا واپس نہ آیا تو وہ اس غم سے سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹے سے جو اب تیرہ سال کا تھا، کہا کہ تمھارا بھائی لوٹ کر نہیں آیا، نہ جانے اس پر کیا بیتی۔ اب تم جلدی سے جاؤ اور اپنے بھائی اور کپڑے کو ڈھونڈ کر لاؤ۔

دوسرا لڑکا ماں کے کہنے پر چل پڑا۔ وہ بیس روز کے بعد اسی محل میں پہنچا، جہاں بڑھیا رہتی تھی۔ بڑھیا نے اس کے آنے کا سبب پوچھا۔ جب اس نے بھی اپنی ماں کے کپڑے کا حال بتایا تو بڑھیا نے پہلے لڑکے کی طرح اسے بھی ساری باتیں بتائیں اور کہا: ''تم اس مصیبت میں کیوں پڑتے ہو؟ میں تمھیں سونے سے بھرا بکس دیتی ہوں تم وہ لے جاؤ۔''

دوسرا لڑکا بھی بکس لے کر شہر چلا گیا اور پہلے لڑکے کی طرح لوٹ کر نہ آیا۔

اس غریب عورت کو اور بھی دکھ ہوا۔ اسے اپنے دونوں بیٹوں کی بھی فکر تھی اور تصویر کا بھی غم تھا۔ ماں اس غم سے بے حال ہو کر اور بھی بیمار ہو گئی۔ اس کے چھوٹے بیٹے نے جب ماں کا یہ حال دیکھا تو ارادہ کیا کہ وہ اپنے بھائیوں اور کپڑے کی تلاش میں جائے۔ ماں نے مجبور ہو کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ پڑوس کی عورتیں غریب عورت کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ چھوٹا بیٹا روانہ ہو کر اسی محل میں پہنچا۔ اسے وہی بڑھیا ملی اور اس نے اسے وہی ساری باتیں بتائیں جو پہلے دونوں لڑکوں کو بتائی تھیں اور سونے کا بکس دے کر کہا کہ تم آرام سے اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔ لڑکے نے کہا: ''میں یہ نہیں لوں

گا۔ میں شہزادی کے محل میں جا کر اپنی ماں کا کپڑا واپس لاؤں گا۔"

لڑکے نے پتھر مار کر اپنے اگلے دو دانت توڑے اور پتھر کے گھوڑے کے منھ میں لگا دیے۔ پتھر کا گھوڑا اصلی بن گیا اور ہنہنانے لگا۔ پھر اس نے خوب سرخ خوبانیاں کھائیں۔

لڑکا اس پر سوار ہو گیا اور گھوڑا تیزی سے پہاڑ کی طرف بھاگنے لگا۔ راستے میں بڑھیا کا بتایا ہوا آتش فشاں پہاڑ ملا۔ لڑکا بڑی ہمت اور احتیاط سے اس کے شعلوں سے بچ کر گھوڑے کو وہاں سے نکال کر لے گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے برفانی سمندر ملا۔ گھوڑا جوں ہی اس میں چلنے لگا تو لڑکے کا سارا بدن برف کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا، مگر وہ بڑی ہمت سے گھوڑے پر بیٹھا ہوا وہاں سے گزر گیا۔

چلتے چلتے سامنے پریوں کی شہزادی کا خوش نما محل نظر آنے لگا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ شہزادی اور پریاں بیٹھی کپڑے پر اس کی ماں کی بنائی ہوئی تصویر کا نمونہ کاڑھ رہی ہیں۔

لڑکے کو دیکھ کر وہ سب حیران رہ گئیں اور اس سے پوچھا: "تم کون ہو اور یہاں تک کیسے آئے ہو؟"

لڑکے نے بتایا: "تم نے میری ماں کا بنایا ہوا کپڑا لے لیا ہے۔ میں وہ کپڑا لینے آیا ہوں۔"

شہزادی نے کہا: "ہم اس تصویر کے نمونے کو کپڑے پر کاڑھ رہے ہیں۔ تم آج کی رات یہاں پر رہو۔ ہم رات بھر میں اسے کاڑھ لیں گے، پھر تم اسے لے جانا۔"

لڑکا راضی ہو گیا۔ شہزادی نے لڑکے کو خوب عمدہ اور نفیس کھانے کھلائے۔ لڑکا تھکا ہارا تھا کھانا کھا کر سو گیا۔ آدھی رات کو جب اس کی آنکھ کھلی تو شہزادی اور پریاں آپس

میں باتیں کر رہی تھیں کہ ہم نے جو تصویر کاڑھی ہے وہ اچھی نہیں بنی۔ ہم یہ تصویر اس لڑکے کو نہیں دیں گے کچھ اور تحفے دے کر اس کو راضی کر لیں گے اور یہاں سے چلتا کریں گے۔

پریاں سمجھ رہی تھیں کہ شاید لڑکا سو رہا ہے۔ وہ چپ چاپ لیٹا ان کی یہ باتیں سن رہا تھا۔ پھر شہزادی اور پریاں سب کی سب سو گئیں۔ لڑکا چپکے سے اُٹھا اور اپنی ماں والا کپڑا لے کر گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے سرپٹ دوڑا دیا اور وہاں سے نکل آیا۔

راستے میں آتش فشاں پہاڑ اور برفانی سمندر سے گزرتا ہوا وہ بڑھیا کے محل میں آیا۔ بڑھیا اسے دیکھ کر حیران ہوئی اور اس کی بہادری اور ہمت کی بہت تعریف کی۔ اس نے بڑھیا کو سارا حال بتایا اور گھوڑے کے منھ سے دو دانت نکال کر اپنے منھ میں لگا لیے۔

گھوڑا پھر سے پتھر کا ہو گیا۔ بڑھیا نے لڑکے کی بہادری سے خوش ہو کر اسے سونے کا بکس بھی دے دیا۔ وہ خوشی خوشی سب چیزیں لے کر وہاں سے روانہ ہوا۔

جب گھر پہنچا تو ماں کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب تھی۔ وہ اپنے بیٹوں کے غم میں ہر وقت روتی رہتی تھی، جس سے اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور وہ تقریباً اندھی ہو گئی۔ پڑوس کی عورتیں اسے کھانے پینے کو دیتیں اور اس کی خدمت کرتیں۔ بیٹے کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی اور اپنی تصویر کا کپڑا آنکھوں کو لگاتے ہی اس کی آنکھیں بھی اچھی ہو گئیں۔ اسے سب کچھ نظر آنے لگا۔ اس نے کپڑے کو پھیلایا اور دیکھنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کپڑا اچھل کر بہت لمبا ہو گیا اور اتنا ہی چوڑا ہو گیا۔ پھر اس کے ٹوٹے ہوئے گھر کی جگہ ایک بہت بڑا محل نظر آنے لگا۔ اس میں تصویر کی جگہ اصلی پھولوں اور پھلوں کا ایک خوش نما باغ دکھائی دینے لگا اور بہت سے چرند پرند وہاں دوڑنے پھرنے لگے۔ غریب عورت اور

اس کالڑکا یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ان کے خوابوں کا محل ان کے سامنے آ گیا۔

بڑھیا نے جو سونے سے بھرا ہوا بکس دیا تھا اسے کھانے پینے پر خرچ کرنے لگے۔ محل میں ہر قسم کا اعلا سامان موجود تھا، جو سونے سے بنا تھا۔ اب یہ دونوں ماں بیٹے آرام سے رہنے لگے۔ انھوں نے گاؤں کے ان سب لوگوں کو بھی محل میں رہنے کے لیے بلا لیا، جنھوں نے عورت کی بیماری میں اس کی خدمت کی تھی، کیوں کہ یہ بہت بڑا عالی شان محل تھا۔ انھیں اسی طرح ہنسی خوشی رہتے رہتے کچھ دن گزر گئے۔

غریب عورت کو اب اپنے دونوں بیٹوں کا غم تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ جانے ان کو کیا ہو گیا ہے اور کہاں کس مصیبت میں پھنس گئے۔ ایک دن ان کے محل پر دو فقیر بھیک مانگتے ہوئے آئے۔ یہ دونوں غریب عورت کے بیٹے تھے۔

انھوں نے شہر میں رہ کر اپنا سونا تھوڑے دنوں میں عیش و آرام میں خرچ کر دیا اور بُرے حال میں پہنچے تو بھیک مانگنے لگے۔ اس محل کو دیکھ کر وہ سمجھے کہ یہ کسی بہت امیر آدمی کا محل ہے تو یہاں بھیک مانگنے آ گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی نے انھیں دیکھا تو پہچان گیا۔

پھر وہ ان کو ماں کے پاس لے گیا۔ ان دونوں نے ماں کے قدموں میں گر کر اور رو رو کر اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ اس کے بعد اپنے لالچ کی ساری کہانی بھی سنائی۔

ماں نے ان کو گلے لگا کر ان کا قصور معاف کر دیا اور یہ سب خوب چین سے زندگی گزارنے لگے۔ پھر تینوں لڑکوں نے خوب محنت کر کے پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔

اور اس طرح چھوٹے بھائی کی ہمت اور محنت نے سب کے دن پھیر دیے اور ان کی ماں کی محنت کا انعام اللہ تعالیٰ نے سب کو دیا۔

☆

نونہال بک کلب

کے ممبر بنیں اور اپنی ذاتی
لائبریری بنائیں

بک کلب کا ممبر بننے کے لیے بس ایک سادہ کاغذ پر اپنا نام،
پورا پتا صاف صاف لکھ کر ہمیں بھیج دیں، آپ کو نونہال بک کلب کا ممبر بنالیا جائے گا
اور ممبر شپ کے کارڈ کے ساتھ کتابوں کی فہرست بھی بھیج دیں گے۔

ممبر بننے کی کوئی فیس نہیں ہے۔

ممبر شپ کارڈ کی بنیاد پر آپ نونہال ادب کی کتابوں کی خریداری پر

۲۵ فی صد رعایت حاصل کر سکتے ہیں۔

جو کتابیں منگوانی ہوں، ان کے نام، اپنا پورا صاف پتا اور ممبر شپ کارڈ نمبر لکھ کر بھیجیں اور
رجسٹری فیس کی رقم اور کتابوں کی قیمت منی آرڈر کے ذریعے سے

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی

کے پتے پر بھیج دیں۔ آپ کے پتے پر ہم کتابیں بھیج دیں گے۔

کم سے کم ایک سو روپے کی کتابیں منگوانے پر
رجسٹری فیس ممبروں سے نہیں لی جائے گی

ان کتابوں سے لائبریری بنائیں۔ کتابیں خود بھی پڑھیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی پڑھوائیں۔

علم کی روشنی پھیلائیں

☆ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی - ۷۴۶۰۰

شہیدِ پاکستان

ادیب سمیع چمن

اونچی و اعلا تیری شان — تیری عظمت پہ قربان

تُو بھی تھا اِک پاکستان — پیارے شہیدِ پاکستان!

علم و ادب کا پیکر تھا تُو — پاک وطن کا محور تھا تُو

تیری ہمت عالی شان — پیارے شہیدِ پاکستان!

کردار و گفتار میں اعلا — قوم کا محسن ، چاہنے والا

حق گوئی تیری پہچان — پیارے شہیدِ پاکستان!

وقت کا پابند اس پہ دائم — تیری عزت قائم و دائم

جب تک سورج ، چاند رہے گا — تیرا زندہ نام رہے گا

ہر دل میں تیری زُبان

پیارے شہیدِ پاکستان!

روشنی پیدا کرنے والے جانور

ڈاکٹر سہیل برکاتی

سمندر کے سفر کے دوران رات کے وقت پانی میں جگنو سے چمکتے نظر آتے ہیں۔ بعض مقامات پر یہ چمک اتنی تیز اور زیادہ ہوتی ہے کہ سمندر کا ایک بڑا حصہ روشنیوں سے جگمگا اُٹھتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے ایک سائنس داں "بنجامن فرنکلین" کا خیال تھا کہ اس روشنی کی وجہ یہ ہے کہ سمندر دن میں سورج کی جو روشنی جذب کرتا ہے وہ رات کو روشنی کی شکل میں منعکس کرتا ہے۔ کچھ اور سائنس دانوں کے مطابق یہ روشنی لہروں کے آپس میں ٹکرانے یا لہروں کے کسی دوسری چیز مثلاً جہاز کے کناروں کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اٹھارویں صدی ہی میں دوسرے سائنس دانوں نے معلوم کیا کہ اس روشنی کی وجہ دراصل سمندر میں موجود ایک ایسا جانور ہے جس کا جسم صرف ایک خلیے (CELL) پر مبنی ہے، اسے نوکٹی لوکا (NOCTILUCA) کہتے ہیں۔ اس دریافت کے کچھ عرصے بعد ایک اور سمندری جانور نجم البحر (جیلی فش) کو بھی روشنی پیدا کرتے دیکھا گیا۔ زندہ جانداروں کے روشنی پیدا کرنے کے عمل کو حیاتی نورانیت (BIOLUMINESCENCE) کہتے ہیں۔

سمندر میں رہنے والے بہت سے جانور نورانیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مختلف طریقوں سے روشنی پیدا کرتے ہیں۔ روشنی ایک کیمیائی عمل کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہے جس میں ایک کیمیائی مادہ نورزا (LUCIFERIN) اور ایک خامرہ نور انگیز (LUCIFERASE) استعمال ہوتا ہے۔ سمندری مچھلیوں کی تقریباً بیس ہزار قسموں میں سے ایک سے ڈیڑھ ہزار قسمیں روشنی پیدا کرسکتی ہیں۔ سمندری جانور دو طرح سے روشنی

پیدا کر سکتے ہیں۔

پہلے طریقے میں روشنی پیدا کرنے کے لیے نہایت باریک نور بردار (PHOTOPHORE) استعمال ہوتے ہیں۔ نور بردار کو دیکھا جائے تو اس میں ایک عدسہ (لینس) روشنی لوٹانے کے لیے عاکس (REFLECTOR) اور ایک رنگ دار پردہ (اسکرین) ہوتا ہے۔ جانور کے جسم میں نور بردار باقاعدگی کے ساتھ پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔

دوسرے طریقے میں سمندری بیکٹیریا جانوروں کے جسم کے مختلف حصوں میں گھر بنالیتے ہیں اور اپنی غذا اس جانور سے حاصل کرتے ہیں۔ ان بیکٹیریا میں روشنی پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور یہ مستقل اس عمل کو جاری رکھتے ہیں۔ جن جانوروں کے جسم پر یہ بیکٹیریا رہتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ ہر وقت روشنی نہیں چاہتا، اس لیے وہ ایک پردے کے ذریعے سے اس جگہ کو ڈھانپنے کا انتظام کر لیتے ہیں، جہاں سے روشنی نکلتی ہے، تاکہ بوقتِ ضرورت پردے کو ہٹا لیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی جہاز جب اس علاقے سے گزرتا ہے، جہاں روشنی پیدا کرنے والے جانور کثرت سے ہوں تو پورا علاقہ روشن ہو جاتا ہے۔ یہ روشنی ان جانداروں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے سے بھی ہو سکتی ہے اور سمندر میں کسی طوفان یا زلزلے کی آمد سے بھی۔ حیاتی نورانیت یوں تو دنیا کے ہر حصے میں ہوتی ہے، لیکن وہ سمندر جو منطقۂ حارّہ میں آتے ہیں، اس کے لیے مشہور ہیں۔ بحیرۂ عرب میں جولائی اور ستمبر کے مہینوں میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

سمندری جانوروں میں روشنی پیدا کرنے کی صلاحیت کا فائدہ کیا ہے؟ ایک دو نہیں، بلکہ جانوروں کی بہت سی قسمیں "حیاتی نورانیت" کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اس عمل کے کچھ فائدے ہم بتاتے ہیں۔ روشنی پیدا کرنے والا جانور اپنی غذا آسانی سے تلاش کر سکتا ہے۔ غیر فقری یعنی بغیر ہڈی والے جانوروں کی ایک قسم یوفاسڈ (EUPHAUSIID) اور مچھلیوں کی ایک قسم مکٹوفم (MYCTOPHUM) اپنے نور بردار کی مدد سے غذا کو تلاش کرتی ہیں۔

سمندر کی تہ میں رہنے والی بعض مچھلیاں روشنی کی شعاعیں پھینک کر اپنے شکار کو پریشان کرتی ہیں اور پھر ان پر قابو پا لیتی ہیں۔ مثلاً "ماہی گیر مچھلی" (ANGLER) کے منھ کے قریب ایک راڈ ہوتی ہے، جس کے کنارے سے روشنی نکلتی ہے۔ کچھ مچھلیوں کے منھ کے اندرونی حصے میں نور بردار ہوتے ہیں، جن کی طرف چھوٹے چھوٹے جانور متوجہ ہوتے ہیں۔ ان مچھلیوں میں "چلغوزہ مچھلی" (PINE-CONE) شامل ہے۔ بعض زہریلی مچھلیوں میں روشنی پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، جیسے پورکتھس (PORICHTHYS) جس کو عام طور سے مڈشپ مین فش (MIDSHIPMAN FISH) کہتے ہیں۔ اس میں ایک زہریلا کانٹا ہوتا ہے۔ اس طرح ہم اس مچھلی کو کھانے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اگر ایک خاص قسم کی روشنی سمندر میں نظر آ رہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی شکاری جانور قریب میں موجود ہے، اس لیے دوسرے جانور اپنے بچاؤ کا سامان کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف بعض چھوٹے جانور بھی روشنی اسی لیے پیدا کرتے ہیں کہ اپنے اوپر حملے کے دوران روشنی پیدا کر کے شکاری کو بھگا دیا جائے۔ روشنی کی چمک کی وجہ سے ان کا پیچھا کرنے والا شکاری جانور وقتی طور پر دیکھ نہیں سکتا، اتنی دیر میں چھوٹے جانور دور نکل جاتے ہیں۔

جھینگوں سے ملتے جلتے بعض جانور جنھیں ''چپو پا'' (COPE PODS) کہتے ہیں، روشنی کے بادل چھوڑتے ہیں، جو پانی کو گدلا کر دیتے ہیں۔ گہرے سمندر میں رہنے والے صدفیہ جانوروں کی ایک قسم تیر ماہی (SQUID) پر جب کوئی بڑا جانور حملہ کرتا ہے تو یہ اپنے جسم میں موجود سیاہی کی طرح کا مائع نکال کر پانی کو گہرے رنگ کا بنا دیتی ہے اور اس کا دشمن اسے تلاش نہیں کر پاتا۔

سمندر میں روشنی پیدا کرنے کے عمل کا فائدہ ان جانوروں کو بھی ہوتا ہے جو گروہ بنا کر بہت بڑی تعداد میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں گروہ کے ممبر ایک دوسرے کو روشنی کے ذریعے سے آسانی سے پہچان سکتے ہیں، کیوں کہ روشنی پیدا کرنے کے طریقے ہر نوع کے مخصوص ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ سمندر کی وسیع و عریض دنیا میں جہاں بے شمار قسم کے جانور پائے جاتے ہیں رات کے اندھیرے اور سمندر کی گہرائی میں روشنیوں کی مدد سے جانور اپنی حدود کا تعین بھی کرتے ہوں۔ ☆

غیر ملکی کہاوتیں

☆ عمدہ دوا اکثر کڑوی ہوتی ہے۔ (جاپانی کہاوت)

☆ جہاں صدق و خلوص نظر نہ آئے وہاں دوستی کا ہاتھ نہ بڑھاؤ، ورنہ تنہائی ہی تمھاری بہترین رفیق ہے۔ (ایرانی کہاوت)

☆ کپڑے کاٹنے سے پہلے سات بار ناپ لو، کیوں کہ اسے کاٹنے کا ایک ہی موقع ملتا ہے۔ (روسی کہاوت)

☆ بغیر دیکھے کوئی چیز منھ میں نہ ڈالو اور بغیر پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہ کرو۔ (امریکی کہاوت)

☆ جو بات عقل چھپاتی ہے، نشہ اسے ظاہر کر دیتا ہے۔ (لاطینی کہاوت)

☆ بزدل مریض کو کوئی ڈاکٹر اچھا نہیں کر سکتا۔ (افغانی کہاوت)

☆☆☆

مشورہ

کرشن پرویز

بچو! جب بھی منھ تم کھولو
جو بھی بولو ، سوچ کے بولو

جو بھی کہنا ، پیار سے کہنا
سب سے اچھا ، میٹھا بولو

پیار محبت سب میں بانٹو
دل میں اپنے زہر نہ گھولو

وقت کی قدر و قیمت سمجھو
تم یوں ہی بے کار نہ ڈولو

وقت پہ پڑھنا ، وقت پہ سونا
وقت پہ کھانا ، وقت پہ کھیلو

نئی زندگی

پروفیسر مشتاق اعظمی، انڈیا

پچھلے سال مُنّی کی آٹھویں سال گرہ کے موقع پر مُنّی کی ایک بہت ہی عزیز سہیلی نے تحفے میں اُسے مخمل کا بنا ہوا ایک ننھا سا خوب صورت کتا پیش کیا تھا۔ مُنّی کو تمام تحفوں میں یہ کتا ہی سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔ اس نے اس کا نام روبی رکھا۔ وہ اس کے ساتھ بہت خوش ہوتی تھی اور اس کی حفاظت بھی کرتی تھی، لیکن کچھ دنوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے مُنّی، روبی کو بھول سی گئی ہے، کیوں کہ اس نے روبی کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ روبی اب میز پر اُداس پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر گرد کی تہ جم گئی تھی۔ دونوں کان جو ہمیشہ کھڑے رہتے تھے اب اس کے چہرے پر لٹک آئے تھے۔ بٹن کی بنی ہوئی اس کی سیاہ چمکیلی آنکھیں دھاگوں کے ساتھ اس کے گالوں پر آنسوؤں کی بوندوں کی طرح جھول رہی تھیں۔

ایک رات کی بات ہے۔ مُنّی جلد سو گئی۔ اس کے دونوں بھائی راشد اور ساجد اپنے پرانے کھلونوں کو اکٹھا کر کے گتے کے ایک بڑے ڈبے میں رکھنے میں مصروف تھے۔ دوسری صبح کھلونوں کا یہ ڈبا انھیں غریب اور بیمار بچوں کے لیے اسپتال بھیجنا تھا۔ کھلونے اکٹھا کرتے ہوئے راشد کی نظر مُنّی کے روبی پر پڑی، جو میز پر نئے نئے کھلونوں کے درمیان حسرت اور نا اُمیدی لیے یوں پڑا تھا، جیسے کوئی بیمار آدمی تن درست لوگوں کے درمیان بیٹھا ہو۔ راشد نے لپک کر اسے اُٹھا لیا اور ساجد سے کہا: ”بھیا! روبی کو بھی ان کھلونوں میں شامل کر لو۔“

”نہیں راشد! یہ مُنّی کا کھلونا ہے۔ وہ بُرا مان جائے گی۔“ ساجد نے جواب دیا۔

''منّی تو اس سے جی بھر کے کھیل چکی ہے۔ وہ اس خستہ حال کھلونے کو رکھ کر کیا کرے گی؟ وہ ہرگز برا نہیں مانے گی۔'' راشد نے یہ کہتے ہوئے روبی کو بھی ڈبے میں ڈال دیا۔ کھلونوں کا یہ ڈبا دوسرے روز اسپتال روانہ کر دیا گیا۔

اُسی روز کھیلتے کھیلتے یکا یک منّی کو روبی کا خیال آیا۔ اُس نے میز کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ روبی میز پر موجود نہیں تھا۔ اس نے میز کے نیچے جھانکا۔ روبی وہاں بھی نہیں تھا۔ منّی نے اپنے بستر کے نیچے ٹٹولا، کھلونا رکھنے کی الماری میں تلاش کیا، لیکن روبی کو کہیں نہ پایا۔ وہ پریشان ہو کر امی کے پاس پہنچی اور ان سے دریافت کیا، مگر وہ بھی روبی کے بارے میں کچھ نہ بتا سکیں۔ پھر وہ راشد اور ساجد کے پاس گئی اور پوچھا: ''آپ نے میرے روبی کو تو نہیں دیکھا؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

راشد اور ساجد نے پریشان نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک منٹ خاموش رہ کر ساجد بولا: ''ہاں منّی! ہم نے تمھارے روبی کو اسپتال کے غریب اور بیمار بچوں کے لیے بھیج دیا ہے۔ ہم نے وہاں اپنے بھی بہت سارے کھلونے بھیجے ہیں اور تمھارا روبی تو بہت خستہ حال......'' ساجد بات پوری بھی نہ کر سکا، کیوں کہ منّی کے آنسو تیزی کے ساتھ بہ نکلے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منھ ڈھانپ کر بیٹھ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔ راشد اور ساجد نے اسے چپ کرانے کی جتنی کوشش کی منّی کی سسکیوں کی آواز اتنی ہی تیز ہوتی گئی۔ آخر امی کو بیچ میں آنا پڑا۔ انھوں نے راشد اور ساجد کو ڈانٹ پلائی اور منّی سے روبی کی جگہ دوسرا کھلونا لا دینے کا وعدہ کیا۔

لیکن منّی کو کسی صورت چین نہیں تھا۔ اُسے روبی کی یاد بُری طرح ستا رہی تھی۔ روبی

میلا کچیلا اور خستہ حال سہی وہ مُنّی کو پھر بھی پیارا تھا، اس لیے کہ وہ اس کی بہت ہی عزیز سہیلی کی یادگار تھا۔

اگلی صبح مُنّی سو کر اُٹھی تو اس کا تکیہ بھیگا ہوا تھا۔ آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور گالوں پر آنسو بہنے کے نشان تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہے۔ امی سے مُنّی کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مُنّی کو لے کر اسپتال جائیں گی۔ مُنّی کی بے چینی اور بے قراری کا یہی علاج تھا۔

مُنّی اور اس کی امی اسپتال کے ایک کشادہ کمرے میں تھیں، جہاں ایک لمبی میز کے سامنے کرسی پر سفید کپڑے پہنے ایک نرس بیٹھی تھی۔ میز پر پُرانے اور مرمت طلب کھلونے بڑی تعداد میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی قینچی، کپڑے سے جھاڑنے کا برش اور چاقو وغیرہ بھی میز پر موجود تھے۔ نرس سوئی دھاگے کی مدد سے کپڑے کے ایک بوسیدہ کھلونے کی مرمت میں مصروف تھی۔

امی نے نرس کو بتایا کہ مُنّی کا روبی وہاں غلطی سے بھیج دیا گیا ہے اور مُنّی اس کے لیے بے کل ہے۔ نرس نے اپنے دماغ پر ذرا سا زور دیا اور کونے میں رکھی ہوئی شیشے کی ایک چھوٹی سی الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''مُنّی! وہ ہے تمھارا روبی، جاؤ، اپنے ہاتھوں سے اُٹھا لو۔''

مُنّی نے الماری میں رکھے ہوئے روبی کو دیکھا اور حیران رہ گئی۔ یقیناً وہ روبی ہی تھا، لیکن اب پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس کا مخملی جسم اتنا صاف اور نکھرا ہوا تھا، جیسے اسے غسل دیا گیا ہو۔ اس کے کان سیدھے کھڑے تھے۔ آنکھیں اب اپنی درست جگہ پر تھیں اور ان

میں خوشی اور اطمینان کی جھلک تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مُنّی کو خاموش اور حیران دیکھ کر نرس مسکرائی۔

وہ بولی: ''مُنّی! تمھیں خوش دیکھ کر اسپتال کے بچے بھی روبی کے چلے جانے کا کوئی رنج نہ کریں گے۔''

مُنّی چپ چاپ کھڑی کبھی روبی اور کبھی نرس کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک وہ بول پڑی: ''آپ روبی کو یہیں رہنے دیجیے۔ وہ یہاں زیادہ خوش ہے۔ آپ نے اسے نئی زندگی دی ہے، سنوارا ہے۔ اسے کسی ایسے بچے کو دے دیجیے جو مجھ سے زیادہ اس کا حق دار ہو، اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکتا ہو۔''

اس کے بعد مُنّی نے روبی کو اور نرس کو خدا حافظ کہا اور امی کے ساتھ واپس چل پڑی۔

مُنّی اور اس کی امی اسپتال کا آخری زینہ طے کر رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور سورج بھی ایک بادل کی اوٹ سے مسکرا رہا تھا۔ ☆

ایک آدمی ریلوے میں نوکری کے لیے گیا۔ انٹرویو والے افسر نے اس سے پوچھا: ''اگر آپ دیکھیں کہ ایک ہی پٹری پر دو ریل گاڑیاں آمنے سامنے آ رہی ہیں تو آپ کیا کریں گے؟''

''میں اسٹیشن ماسٹر کو بتاؤں گا۔'' وہ آدمی بولا۔

افسر نے کہا: ''اگر اسٹیشن ماسٹر موجود نہ ہو تو؟''

''تب میں کانٹے والے کو بتاؤں گا۔'' اس آدمی نے جواب دیا۔

افسر نے کہا: ''اگر وہ بھی اپنی جگہ پر نہ ہو تو؟''

آدمی بولا: ''میری خالہ قریب ہی رہتی ہیں، ان کو بلا لاؤں گا۔ انھیں ریل گاڑیوں کی ٹکر دیکھنے کا بہت شوق ہے۔''

مرسلہ : جمال اعزاز بلوچ، تربت

مسکراتی لکیریں

ڈاکٹر: ''آپ کو مبارک ہو، آپ کے کان کا آپریشن کام یاب ہو گیا ہے۔''

مریضہ: ''ذرا زور سے بولیں، مجھے آواز نہیں سنائی دے رہی ہے۔''

لطیفہ : سیدہ اریبہ بتول، سید وسیم حیدر شاہ، لیاری ٹاؤن، کراچی

آیئے مصوری سیکھیں

غزالہ امام
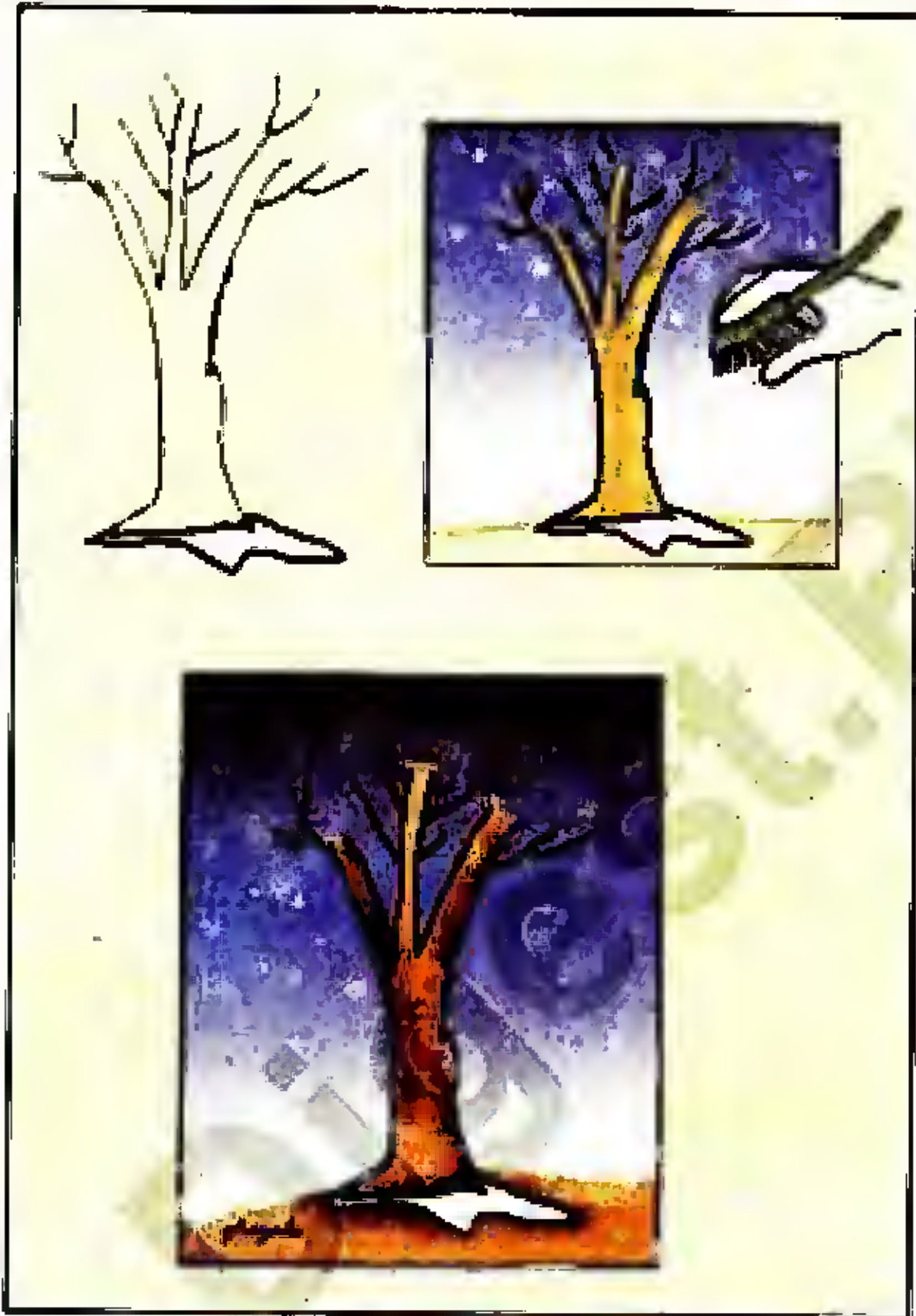
مصوری کے سلسلے میں اب تک آپ کئی طریقے سیکھ چکے ہیں۔ آج آپ کو ایک نیا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ اس طریقے میں ٹوتھ برش کے ذریعے سے تصویر پر رنگ چھڑکا جاتا ہے۔ سب سے پہلے پنسل سے خاکہ بنا کر اس میں اپنی پسند کے رنگ بھر لیں۔ مثلاً تصویر میں دیکھیے ایک درخت کا خاکہ بنا کر رنگ بھرے گئے ہیں۔ پھر درخت پر برف باری کا تاثر دینے کے لیے سفید رنگ چھڑکا گیا ہے۔ رنگ چھڑکنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی پرانے ٹوتھ برش پر رنگ لگا کر انگوٹھے کی مدد سے جہاں ضرورت ہو، وہاں رنگ چھڑک دیں۔ مشق کرتے رہنے سے مہارت پیدا ہوگی۔

☆☆☆

تھانے دار کے نام ایک درخواست

گل نوخیز اختر

تھانے دار صاحب!

میرا نام انجم ملنگی ہے۔ پیشے کے اعتبار سے بزنس مین ہوں اور عرصہ بارہ سال سے بلال گنج میں تکے، کباب بیچ رہا ہوں۔ گزارش ہے کہ میں نے دو سال پہلے گڑھی شاہو والا مکان تبدیل کر کے یہاں ساڑھے تین مرلے کے مکان کا اوپری حصہ ساڑھے چار ہزار روپے کرائے پر لیا تھا۔ میرا مالک مکان ایک انتہائی مکار اور کینہ پرور انسان ہے۔ اس کے چار مکان ہیں اور چاروں کے چاروں کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اس شخص نے کرایہ طے کرنے کا اپنا ہی اصول بنا رکھا ہے، یہ بیس روپے کلو پر مکان دیتا ہے، آپ کو

یقیناً حیرت ہوئی ہوگی کہ یہ بیس روپے کلو کا کیا چکر ہے؟ مجھے بھی ہوئی تھی، جب پوچھا تو پتا چلا کہ یہ کرائے داروں کے وزن کے مطابق کرایہ لیتا ہے، مثلاً جیسے کہ میرا وزن ۶۰ کلو ہے، بیس روپے کے حساب سے ہوگئے ۱۲۰۰ روپے۔ اسی طرح میری بیوی کا وزن ۸۰ کلو ہے، یہ ہوگئے ۱۶۰۰ روپے۔ میرے بڑے بیٹے کا وزن ۵۰ کلو ہے، اُس کے ہوگئے ۱۰۰۰ روپے اور میرے چھوٹے بیٹے کا وزن ہے ۳۵ کلو، اُس کے ہوگئے ۷۰۰ روپے۔ یوں کُل ملا کر ہمارا کرایہ بنتا ہے ۴۵۰۰ روپے۔ کم بخت نے دروازے کے قریب ہی وزن کرنے والی مشین رکھی ہوئی ہے اور روز ہمارا وزن کرتا ہے، جس دن وزن کلو دو کلو زیادہ ہو جائے تو کھڑے کھڑے پیسے وصول کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم نے فوراً کھانا کھانا کم کر دیا تاکہ وزن کے ساتھ ساتھ کرایہ بھی کم ہو جائے۔

ایک دن جب ہم سب کا وزن پانچ پانچ کلو کم ہو گیا تو میں نے اس سے کہا کہ اب تو کرایہ بھی اسی حساب سے کم ہونا چاہیے، تو گھور کر بولا: ''صرف وزن بڑھنے سے کرایہ بڑھے گا، ورنہ اُتنا ہی رہے گا۔''

میں نے بے بسی سے پوچھا: ''آخر ہمارا وزن بڑھنے سے آپ کو کیا پریشانی ہے؟''

اطمینان سے بولا: ''تم لوگ اوپر کے حصے میں رہتے ہو، وزن بڑھ گیا تو میرے گھر کی چھت پر بوجھ پڑے گا، میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔''

تھانے دار صاحب! مکان کرائے پر دیتے وقت اس نے مجھ سے جس کرائے نامے پر دستخط کروائے تھے وہ میں نے بعد میں پڑھا تو میری آنکھیں اُبل پڑیں۔ شرائط میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ گھر کے باہر اپنے نام کی تختی (نیم پلیٹ) لگانے کی کوئی اجازت نہیں۔ اگر

ایسا ضروری ہو تو پھر آخر میں شیخ لکھنا لازمی ہوگا۔ آپ آج بھی میرے گھر آ کر دیکھ سکتے ہیں، باہر میری نیم پلیٹ پر واضح طور پر لکھا ہوا ہے:"ملک انجم ملنگی شیخ" سارے محلے والے مجھے"ملک شیخ" کہہ کر چھیڑتے ہیں، بے اختیاری کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ اب تو مجھے جوس والی دکان پر بھی"ملک شیک" کی بجائے"ملک شیخ" لکھا ہوا نظر آتا ہے۔

تھانے دار صاحب! یہ ظالم شخص صبح کے وقت پانی کی موٹر کا بٹن بند کر دیتا ہے اور پانی ہماری طرف چڑھ ہی نہیں پاتا، میں نے شکایت کی کہ ہمارے ہاں تو نہانے کے لیے بھی پانی نہیں آتا، تو غصے سے بولا:"روز نہاتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی؟"

"تھانے دار صاحب! کیا روز نہانا شرم والی بات ہے؟"

عالی جاہ! اس شخص نے ہم پر دیگر محلے داروں سے ملنے پر بھی پابندی لگائی ہوئی

ہے، کہتا ہے مجھے کرائے داروں کا زیادہ میل جول پسند نہیں، ہمیں سبزی والے سے بھاؤ تاؤ نہیں کرنے دیتا، کہتا ہے اس سے بھی تعلقات بڑھتے ہیں۔ ہمارے گھر میں جو بھی سالن پکتا ہے اُس میں سے یہ ایک ڈونگا اپنے لیے منگوا لیتا ہے۔ یقین کریں جس دن ہمیں مرغی پکانی ہو، پہلے دال کو تڑکا لگاتے ہیں۔ اس بے رحم شخص نے ہمارے ٹی وی دیکھنے پر بھی پابندی لگا رکھی ہے، کہتا ہے تمھارے گھر سے کارٹون نیٹ ورک کے علاوہ کسی اور چینل کی آواز آئی تو کرایہ ڈگنا کر دوں گا۔ یہ شخص ہمیں ہنسنے بولنے بھی نہیں دیتا، ایک دفعہ میرے چھوٹے بیٹے کی سال گرہ تھی، ہم سب گھر میں کیک کاٹتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے کہ یہ غصے سے بھرا ہوا اوپر آ گیا اور بولا: ''میری بیوی مر گئی ہے اور تم لوگ خوشیاں منا رہے ہو؟'' میں ڈر گیا اور آہستہ سے کہا: ''آپ کی بیگم تو دس سال پہلے وفات پا گئی تھیں، کیا دوبارہ مر گئی ہیں؟''

یہ سنتے ہی اس نے اپنا خوف ناک منھ میرے قریب کیا اور پھنکار کر بولا: ''کیا دس سال بعد مرنے والے کا غم خوشی میں بدل جاتا ہے؟''

تھانے دار صاحب! جس مکان میں ہم رہتے ہیں اس کی چھتوں کی خستہ حالی کا یہ عالم ہے کہ پچھلے دنوں بارش ہو رہی تھی، میں چارپائی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا، ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور میری چائے ہی نہ ختم ہوئی۔ میں نے اپنی بیوی پر غصہ کیا کہ آج تم نے کیسی چائے بنائی ہے، بعد میں پتا چلا کہ عین اُس جگہ جہاں میرا کپ رکھا تھا، چھت ٹپک رہی تھی۔ کھڑکیوں کا تو کچھ نہ پوچھیں، کھول لیں تو بند نہیں ہوتیں، بند کر لیں تو کھولنا عذاب بن جاتا ہے۔ باتھ روم کے دروازے کی نہ کنڈی ہے، نہ کنڈی والی جگہ، اندر جا کر ہر دومنٹ بعد کھانسنا پڑتا ہے۔ کچن میں گیس اور پانی کی لائنیں آپس میں اتنی ملی ہوئی ہیں کہ کئی دفعہ

چولہا جلائیں تو پانی کی بوچھاڑ منھ پہ آ پڑتی ہے۔ ہر کمرے میں بجلی کی کھلی تاریں اُلجھی پڑی ہیں اور بٹنوں کی یہ حالت ہے کہ پنکھا بھی چلانا ہو تو چھوٹے بیٹے کے کرکٹ کے بلے سے آن کرتے ہیں۔ گھر میں اتنے چوہے ہیں کہ کئی دفعہ شک ہوتا ہے کہ چوہے ہمارے گھر میں نہیں، بلکہ ہم چوہوں کے گھر میں رہ رہے ہیں اور چوہے اتنے موٹے تازے کہ بلی کو بھی بھگا دیتے ہیں۔

تھانے دار صاحب! میں نے صرف چھے ماہ کا کرایہ نہیں دیا، لیکن میرا مالک مکان مجھے روز دھمکیاں دینے آ جاتا ہے، کہتا ہے اس مہینے کے آخر تک اگر سارا کرایہ ادا نہ کیا تو میرا سامان ضبط کر لے گا۔ کتنا ظالم شخص ہے یہ، میں تو کب کا اس کا کرایہ دے چکا ہوتا، لیکن مجبوری تھی کہ ڈی وی ڈی پلیئر اور ٹچ والا موبائل لینا ضروری ہو گیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں اتنی ضروری چیزیں خریدنی ہوں تو کرایہ تو روکنا ہی پڑتا ہے نا؟"

تھانے دار صاحب! مہینا ختم ہونے میں چند دن باقی رہ گئے ہیں اور مجھے خطرہ ہے کہ میرا مالک مکان کوئی نہ کوئی بیہودگی ضرور کرے گا، آپ سے التماس ہے کہ میری درخواست کے جواب میں میرے مالک مکان پر دھمکیاں دینے کا مقدمہ درج کریں اور دو دفعہ ۳۰۲، بلکہ ۳۰۰۲ لگائیں اور تھانے لا کر اسے موت کے گھاٹ اُتار دیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے مر جانے سے نہ صرف کرایے داری ختم ہو جائیں گے، بلکہ آپ کو بھی ترقی نصیب ہوگی۔ اگر آپ کہیں گے تو میں بھری عدالت میں یہ بیان دینے کے لیے تیار ہوں کہ میرا مالک مکان ہمارے گھر ڈکیتی کرنے آیا تھا، لیکن تھانے دار صاحب موقع پر پہنچ گئے، فائرنگ کا تبادلہ ہوا جس میں یہ مارا گیا۔ والسلام...... ملک انجم ملنگی شیخ!" ☆

ایک مکمل ناولٹ

بیٹے کی قیمت

اشتیاق احمد

وجاہت نسیم گردیزی موبائل کی گھنٹی سن کر اچھل پڑے۔

انھوں نے فوری طور پر بلند آواز میں کہا: ''خاموش، کوئی منھ سے آواز نہ نکالے۔ یہ فون میرے بیٹے کے سلسلے میں آیا ہے۔ دیکھو، مجھے ان کی بات سن لینے دو، خدا کے لیے۔'' وہ گڑگڑانے لگے۔

''بھائی جان! خود کو سنبھالیے، ہم بالکل خاموش ہیں۔ ہم میں سے تو کوئی بھی نہیں بول رہا، اللہ کرے یہ فون اغوا کرنے والوں کی طرف ہی سے ہو۔''

''آمین! یہ کیا صرف میں نے آمین کہا تم سب کو سانپ سونگھ گیا کیا؟ سب کہو، آمین۔''

''آمین!'' ان سب نے ایک آواز سے کہا۔

ان کے بیٹے توقیر وجاہت کو اغوا ہوئے آج نو دن ہو چکے تھے۔ نو دن پہلے توقیر گھر سے کھیلنے کے لیے نکلا تھا۔ ان کی کوٹھی کے سامنے ہی ایک بہت بڑا پارک تھا۔ اس میں آس پاس کی ساری آبادی کے بچے کھیلنے کے لیے آجاتے تھے۔ کرکٹ اور فٹ بال کے میچ کھیلے جاتے تھے اور بڑے بھی ان کی دل چسپیوں میں حصہ لینے کے لیے پارک کا رُخ کرتے تھے، یہ ان کا معمول تھا اور اتوار کے دن تو گویا پوری آبادی ہی وہاں آجاتی تھی۔

وہ پارک تھا بھی بہت خوب صورت۔ صوبائی حکومت نے وجاہت نسیم کی سفارش پر ہی یہ پارک بنوایا تھا۔ وجاہت بھی تو ہمیشہ حکومت کے کام آتے رہتے تھے۔ ترقیاتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ان کا شوق تھا۔ حکومتی نمایندوں سے ان کی بہت علیک سلیک تھی۔ شہر میں ان کی کپڑے کی ایک مل تھی اور اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی ان کے ہاں صرف ایک ہی بیٹا تھا، کوئی اور بیٹا یا بیٹی نہیں تھی۔ چودہ سالہ توقیر بہت ہی بھولا بھالا

اور خوب صورت تھا۔ وہ دبلا پتلا اور لمبے قد کا تھا، خوب بھاگ دوڑ لیتا تھا اور اپنے ساتھیوں میں سب سے آگے نکل جاتا تھا۔ اس دفعہ بھی یہی ہوا، وہ دوڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بہت آگے نکل گیا اور پھر وہ پارک سے ایسے غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اغوا کرنے والوں نے وہاں پوری منصوبہ بندی کی ہوئی تھی، وہ مسلسل کئی دنوں سے توقیر کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس کے کھیل کود اور بھاگ دوڑ کا جائزہ لے رہے تھے، اس لیے وہ اس قدر صفائی سے اسے لے اُڑے کہ کسی کو کچھ پتا نہ چل سکا۔

اس کے گم ہونے کی خبر بہت خوف ناک تھی۔ وہ کسی غریب آدمی کا بیٹا نہیں تھا کہ پولیس ٹس سے مَس بھی نہ ہوتی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہتی۔ وجاہت نسیم نے تو پورے شہر کی پولیس کو ہلا کر رکھ دیا۔ جتنے وزیروں سے بھی ان کی دوستی تھی یا ملکی اور سیاسی سطح کے تعلقات تھے، ان سب کو انھوں نے اپنے گھر بلا لیا۔ وہ ان پر خوب گرجے برسے، ان سب کو کھری کھری سنائیں۔ ادھر وہ بے چارے بھی کیا کرتے۔ وہ پولیس پر گرجے برسے غرض اس وقت شہر میں بھونچال آیا ہوا تھا، پولیس کی دوڑیں لگ رہی تھیں۔ ان کی بار بار پیشیاں ہو رہی تھیں، بار بار ان سے پوچھا جا رہا تھا۔ وجاہت صاحب کا بیٹا آخر اب تک کیوں نہیں ملا۔ یاد رکھو، تم سب کی ترقیاں روک دی جائیں گے۔ توقیر نہ ملا تو سب کی جواب طلبیاں ہوں گی۔ سب کو اُٹھا اُٹھا کر کہیں کا کہیں لگا دیا جائے گا۔

اِدھر کوٹھی میں سب سے بُرا حال بیگم وجاہت کا تھا۔ انھیں غشی کے دورے پر دورے پڑ رہے تھے۔ رونا، چیخنا اور یہ پکارنا، ہائے میرا توقیر! ہائے میرا توقیر! ان کا معمول بن چکا تھا۔ ان پریشان کن حالات میں ایک دن گزرا، دوسرا دن گزرا پھر تین دن گزر گئے اس گھرانے کی پریشانی آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ وجاہت نسیم کے بھائی کرامت نسیم اور ان کی بڑی بہن ساجدہ نسیم بھی کم پریشان نہیں تھے۔ انھیں بھی توقیر سے

کم محبت نہیں تھی۔ وہ تو سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اس کے بغیر تو ان کے دن رات گزرتے ہی نہیں تھے، لیکن اب تین دن گزر گئے تھے اور اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔

سیٹھ وجاہت اس وقت تک اخبارات میں اور ٹی وی چینلوں پر بڑے بڑے اور بھاری انعامات کے اشتہارات دے چکے تھے، لیکن تین دن گزرنے پر بھی وجاہت کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

اب ہر گزرنے والا لمحہ ان پر قیامت بن کر گزر رہا تھا۔ وہ تو سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ تین دن گزرنے پر بھی پولیس ان کے بیٹے کا سراغ نہیں لگا سکے گی۔ ان کا تو خیال تھا اتنے بڑے بڑے وزرا اور امراء سے ان کا تعلق ہے، لہٰذا بات کرتے ہی وہ چٹکی بجاتے ہی ان کے بیٹے کا سراغ لگوا لیں گے، لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ ان کا یہ خیال ریت کی دیوار ثابت ہو رہا تھا، اسی لیے ہر گزرنے والا لمحہ ان کی مایوسی میں اضافہ کر رہا تھا، ان کے رنج میں اضافہ کر رہا تھا۔ انھیں اور ان کی بیگم کو بدن سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی اور وہ سوچنے لگے تھے۔ اگر ان کا بیٹا نہ ملا تو وہ جی کیسے سکیں گے۔ وہ رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں جا سوئیں گے۔

نویں دن پولیس انسپکٹر وقار بیگ ان سے ملنے کے لیے آئے۔ انھوں نے بہت ڈھیلے ڈھالے انداز میں ان سے ہاتھ ملایا اور بولے: ''میں جانتا ہوں آپ کے پاس میرے لیے کوئی خبر اچھی نہیں ہے۔ آپ کے پاس خبر ہوتی تو آپ کا چہرہ ہی بتا دیتا، پھر بھی آپ کہیے، کیا کہنے کے لیے آئے ہیں؟''

''آپ سے ایک درخواست ہے۔''

''درخواست اور مجھ غریب سے؟ میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے؟''

''سر! آپ خود کو غریب تو نہ کہیں۔'' انسپکٹر وقار بیگ گھبرا کر بولے۔

''انسپکٹر صاحب! مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا اور بیٹا نہ ملا تو یہ غریب بھی باقی

نہیں رہے گا۔"

"آپ تسلی رکھیں، ہم......"

"نو دن ہو گئے ہیں تسلی رکھتے ہوئے۔" وہ تلملا اُٹھے۔

"سیٹھ صاحب! خدا کے لیے میری بات سکون سے سن لیں۔" انسپکٹر وقار بیگ نے کہا۔

"میں سکون لاؤں کہاں سے، وہ تو اس گھر سے رخصت ہو گیا ہے۔"

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں، آپ میری بات سکون سے سن لیں، ہم آپ کے بیٹے کو آپ کی مدد کے بغیر تلاش نہیں کر سکتے، کیوں کہ ہو سکتا ہے یہ کیس دشمنی کا ہو، اس صورت میں اغوا کرنے والا آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کرے گا اور اگر کیس دولت حاصل کرنے کا ہے تو پھر وہ ضرور رابطہ کرے گا، لیکن وہ کب رابطہ کرتا ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ بتا دیں کہ آپ سے کسے دشمنی ہے۔" انسپکٹر وقار بیگ پُرسکون آواز میں کہتے چلے گئے، اس دوران ان کی نظریں وجاہت نسیم کے چہرے پر جمی رہی تھیں۔

"دشمنی!" انھوں نے چونک کر کہا۔

"جی ہاں! یہ آپ کے کسی دشمن کا کام بھی ہو سکتا ہے۔"

"اب آپ نے درست بات کہی۔ آپ ضرور اس رخ سے کام کریں، لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھ سے دشمنی تو نہ جانے کتنے لوگوں کو ہے۔ میں ایک سیاسی جماعت کا رہنما ہوں، لہٰذا بہت سی سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر میرے دشمن ہو سکتے ہیں۔ بظاہر وہ مجھ سے بہت پیار محبت سے ملتے ہیں، لیکن اندر ہی اندر میری جڑیں بھی کاٹ سکتے ہیں۔"

"ہوں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کے خیال میں آپ سے جن لوگوں کو دشمنی ہو سکتی ہے۔ آپ ہمیں ان کے نام لکھ دیں۔"

"اچھی بات ہے، میں یہ کام کیے دیتا ہوں۔"

انھوں نے چھے نام اور ان کے پتے وغیرہ ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیے۔ انسپکٹر وقار بیگ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے، پھر جونہی وہ گھر کے اندر آئے فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر انجانا نمبر نظر آیا۔ بس اسی وقت انھوں نے گھر کے افراد کو خاموش رہنے کا حکم دے دیا اور پھر انھوں نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ موبائل کا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی ایک کھردری سی آواز ان کے کان میں آئی: ''سنایئے گردیزی صاحب! فو دن کیسے گزرے بیٹے کے بغیر؟''

''خ ...... خ ...... خدا کے لیے ...... تم جو کہو میں کرنے کے لیے تیار ہوں، بس میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔''

''آرام سے، آرام سے۔ گھبرائیں نہیں گردیزی صاحب! اطمینان اور سکون سے میری بات سن لیں۔ کسی بھی ذریعے سے پولیس کو خبردار کرنے کی کوشش نہ کریں۔ نہ یہ موبائل نمبر پولیس کو دیں۔ ہماری کسی بات کی بال برابر بھی خلاف ورزی ہوئی تو آپ اپنے بیٹے کو زندہ سلامت نہیں پائیں گے۔ اس صورت میں آپ کو کیا ملے گا، گوشت اور ہڈیوں کا قیمہ۔''

''ن ...... نہیں ...... نہیں۔'' وجاہت تسنیم چلائے۔

''آپ نے آواز بہت بلند کر لی ہے، شاید باہر بیٹھی پولیس کو متوجہ کرنے کے لیے، لیکن گردیزی صاحب! صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ اس طرح نقصان صرف آپ کے بیٹے کو ہوگا، دیکھیے نا ہم لوگ تو خطرات کی آگ بھڑکا ہی چکے ہیں۔ اس آگ میں کون کون جلتا ہے، کون نہیں، نقصان میں آپ کا بیٹا رہے گا، کیوں کہ جب ہم دیکھیں گے کہ معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ پولیس نے ہمیں گھیر لیا ہے تو انتقام لینے کے لیے کم از کم ...... کم از کم ...... آپ کے بیٹے کو تو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا پھر خاموشی چھا گئی۔

''مم...... میں پولیس کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دوں گا تم بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟''

''ہاہاہا۔'' نامعلوم شخص نے قہقہہ لگایا، پھر کہنے لگا: ''گردیزی صاحب! اتنی جلدی نہ کریں، آپ نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ آپ کا بیٹا میرے پاس ہے یا نہیں۔ یہ لیں پہلے اس سے بات کرلیں، اپنا کلیجہ اس کی آواز سے ٹھنڈا کرلیں۔''

پھر ان کے بیٹے توقیر کی آواز سنائی دی۔

''ابو!''

''میرا بیٹا! میرا بیٹا۔''

اس کے ساتھ ہی ان کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا گیا۔ ایسا بیگم گردیزی نے کیا تھا: ''میرا بچہ! میں...... میں تمھاری ماں ہوں...... بولو بیٹا۔''

''امی! امی۔'' توقیر کی آواز آئی، پھر وہ سسکنے لگا۔ اب وجاہت گردیزی نے موبائل بیگم کے ہاتھ سے لے لیا، ادھر وہ نامعلوم شخص ان کے بیٹے سے موبائل لے چکا تھا۔

''ہاں گردیزی صاحب! آپ نے اپنے بیٹے کی آواز پہچان لی؟''

''ہاں پہچان لی، لیکن تم دیر کیوں لگا رہے ہو؟ تم بات کرو نا، بتاؤ چاہتے کیا ہو...... کیوں ماں باپ کا امتحان لے رہے ہو؟''

''کیا کہا گردیزی صاحب! امتحان...... واہ بہت خوب۔ کیا لفظ بول دیا آپ نے۔ ہے تو یہ امتحان ہی۔''

''کیا مطلب، کیا کہنا چاہتے ہو؟ امتحان ہے، کس کا؟''

''آپ کا، آپ کی بیگم کا، آپ کے بھائی کا، آپ سب کا امتحان ہے اور نو دن گزر چکے ہیں۔ پولیس تو اس امتحان میں پہلے ہی فیل ہو چکی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کون پاس ہوتا ہے اور کون فیل۔''

''تم ...... تم پہیلیاں نہ بجھواؤ، صاف بات کرو۔'' وجاہت تقریباً چلا اُٹھے۔

''نہ ...... نہ سیٹھ صاحب! نہ ...... اتنی تیز آواز میں بات نہ کرو، اتنی بلند آواز میں بھی نہیں۔ آپ بھول رہے ہیں، آپ کا بیٹا اس وقت بھی میرے جوانوں کے بازوؤں میں مچل رہا ہے۔ شیرو! ذرا اس کے بازو میں ایک سوئی چبھونا، تاکہ گردیزی صاحب کے کانوں تک ان کے بیٹے کی ایک چیخ تو پہنچ جائے۔''

''نن ...... نہیں ...... ایسا نہ کرو، تمھیں کیا ضرورت ہے، ایسا کرنے کی، جب کہ میں تمھاری بات سن رہا ہوں اور تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم چاہتے کیا ہو؟''

''اچھی بات ہے، شیرو! رہنے دو۔ سوئی نہ چبھوؤ۔ جب گردیزی صاحب ہماری بات نہیں مانیں گے تو سوئی تو بہت معمولی چیز ہے، ہم خنجر بھی آزمائیں گے۔''

''نن ...... نہیں۔'' وجاہت گردیزی گڑگڑانے لگے۔

''اچھا تو سنو گردیزی! ہم بھی ایسا چاہتے ہیں جو اس قسم کا کام کرنے والے چاہا کرتے ہیں۔ کیا سمجھے؟'' یہ کہتے ہوئے بات کرنے والے نے قہقہہ لگایا۔

''بس! اتنی سی بات ...... تم دولت چاہتے ہو، بولو۔ کتنی دولت چاہتے ہو؟''

''صرف دولت ہی نہیں اور بھی کچھ۔''

''اور بھی کچھ، کیا مطلب؟''

''گردیزی صاحب! بھلا آپ کے بیٹے کی آپ کی نظروں میں کیا قیمت ہو گی؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے بیٹے کی قیمت ......'' انھوں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں! آپ کے بیٹے کی قیمت کیا ہوگی بھلا؟''

''یہ تم کیسی بات کر رہے ہو؟ ماں باپ کے نزدیک اولاد کی کوئی قیمت ہوتی

نہیں سکتی۔ دنیا کی دولت ایک طرف، اولاد ایک طرف، تم اپنا مطالبہ بتاؤ؟''

''میرا مطالبہ تو آپ نے خود بتا دیا ہے گردیزی صاحب!''

''کیا مطلب؟'' وجاہت نسیم نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ نے خود کہا ہے دنیا کی دولت ایک طرف، اولاد ایک طرف، گویا ساری دنیا کی دولت بھی اولاد کے مقابلے میں کم ہے، یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟''

''ہاں، یہی بات ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں اپنا مطالبہ بتاؤ؟'' وجاہت نسیم کو غصہ آ گیا۔ ان کی آواز بلند ہو گئی۔

''آپ کی آواز پھر بلند ہو گئی، لہجے میں غصہ آ گیا شیرو ایک لمبی والی سوئی تو اس کے بازو میں......''

''نہیں ...... نہیں۔ میں تمھاری بات سن رہا ہوں۔ اب آواز بھی اونچی نہیں کروں گا۔ غصہ نہیں کروں گا، تم اپنی بات پوری کرو۔''

''بات تو کب کی پوری ہو چکی گردیزی صاحب! آپ بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے یا سمجھ رہے ہیں تو انجان بن رہے ہیں۔''

''کیا مطلب، کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' وجاہت نسیم نے ناگواری سے کہا۔

''اچھا تو پھر گردیزی صاحب! اب بات ہو جائے صاف اور سیدھے الفاظ میں، جس کے بعد آپ یہ نہیں کہہ سکیں گے کیا مطلب۔ آپ نے خود کہا ہے آپ کے بیٹے کی قیمت تو پوری دنیا کی دولت بھی نہیں ہو سکتی، یہی کہا ہے نا آپ نے؟''

''ہاں! یہی کہا ہے۔'' انھوں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اب وہ اغوا کرنے والے کا مطلب کچھ کچھ سمجھ رہے تھے اور خود کو اس کے مطالبے کے لیے تیار کر رہے تھے۔

''تو پھر یہی ہے ہم لوگوں کا مطالبہ۔''

''کیا..... کیا مطلب..... کیا ہے مطلب؟'' انھوں نے پوچھا۔

''آپ نے پھر یہی کہا، کیا مطلب..... حال آں کہ مطلب بالکل واضح ہے۔ اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے، اسے حاصل کرنے کے لیے، آپ کو اپنی ساری دولت دینا ہوگی، اپنی مل ہی نہیں، بلکہ اپنی کوٹھی بھی دینا ہوگی۔''

''کیا.....'' وہ چیخ اُٹھے۔ ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''جی ہاں گردیزی صاحب! یہی ہے آپ کے بیٹے کی قیمت! اور یہ میں نے نہیں خود آپ نے کہا ہے اور اگر آپ کہتے ہیں یہ ناممکن ہے تو پھر ہمارے لیے آپ کے بیٹے کا گلا کاٹ دینا کچھ بھی مشکل نہیں، فیصلہ تو اب آپ کو کرنا ہے، بیٹے کی لاش وصول کرنا پسند کریں گے یا زندہ سلامت بیٹا؟ زندہ سلامت بیٹا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنا سب کچھ دینا ہوگا، سب کچھ۔ آپ صرف وہ اپنے پاس رکھیں گے جو میں کہوں گا اور یہ میں چند دن بعد بتاؤں گا۔ پہلے آپ غور کرلیں، فیصلہ کرلیں، کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔ گردیزی صاحب! میں آپ کو پھر فون کروں گا۔''

''نہیں..... نہیں..... فون بند نہ کریں۔''

انھوں نے فون بند ہونے کی آواز سنی۔ ان کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر قالین پر گر پڑا۔ وہ بت بنے بیٹھے رہ گئے۔ ان کی پھٹی پھٹی آنکھیں اپنی بیگم کے چہرے پر گڑی رہ گئیں۔ ان کے چھوٹے بھائی کرامت نسیم اور چھوٹی بہن فخر النسا بھی سکتے کے عالم میں بیٹھے رہ گئے، کیوں کہ یہ گفتگو ان سب نے بھی سنی تھی۔

''تت..... تم نے سنا بیگم! وہ میرے بیٹے کی کیا قیمت مانگ رہے ہیں؟''

''ہاں، میں نے سنا۔ ہم سب نے سنا۔ تو پھر.....؟ کیا آپ انکار کر دیں گے۔ دولت کی خاطر بیٹے کی لاش وصول کریں گے؟ کیا آپ اپنے الفاظ کے خلاف کریں

گے؟ میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی، اس لیے کہ میں ماں ہوں...... ماں...... ماں اپنا سب کچھ دے سکتی ہے، اپنی ہر چیز، یہاں تک کہ اپنی جان بھی دے سکتی ہے۔ آپ باپ ہیں۔ آپ کو بھی یہی کچھ کرنا ہوگا۔''

''ہاں بیگم! ہاں، آپ گھبرائیں نہیں مشکل یہ ہے کہ اس نے فون بند کر دیا ہے ورنہ میں تو اس سے اسی وقت بات کر لیتا اور تم یہ خیال نہ کرو کہ توقیر صرف تمھارا بیٹا ہے میرا نہیں ہے، ہمارا سب کچھ ہمارا بیٹا ہے۔ میں اس کی خاطر اپنی ساری دولت تو کیا، خود کو بھی دے سکتا ہوں، لیکن اب ہم مجبور ہیں اس کا فون آنے تک ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''

وجاہت نسیم کے چھوٹے بھائی نے ہنکارا بھرا اور جب وہ اس کی طرف مڑے تو اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا: ''بھائی جان! مشورے کے بغیر اغوا کرنے والوں کی کوئی بات تسلیم نہ کریں۔''

''کیا مطلب؟'' وجاہت نسیم چونکے۔

''میرا مطلب ہے، ہمارے پاس ابھی وقت ہے، اغوا کرنے والے کا فون اب چند دن بعد ہی آئے گا، لہٰذا آپ کم از کم انسپکٹر وقار بیگ سے مشورہ کر لیں، وہ ہمارے دوست ہیں، ایک بہت اچھے پولیس آفیسر ہیں۔ ضرور مفید مشورہ دیں گے۔''

''نہیں...... ہرگز نہیں...... آپ...... آپ ایسا نہیں کریں۔ سنا آپ نے، آپ ہرگز ہرگز پولیس سے رابطہ نہیں کریں۔'' بیگم وجاہت بولیں۔

''لیکن بھابھی! ہم انھیں صرف مشورے کے لیے بلائیں گے۔'' کرامت نسیم نے منھ بنایا۔

''اگر اغوا کرنے والے کو پتا چل گیا کہ ہم نے پولیس انسپکٹر کو بلایا ہے تو وہ نہ جانے کیا کر گزرے، لہٰذا میں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔'' بیگم وجاہت نے

پُرزور انداز میں کہا۔

"بھابھی صاحبہ! آپ ذرا ٹھنڈے دل سے بات سن لیجیے، پھر جو آپ کا جی چاہے کیجیے گا۔"

"میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" وہ ناگواری سے بولیں۔

"راشدہ! بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں، ہم اپنے گھر میں ہیں، اغوا کرنے والا ہماری باتیں نہیں سن رہا۔"

راشدہ بیگم نے ایک نظر اپنے شوہر پر ڈالی، پھر بولیں: "اچھی بات ہے، کہیے۔" لہجہ اب بھی سخت تھا۔

"میں انسپکٹر کو خفیہ طور پر پیغام دوں گا۔ وہ سادہ لباس میں ایک عام آدمی کی حیثیت سے آئیں گے اور پھر مل کر ان سے مشورہ کرلیں گے۔ آخر وہ پولیس والے ہیں، اس قسم کے معاملات سے گزرتے رہتے ہیں۔ مشورے میں برکت ہے۔ یہ میں نہیں۔ ہمارا دین کہتا ہے۔"

"میرا خیال ہے راشدہ! ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، وہ سادہ لباس میں یہاں آجائیں گے۔ اس طرح کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلے گا کہ ہمارے گھر میں کوئی پولیس افسر آئے ہیں۔ پھر ہم ان سے صرف مشورہ کریں گے۔"

"لیکن میں یہ چاہتی ہوں، ہم کچھ نہ کریں۔ چپ چاپ اس کا مطالبہ پورا کردیں اور توقیر کو زندہ سلامت حاصل کرلیں۔ اس کے بعد پولیس حرکت میں آئے۔"

"بالکل ٹھیک ہے، لیکن اس کے لیے بھی ہمیں انسپکٹر وقار بیگ کو ساتھ ملانا ہوگا۔ انھیں حالات سے باخبر رکھنا ہوگا۔ وہ سامنے نہیں آئیں گے، لیکن پس پردہ رہ کر اپنا کام کریں گے۔ بھابھی! آپ اطمینان رکھیں، پہلے ہم اس درندے سے توقیر کو حاصل

کریں گے، پھر کوئی قدم اُٹھائیں گے، لیکن کوشش تو پہلے ہی شروع کی جائے گی۔ اگر ہم نے پہلے سے کوئی تیاری نہ کی تو پھر ہم اس کا سراغ شاید ہی لگا سکیں اور یہ آپ سوچ ہی سکتی ہیں، اس کا مطالبہ کوئی چھوٹا سا مطالبہ نہیں ہے۔ وہ ہمارا سب کچھ مانگ رہا ہے۔ اس کا مطالبہ پورا کرنے کے بعد اگر ہم نے اس کا سراغ کھو دیا تو پھر ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ تنگ دستی کی پہاڑ جیسی زندگی ہمارے سامنے ہوگی۔ یہ سب باتیں سوچ کر ہی فیصلہ کریں۔''

بیگم وجاہت چند سیکنڈ تک کرامت نسیم کی طرف دیکھتی رہیں، پھر انھوں نے کہا:

''میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ اگر اسے ذرا بھی سن گن مل گئی کہ ہم اس کے خلاف کوئی کام کر رہے ہیں تو وہ غصے میں آ کر کچھ بھی کر سکتا ہے، لہٰذا کرامت میرے بھائی! تمھاری ساری باتیں اپنی جگہ درست ہوں گی، لیکن ایک ماں کے دل کو نہیں لگیں۔ میرا دل ان سب باتوں کو درست نہیں سمجھتا۔ میں صرف اور صرف اپنا بیٹا صحیح سلامت چاہتی ہوں، میری طرف سے یہ ساری دولت اسے دے دی جائے۔ مجھے نہیں چاہیے دولت، نہ یہ کوٹھی، نہ یہ کاریں اور نہ ان کی مل۔ مجھے تو بس اپنا تو قیر چاہیے، جس نے اس قدر صفائی سے یہ جرم کیا ہے۔ آپ اسے بے خبر نہ سمجھیں، ضرور اس کا کوئی ماتحت ہماری حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے ہوگا اور جونہی اسے معلوم ہوگا کہ ہم پولیس سے رابطہ کر رہے ہیں۔ وہ......وہ...... میرے بیٹے کو......''

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ آخر وجاہت نسیم نے پریشانی کے عالم میں کہا: ''بیگم! تم فکر نہ کرو، ہم وہی کریں گے جو تم کہو گی۔ یہ تو ہم امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔''

''مجھے نہیں لینا حالات کا جائزہ۔'' وہ جھلا اُٹھیں۔

''اچھا ٹھیک ہے، ہم نہیں لیں گے جائزہ، نہیں لیں گے۔ پولیس کی مدد بھی نہیں لیں

گے، لیکن بیگم! تم خود غور کرو ہم اس کے فون کا انتظار کریں گے اور بس۔'' انھوں نے پوچھا۔
ٹھیک سات دن کے جان لیوا انتظار کے بعد ان کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

......☆......☆......

''ہاں وجاہت نسیم گردیزی صاحب! ایک ہفتہ گزر گیا۔ اب تک تو آپ نے خوب سوچ بچار کر لی ہوگی؟ کیا فیصلہ کیا آپ نے؟''

اس وقت تک ان کی بیگم اور ان کے بھائی اور بہن ان کے پاس آ چکے تھے۔ موبائل اسپیکر پہلے ہی آن تھا، اس لیے ہونے والی بات سب سن رہے تھے۔

''ہاں ہم سوچ چکے ہیں ہم نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا۔ بتایئے آپ کیا کہتے ہیں؟''

''ظاہر میں تو ایسا ہی لگتا ہے آپ نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا، نہ پولیس آپ کے گھر آئی، لیکن ہو سکتا ہے چھپ چھپا کر ان سے بات چیت چل رہی ہو، لیکن سیٹھ صاحب! آپ اتنا سن لیں اگر اس لین دین کے بعد اور آپ کے بیٹے کی رہائی کے بعد پولیس حرکت میں آئی تو ہمارے لیے تو تیر کو پھر سے اغوا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا اور اس وقت ہمیں دینے کے لیے آپ کے پاس کچھ نہیں ہوگا، لہٰذا جواب میں آپ کو بیٹے کی لاش کا تحفہ ہی ملے گا۔ یہ اب آپ سوچ لیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ میرا ایک گروہ ہے۔ اگر میں پکڑا گیا تو بھی میرے کارندے اپنا کام کرتے رہیں گے۔ میرا نائب میری جگہ لے لے گا۔ وہ مجھ سے زیادہ سخت مزاج ہے۔ میں نے تو تم لوگوں کے کہنے پر سوئی نہیں چبھوئی تھی۔ اب جو قدم بھی اُٹھانا، سوچ سمجھ کر اُٹھانا۔ میں جانتا ہوں، انسپکٹر وقار بیگ اس گھر کے دوست ہیں۔ آپ لوگوں نے انھیں مدد کے لیے پکارنے کا ارادہ ضرور کیا ہوگا، لیکن بیگم صاحب آڑے آ گئی ہوں گی۔ آپ کی بیگم اس معاملے میں زیادہ ذہین ہیں۔ مامتا کچھ بھی تو سوچنے نہیں دیتی، دیکھیے سیٹھ صاحب! ہم لوگ تو پہلے ہی ذہنی طور پر جیل جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں

کا ایک اصول ہے اور وہ ہے، آر یا پار۔ اصل مسئلہ تو آپ کے بیٹے کا ہے۔ آپ کا کوئی بھی غلط قدم آپ کے بیٹے کی زندگی پر سوالیہ نشان لگا دے گا۔ آج کل پولیس موبائل فونوں کے ذریعے جلد سراغ لگا لیتی ہے اور بھی بہت جدید طریقے اس نے سیکھ لیے ہیں، اس کے باوجود کچھ جرائم پیشہ ایسے ہیں جو پکڑے نہیں جاتے۔ ظاہر ہے انھیں اور زیادہ جدید طریقے آتے ہوں گے۔ اپنا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ آپ ہمارے اغوا کرنے کے طریقے کو ہی دیکھ لیں۔ کیا پولیس کچھ اندازہ قائم کر سکی کہ ہم نے یہ کام اتنے آرام سے کیسے کر لیا؟ میں صرف آپ کی اطلاع کے لیے بتا دیتا ہوں ہم لوگ پہلے پوری معلومات حاصل کرتے ہیں، پوری منصوبہ بندی کرتے ہیں، بہت دنوں تک غور کرتے ہیں، تب قدم اُٹھاتے ہیں۔ خیر، بات لمبی ہو گئی، اب یہ آپ کی مرضی ہے۔ آپ نے ضرور یہ پروگرام بنایا ہو گا کہ پہلے بیٹا واپس حاصل کر لیتے ہیں، پھر ہمارے خلاف کارروائی شروع کی جائے گی۔ اس میں سراسر آپ کا نقصان ہو گا۔ اپنی دولت ہمارے نام کر کے، بیٹا حاصل کر کے آپ سکون سے رہیں گے، یعنی اس معاملے کو یہیں ختم کر کے آگے بڑھ جائیں گے تو ظاہر ہے ہمیں بھی تو اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا ہو گا، اور کچھ یہی ہو گا کہ ہم آپ کے بیٹے کو پھر اغوا کر لیں گے، کیوں کہ ہم اس طرح خود کو آسانی سے بچا سکیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ آپ سوچ لیں، میں پھر کسی وقت فون کروں گا۔"

"سنو...... سنو...... فون بند نہ کرو۔" وجاہت تبسم گردیزی نے کہا۔ پھر انھوں نے منھ بنا کر موبائل آف کر دیا، کیونکہ دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔

"دیکھا آپ نے ...... دیکھا آپ نے ...... جو میں کہہ رہی تھی ...... وہی درست تھا۔ ہاں اور جو آپ منصوبہ بنا رہے ہیں، وہ غلط ہے۔ اس میں میرے بیٹے کو خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ذرا غور کریں، اس طرح بعد میں ہمارے لیے پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں۔

ہم سُکھ کا سانس نہیں لے سکیں گے۔ ساری دولت دے کر بھی پریشانیاں اپنے پاس رکھنا کوئی عقل مندی ہے بھلا۔" بیگم وجاہت جھلائے ہوئے انداز میں کہتی چلی گئیں۔

ان کے خاموش ہوتے ہی وہاں موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ ان سب کے دماغ بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ آخر وجاہت نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا: "ہاں کرامت! تم نے اس کی باتیں سن لیں۔ اب کہو، کیا کہتے ہو؟"

"تقدیر میں اگر یہی کچھ ہے کہ ہم اپنے بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے اپنی دولت اسے دے دیں اور پھر کچھ نہ کریں تو پھر یونہی سہی۔" کرامت نے کندھے اُچکا دیے۔

دوسرے دن شام کے وقت اغوا کرنے والے کا فون آ گیا۔ انھوں نے سنا، وہ کہہ رہا تھا: "یہ میرا آخری فون ہے، یعنی اگر آپ نے فیصلہ نہ سنایا تو پھر میں فون کرنے کا سلسلہ بند کر دوں گا۔ پھر آپ لگواتے رہیے گا میرا سراغ اپنے انسپکٹر وقار کے ہاتھوں۔"

"سنو میاں! ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔ آپ کے خلاف کبھی بھی پولیس کارروائی نہیں کروائیں گے۔ اپنے بیٹے کو لے کر ایک طرف ہو جائیں گے۔"

"بس تو پھر سیٹھ صاحب! آپ اپنی مل کو فروخت کر دیں۔ جلد از جلد، اس کا گاہک تلاش کریں۔ اپنی کوٹھی بھی فروخت کر دیں۔ بینک میں جمع رقم بھی ان دونوں کی رقم میں شامل کر لیں۔ میں بینک اکاؤنٹ نمبر آپ کو ایس ایم ایس کر دوں گا۔ آپ وہ رقم اس میں جمع کرا دیں۔ جونہی میرے اکاؤنٹ میں بیلنس آئے گا، آپ کا بیٹا آپ کے گھر پہنچ جائے گا، لیکن کون سے گھر؟"

"کیا...... کیا...... کون سے گھر؟"

"ہاں! کون سے گھر؟ یہ کوٹھی تو آپ فروخت کر دیں گے۔ اب سنیں، آپ دس لاکھ روپے اپنے پاس رکھ لیں۔ اس سے کوئی گھر خرید لیں یا کرائے کا مکان لے لیں۔ میں

اس کا پتا فون پر پوچھ لوں گا۔ بیٹا وہاں آ سکے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کریں گے اور جلد از جلد کریں گے، ویسے تم میری بات پر یقین کرو اور آج ہی میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔ رقم تمھارے اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے گی۔''

''نہیں۔ اتنا اعتبار میں آپ پر نہیں کرسکتا۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

☆☆

دوسرے دن کے اخبارات میں مِل اور کوٹھی برائے فروخت کے اشتہارات شائع ہوئے۔ دونوں چیزوں کو نیلامی کے ذریعے سے فروخت کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے اسی روز صبح سویرے وجاہت نسیم ایک چھوٹا سا مکان لینے میں کام یاب ہو گئے۔ انھوں نے اپنا مختصر سا سامان بھی وہاں منتقل کر دیا۔ سارا سامان تو اس مکان میں آ نہیں سکتا تھا۔

مقررہ وقت پر بہت سے لوگ نیلامی میں شریک ہوئے۔ مِل اور کوٹھی کی بولی لگی اور آخر دونوں چیزیں شہر کے ایک گم نام رئیس نے خرید لیں۔ اسی روز اغوا کرنے والے کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا: ''میں نے اپنا اکاؤنٹ نمبر ایس ایم ایس کر دیا ہے۔''

''اچھی بات ہے۔ صبح سویرے رقم آن لائن ہو جائے گی۔''

''اِدھر بیلنس آئے گا، اُدھر آپ کے بیٹے کو بھیج دیا جائے گا۔ آپ اپنے نئے گھر کا پتا لکھوا دیں۔''

انھوں نے پتا لکھوا دیا۔ دوسرے دن صبح سویرے وجاہت نسیم گردیزی نے رقم آن لائن بھیج دی۔ بنک نے بیلنس ایس ایم ایس کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وجاہت نسیم کے نئے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ان سب نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو قیصر وہاں موجود تھا۔ وہ اس سے لپٹ لپٹ کر رونے لگے تو قیصر حیرت زدہ سا ان سے لپٹ بھی رہا تھا اور رو بھی رہا تھا اور یہ بھی پوچھ رہا تھا: ''ابو! امی! انکل! باجی! یہ موقع تو خوش ہونے کا ہے۔

ہم سب رو کیوں رہے ہیں اور یہ ہم کس کے گھر میں ہیں؟ ہم سب اپنے گھر میں کیوں نہیں ہیں؟''

''آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ، ہم تمھیں بتاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ ہم یہاں کیوں ہیں اور ہم وہاں کیوں نہیں ہیں۔''

وہ اسے خود سے لپٹائے ہوئے اندر لے آئے۔ اب سب ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے تو انھیں توقیر کی حیرت دور کرنی تھی۔ انھوں نے اسے ساری کہانی سنائی تو توقیر دھک سے رہ گیا۔ مارے حیرت کے اس کے منھ سے نکلا: ''آپ...... آپ کا مطلب ہے ابو! آپ نے مجھے ان لوگوں سے چھڑانے کے لیے اپنا سب کچھ دے دیا۔ اپنی مل دے دی، کوٹھی دے دی، گاڑیاں بھی دے دیں؟''

''یہ تو کچھ بھی نہیں بیٹے! ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ دولت ہوتی تو تمھیں چھڑانے کے لیے ہم وہ سب دے دیتے۔ تم...... تم ہمارے لیے زیادہ قیمتی ہو۔ زیادہ اہم ہو۔''

''ابو! امی! چچا جان! پھوپھو!'' اس نے درد بھرے لہجے میں کہا اور ایک بار پھر وہ سب لپٹ گئے۔ ان کے رونے کی آواز بلند ہو گئی، لیکن ان کا یہ رونا جہاں غم کا رونا تھا، وہاں خوشی کا بھی تھا۔ گویا خوشی اور غم گلے مل رہے تھے۔ نہ جانے کتنی دیر وہ روتے رہے۔ ان کے آنسو نکل نکل کر ان کا غم دھوتے رہے۔ رو کر دل و دماغ کچھ ہلکے ہوئے تو سب خود کو تر و تازہ سا محسوس کر رہے تھے، گویا رنج اور غم کے بادل چھٹ گئے ہوں، دل و دماغ پر چھائی پریشانی کہیں دور چلی گئی ہو۔ توقیر کو کچھ دیر بعد خیال آیا، اس نے کہا: ''اور ابو! یہ مکان؟''

''اغوا کرنے والے نے کم از کم اتنی انسانیت کا ثبوت دیا ہے کہ ہمیں دس لاکھ روپے اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی تھی، تاکہ ہم اس سے کوئی چھوٹا موٹا مکان خرید لیں۔''

''تو آپ نے یہ مکان دس لاکھ میں خریدا ہے؟''

''نہیں! یہ کرایے کا ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''کرایے کا۔'' ان سب کے منھ سے نکلا۔

''ہاں! اگر میں دس لاکھ کا مکان خرید لیتا تو کوئی کام کیسے شروع کرتا؟ کھاتے پیتے کہاں سے؟ اب ہم اس رقم سے اپنا کام بہت چھوٹے سے پیمانے پر کریں گے۔ روزی تو کمانی ہوگی یا پھر کسی مل میں ملازمت۔''

''نہیں بھائی جان! اس سے بہتر اپنا کام کر لیا جائے۔ چاہے بالکل چھوٹے پیمانے پر ہو۔''

عین اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، کیوں کہ یہاں ان کا کوئی واقف نہیں تھا۔ ان کے اس گھر کے بارے میں کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر کرامت نسیم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

جونہی انھوں نے دروازہ کھولا، زوردار آواز آئی: ''السلام علیکم!'' یہ آواز تھی انسپکٹر وقار بیگ کی۔

''اوہ آپ! حیرت ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ہم یہاں ......'' کرامت نسیم حیرت زدہ انداز میں کہہ رہے تھے کہ انسپکٹر وقار بیگ نے بات کاٹ دی۔

''آخر میں ایک پولیس انسپکٹر ہوں۔''

''آیئے، اندر آجایئے۔''

وہ انھیں اندر لے آئے۔ ان کی آواز سنتے ہی بیگم وجاہت کا تو رنگ ہی اُڑ گیا۔ ان کے منھ سے مارے خوف کے نکلا: ''نہیں ...... نہیں ...... انسپکٹر صاحب! آپ نے یہاں آکر اچھا نہیں کیا۔ اسے ضرور پتا چل جائے گا اور ...... وہ ...... اور وہ۔'' وہ اس سے

زیادہ کچھ نہ کہہ سکیں اور رونے لگیں۔

''ارے ارے، آپ تو رونے لگیں بھابی صاحب! کچھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ اسے کرنا تھا، کر چکا ہے، اب ہماری باری ہے۔ ہم اس سے ساری دولت واپس لے لیں گے۔''

''ہرگز نہیں۔ آپ کچھ نہیں کریں گے۔ ہمارا اس سے معاہدہ ہو چکا ہے۔'' وہ بولیں: ''آپ کیوں خاموش ہیں، انھیں بتا کیوں نہیں دیتے کہ ہم کچھ نہیں کریں گے۔ ہم اسی حال میں خوش ہیں۔ ہمیں ہمارا بیٹا مل گیا اور بس۔ اللہ کا شکر ہے، کیوں ٹھیک کہا نا میں نے۔'' ان کا انداز بہت جذباتی ہو گیا۔

''ہاں بیگم! آپ نے ٹھیک کہا۔ ہم اغوا کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ ہم اس سے معاہدہ کر چکے ہیں اور اب اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا اتنے بڑے مجرم کو یونہی چھوڑ دیا جائے گا! وہ اس دولت کے بل پر عیش کرتا پھرے گا، دندناتا رہے گا۔ نہیں یہ تو کسی طرح بھی درست نہیں ہوگا۔ اسے اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔ اسے جیل میں ہونا چاہیے۔''

''میں نے کہا نا ہمارا اور اس کا معاہدہ ہے۔ ہم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے۔ اگر اس نے پھر ہمارے بیٹے کو اغوا کر لیا تو ہم کیا کریں گے؟ اب تو اسے دینے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور وہ انتقام لیے بغیر رہے گا نہیں، لہٰذا ہم اتنا کچھ دے کر بھی اپنے بیٹے سے محروم ہو جائیں گے۔'' وہ کہتی چلی گئیں۔

''وقار بیگ! میری بیگم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ اس معاملے کو یہیں ختم سمجھ لیں اور آیئے ہمارے ساتھ چائے پییں، کیوں کہ ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ہمارا بیٹا آ گیا ہے اور ہم یہاں اس گھر میں ہیں؟''

ان کا سوال سن کر انسپکٹر وقار بیگ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ انھوں نے کہا: ''آپ کیا سمجھتے ہیں! آپ نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تو میں نے خود کو اس کیس سے الگ کر لیا ہو گا؟ جی نہیں، میں شروع دن سے اس وقت تک اس معاملے سے پوری طرح باخبر رہا ہوں، لیکن چاہتا میں بھی یہی تھا کہ پہلے تو قیر میاں آ جائیں اور ان کے آنے سے پہلے کچھ نہ کیا جائے، چناں چہ میں نے کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی۔ صرف اتنا کیا کہ دو سادہ لباس والے بہت ہی احتیاط سے آپ کی کوٹھی کی نگرانی پر لگا دیے، تاکہ حالات معلوم ہوتے رہیں۔ جب میں نے اخبارات میں کوٹھی اور مل وغیرہ کی نیلامی کے اشتہارات پڑھے تو میں نے جان لیا کہ سودا طے پا گیا ہے، لہٰذا میں اس گھر کے بارے میں بھلا کیوں بے خبر ہوتا۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ آپ مجھے اس کے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں اس کا سراغ لگا لوں گا، اسے اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے میں کام یاب ہو جاؤں گا، اس طرح آپ کو آپ کی ساری دولت واپس مل جائے گی۔''

''نن...... نہیں۔ اب یہ نہیں ہو گا، ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ آپ میرے دوست ہیں نا۔''

''میں دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پولیس آفیسر بھی تو ہوں۔'' وقار بیگ مسکرائے۔

''چلیے، پہلے تو آپ میرے دوست ہیں نا کالج کے زمانے کے میرے کلاس فیلو ہیں نا۔''

''ہاں تو دوست ہونے کے ناتے آپ میرا ساتھ دیں۔''

''لیکن میں اس معاملے میں اپنی بیگم کے ساتھ ہوں اور کوئی کارروائی کرنے کی اجازت دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔''

''اچھی بات ہے...... آپ لوگوں کی مرضی۔ اب میں اجازت چاہوں گا۔'' وقار بیگ نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"وقار بیگ میرے دوست! آپ ناراض نہ ہوں۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کریں۔"

"ٹھیک ہے، جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔" انھوں نے کندھے اُچکائے، پھر وہ چاے پی کر رخصت ہو گئے۔

"کیوں بیگم! ہو گیا آپ کا اطمینان۔ ہمارے لیے اپنے پیارے بیٹے سے اچھا کچھ نہیں۔"

"بے شک!" ان کے منھ سے نکلا۔

"اور اب ہمارا بیٹا تعلیم حاصل کرے گا۔ ایک بہترین انجینئر بنے گا۔ میرے خواب کی تعبیر ثابت ہوگا۔" انھوں نے جذباتی آواز میں کہا اور ایسا کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"خواب کی تعبیر...... جی...... کیا مطلب؟" توقیر نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ میں آج ہی سے اس خواب پر کام شروع کر رہا ہوں۔" وجاہت نسیم نے کہا۔

"آپ نے ایک خواب دیکھا ہے۔ آپ اس خواب پر کام شروع کر رہے ہیں۔ بھلا خوابوں پر بھی کام شروع کیے جاتے ہیں، کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟ بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟" بیگم وجاہت گھبرا گئیں۔

ان کی بیگم کو خیال آیا کہ ان کے شوہر کا دماغ چل گیا ہے۔

دوسری طرف وجاہت نے مسکرا کر کہا: "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ الحمدللہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میری دماغی حالت بالکل ٹھیک ہے۔ خواب ہر کوئی دیکھ سکتا ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خوابوں کے سہارے زندگی بسر کریں گے۔ ہم زندگی کو زندگی کے سلیقے سے بسر کریں گے۔ ہم کل سے اپنے کام کی ابتدا کر رہے ہیں، کیوں کہ بے کار بیٹھنا شیطان کا کام ہے۔"

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی جان!'' کرامت نسیم نے ان کی تائید کی۔

دوسرے دن تو قیر اپنے اسکول چلا گیا۔ وجاہت اور نسیم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ بیگم وجاہت نے گھر کے کام سنبھال لیے۔ انھیں بھی اب نئے سرے سے اس چھوٹے سے گھر کو سنوارنا تھا۔ اسے رہائش کے قابل بنانا تھا۔ آس پاس کی عورتوں سے تعلقات قائم کرنا تھے، کیوں کہ پڑوسیوں کے ساتھ انسان کا وقت اچھا گزرتا ہے۔ جو سب سے الگ تھلگ رہتے ہیں، ان کی زندگی مشکل اور خشک ہوتی ہے اور وہ ایسی زندگی کے قائل نہیں تھے۔ انھیں اب خود کو نئے حالات میں ڈھالنا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ انسان جتنی چادر دیکھے، اتنے پاؤں پھیلائے۔

☆☆

''کیا رہا سر؟'' انسپکٹر وقار بیگ تھکے تھکے سے اپنے دفتر میں داخل ہوئے تو ان کے ماتحت احسن خان نے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

''مزہ نہیں آیا۔'' انھوں نے منھ بنایا۔

''جی...... کیا فرمایا آپ نے...... مزہ نہیں آیا، میں سمجھا نہیں سر؟''

''ہاں احسن خان! مزہ نہیں آیا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اب دوست کا بیٹا گھر آ گیا ہے تو ہم کھل کر اغوا کرنے والے کے خلاف کام شروع کریں گے اور اس کا سراغ لگا کر رہیں گے، لیکن......'' وہ کہتے کہتے رک گئے۔

''لیکن کیا سر؟'' احسن خان نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''میرے دوست وجاہت نسیم مجرم کے خلاف کیس درج کروانے پر آمادہ نہیں۔ دراصل اغوا کرنے والے نے انھیں ڈرا ہی اتنا دیا ہے اور ان کا ڈر بھی بجا۔ ہم بھی تو اس کا سراغ نہیں لگا سکے۔ ان حالات میں وہ ڈرتے ہیں۔ کیس شروع ہونے کے بعد وہ پھر

توقیر کو اغوا نہ کرے اور اس بار تو اس نے اسے رہا کر دیا ہے۔ دوسری بار تو جان سے مارے بغیر نہیں رہے گا۔ بس اسی ڈر کی وجہ سے وہ کوئی کارروائی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ خاص طور پر وجاہت صاحب کی جو بیگم ہیں، وہ تو بہت زیادہ خوف کھاتی ہیں اس بات سے۔"

"پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"ظاہر ہے جب تک وہ نہ چاہیں گے، ہم کیا کر سکتے ہیں، ہاں البتہ!" وہ یہ کہتے کہتے رک گئے شاید یہ ان کی عادت تھی۔

"البتہ کیا سر؟"

"ان میں ایک ضرور ایسا ہے جو ہمارے ذہن کا ہے، یعنی وہ مجرم کے خلاف کارروائی کا شدت سے خواہش مند ہے۔ میں نے یہ بات ان کی آنکھوں میں جھانک کر محسوس کی ہے۔"

"وہ کون سر؟"

"وجاہت نسیم کے چھوٹے بھائی کرامت نسیم۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ چاہتے ہیں کہ مجرم کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے۔"

"ہاں ان کی یہ شدید خواہش ہے۔"

"تو پھر آپ انھیں فون کریں۔ وہ ہم سے ملاقات کر لیں۔ بات کرنے وہ پولیس اسٹیشن نہ آئیں۔ ہم کسی ریسٹورنٹ میں ان سے ملاقات کر لیں۔ مجرم کے بارے میں جو کچھ انھیں معلوم ہے، وہ تو ہمیں بتائیں۔ وہ کس نمبر سے فون کرتا رہا ہے، ویسے تو میرا خیال ہے اب اس نے وہ سم بند کر دی ہوگی، لیکن پھر بھی ہم سم کے ذریعے اس کا نام پتا وغیرہ تو معلوم کر ہی سکیں گے۔"

"بالکل ٹھیک، لیکن انھیں فون کرنا مناسب نہیں۔ ایس ایم ایس کر دیتا ہوں،

کہیں بیگم صاحب کے کان کھڑے نہ ہو جائیں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا سر!"

انسپکٹر وقار بیگ نے کرامت نسیم کو پیغام دیا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ عالم روڈ کے پاکیزہ ریسٹورنٹ آجائیں، ٹھیک آدھے گھنٹے بعد۔

ان کا فوراً ہی جواب ملا: "جی اچھا! میں آرہا ہوں۔"

آدھ گھنٹے بعد تینوں ریسٹورنٹ کی ایک میز پر بیٹھے تھے۔

"جی فرمایئے، انسپکٹر صاحب! ویسے میں سمجھ تو گیا ہوں۔"

"آپ ٹھیک سمجھے، آپ کی بھابھی بلاوجہ ڈر رہی ہیں۔ اغوا کرنے والے کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ کیا خبر یہ ساری دولت اُڑا کر وہ کسی اور کے ساتھ یہی کھیل کھیلے۔ پھر ایسے لوگوں کے پیٹ بھرتے کب ہیں، اس لیے میں نے آپ کو بلایا ہے۔ اس گھر میں صرف آپ ایسے ہیں جو مجرم کو گرفتار دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔"

"آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا میں حاضر ہوں، بس اتنا خیال رکھیے گا۔ بھابی کو سن گن نہ ملے۔ اگر انھوں نے سن لیا کہ ہم کسی قسم کی کوئی کوشش کر رہے ہیں تو جینا حرام کر دیں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں کرامت صاحب! اس بات کا خیال تو ہم سب سے پہلے رکھیں گے۔ دراصل ہمیں سب سے زیادہ ضرورت اس کے موبائل نمبر کی ہے، جس کے ذریعے وہ بات کرتا رہا ہے۔"

"میں جانتا تھا، آپ یہی کہیں گے، جب کہ اغوا کرنے والے کا موبائل نمبر میں پہلے ہی اپنے موبائل میں محفوظ کر چکا ہوں۔"

"بہت خوب!"

کرامت نسیم نے اپنے موبائل سے نمبر انھیں منتقل کر دیا۔

''ہم اس نمبر کو ڈائل نہیں کریں گے۔ ہم نمبر کے ذریعے اس کا نام پتا معلوم کریں گے اور پھر اس پر قابو پالیں گے۔''

''کیا یہ اتنا ہی آسان ہوگا؟'' کرامت نسیم نے حیران ہو کر کہا۔

''آج کل سموں کے ذریعے پولیس کا کام بہت آسان ہو گیا ہے، لیکن ایک اور امکان بھی ہے اور میرا خیال ہے وہی بات سامنے آئے گی۔''

''وہ کیا؟''

''غیر قانونی سمیں، یعنی کسی کے نام کی سم کسی اور کے پاس ہے اور وہ فون کرنے کے بعد اپنا مقام بھی بدل دیتا ہے، موبائل بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح سراغ لگانے میں مشکل بھی پیش آتی ہے، لیکن بہر حال جرم، جرم ہے۔ مجرم کا سراغ آخر لگ ہی جاتا ہے۔ ہم اس شخص کا سراغ بہر حال لگا لیں گے اور اس سے ساری دولت نکلوا لیں گے۔''

''خیر یہ آپ کا کام ہے میں تو چاہتا ہوں، کسی طرح اس کا سراغ لگا لیا جائے۔ اس کم بخت نے میرے بھائی کی برسوں کی محنت ہڑپ کر لی ہے۔ ہمارے والد تو بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ بھائی جان نے بچپن سے ہی محنت شروع کر دی تھی۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کپڑا بننے والی کھڈیوں پر کام کرتے رہے۔ یہ کام کرتے کرتے انھیں بہت تجربہ ہو گیا۔ پھر انھوں نے خود کپڑا بننے کا کام شروع کیا اور بہت چھوٹے پیمانے پر رفتہ رفتہ ترقی کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے دس بارہ مشینیں لگا لیں۔ اب ان پر دن رات کپڑا تیار ہونے لگا۔ ان کا کپڑا بہت مقبول ہو گیا، مانگ بڑھتی چلی گئی، اس طرح ان کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ مال دار ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے چھوٹے گھر کی جگہ بڑا گھر خرید لیا، ایک کار بھی خرید لی، لیکن ترقی کی منزل آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی اور پھر ایک دن آیا جب یہ

کپڑے کی مل کے مالک بن گئے۔ ایک بہت شان دار کوٹھی بنوالی۔ کئی کاریں خرید لیں۔ مطلب کہ ترقی پر ترقی کرتے چلے گئے۔ ان حالات میں یہ شخص ہماری خوشیوں بھری زندگی میں آ کودا...... بھلا اسے کیا حق پہنچتا تھا، ایک شخص کی تین چالیس سال کی محنت کا مفت میں مالک بن جائے، لیکن انسپکٹر صاحب! انسان اولاد کے ہاتھوں مجبور ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے سب کچھ کرسکتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کرامت نسیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کیا آپ مجھے اس شخص کی آواز بھی سنوا سکتے ہیں، آپ نے رکارڈ تو کی ہوگی؟''

''جی ہاں! میں نے اس کی آواز رکارڈ کی ہے، بلکہ اس کی ساری گفتگو ہمارے پاس رکارڈ ہے۔''

''وہ بھی آپ مجھے دے دیں۔ میں دفتر میں بیٹھ کر سن لوں گا اور آپ فکر نہ کریں، میں آج ہی سے اس کیس پر کام شروع کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ بہت جلد اس کا سراغ لگا لوں گا۔ پھر ہم وجاہت صاحب کو خوش خبری سنائیں گے۔ فی الحال ان سے کسی قسم کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ہرگز نہیں، بھابی تو آ جائیں گی میری جان کو۔ میں تو اس وقت بھی ایک دوست سے ملنے کا بہانہ بنا کر آیا ہوں۔''

''دوست کا نام تو نہیں بتا کر آئے؟'' انسپکٹر وقار بیگ مسکرائے۔

''جی نہیں۔'' انھوں نے فوراً کہا۔

''جونہی کوئی کام یابی ہوئی۔ میں بذریعہ ایس ایم ایس خبر کروں گا ویسے ہم وقتاً فوقتاً ملتے رہیں گے۔''

دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جونہی کرامت نسیم گھر میں داخل ہوئے ایک نئی آواز

نے ان کا استقبال کیا اور وہ آواز تھی سلائی مشین کی۔ انھیں حیرت ہوئی کہ گھر میں سلائی مشین کہاں سے آگئی اور اس پر کپڑا کون سی رہا ہے۔ انھوں نے دیکھا ان کی بھابھی سلائی مشین پر کوئی کپڑا سی رہی تھیں۔

''یہ کیا بھابی جان! یہ مشین کس کی ہے اور یہ کپڑا کیسا سی رہی ہیں؟''

''بھیا! میں نے آپ کے بھائی جان سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے ایک سلائی مشین لا دیں۔ میں آس پڑوس کے کپڑے سی لیا کروں گی، اس طرح بھی ہم کچھ پیسے کما لیا کریں گے۔''

''اوہ...... تو...... آپ بھابی جان! آپ یہ کام کریں گی؟''

''میری والدہ نے مجھے اس قسم کے بھی کام سکھائے تھے۔ آج یہ کام ہم سب کے لیے آسانی پیدا کریں گے۔''

ان سب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ادھر ان کے بڑے بھائی گھر میں کپڑا بُن رہے تھے۔

''تو پھر میں بھی ٹیوشن پڑھاؤں گا۔''

وجاہت نسیم نے کہا: ''نہیں کرامت! میرے اور تمھاری بھابی کے کام سے گھر کا خرچ آسانی سے چل جایا کرے گا۔''

''لیکن کیوں بھائی جان! آپ دونوں کام کریں اور میں بے کار بیٹھوں، یہ نہیں ہوگا۔'' انھوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تم میرا تیار کردہ کپڑا بازار لے جا کر بیچ آیا کرنا۔''

''یہ کام تو بہت مختصر سے وقت میں ہو جایا کرے گا۔ میں باقی وقت میں فارغ کیسے بیٹھ سکتا ہوں؟ جی نہیں میں ٹیوشن پڑھاؤں گا۔''

اور اس نے یہی کیا۔ البتہ توقیر ابھی کم عمر تھا۔ انھوں نے اسے صرف تعلیم پر توجہ دینے پر مجبور کیا۔ وہ خود گھر کے حالات دیکھ کر بہت حساس ہو چکا تھا۔ اس نے ضرورت سے زیادہ تعلیم پر توجہ شروع کر دی۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ آسانی سے گزر بسر کرنے کے قابل ہو گئے۔ توقیر کو اسکول تک چھوڑنے کے لیے جانا اور اسکول سے لے کر آنا کرامت نسیم کی ڈیوٹی تھی، کیوں کہ وہ سب ڈرے ہوئے تھے اور دودھ کا جلا تو چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

کئی دن گزر چکے تھے انسپکٹر وقار بیگ کا کوئی پیغام وصول نہیں ہوا تھا، آخر کرامت نسیم نے خود انھیں پیغام بھیجا: ''کیا بات ہے انسپکٹر صاحب! آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔''

جلد ہی ایس ایم ایس کا جواب آ گیا۔ انھوں نے کہا تھا: ''آپ وہیں آ جائیں۔''

وہ اسی وقت اس ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ انسپکٹر وقار بیگ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ہاتھ ملایا، اداس انداز میں مسکرائے بھی۔ پھر کہنے لگے: ''مجھے افسوس ہے میں اب تک بالکل کوئی کام یابی حاصل نہیں کر سکا۔ اغوا کرنے والا کوئی عام مجرم نہیں ہے۔ وہ بہت ماہر قسم کا آدمی ہے۔ اس کا سراغ لگانا آسان کام نہیں۔ اس سے کسی قسم کا کوئی اناڑی پن سرزد نہیں ہوا۔ ہم اس سم سے کوئی سراغ نہیں لگا سکے۔ ایک بات تو یہ کہ وہ سم بالکل بند ہے۔ دوسرے وہ ایک غریب آدمی کے نام پر ہے۔ وہ غریب آدمی اب اس دنیا میں ہے بھی نہیں۔ کسی حادثے میں مارا گیا تھا۔ حیرت ہے۔ مجرم نے اس غریب آدمی کی سم کیسے حاصل کر لی؟''

''وہ غریب آدمی کون تھا؟'' کرامت نسیم نے پوچھا۔

''وہ کوئی مزدور تھا۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ بس محنت مزدوری کرتا تھا۔ اس کا

چھوٹا سا گھر تھا۔ وہ اب بند پڑا ہے۔ اس کی موت کے بعد کوئی کہنے بھی نہیں آیا کہ اس مکان کا مالک وہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں تنہا تھا۔ بے چارہ حادثے میں مر گیا۔"

"تب پھر انسپکٹر صاحب! یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ مجرم نے ہی اسے اپنی گاڑی سے کچل دیا ہو، لیکن ایسا کرتے کسی نے نہ دیکھا ہو اور پھر وہ خود اسے اسپتال لے گیا ہو۔ اس دوران اس نے وہ مہر حاصل کر لی ہو۔"

"ارے واہ! آپ تو اچھے خاصے سراغ رساں ہیں۔" انسپکٹر وقار بیگ نے حیرت سے کہا۔

"اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ مجرم پہلے سے منصوبہ بنا چکا تھا۔ اسے ایک عدد مہر کی ضرورت تھی۔ ایسی مہر کی جس کے ذریعے اس کا سراغ نہ لگایا جا سکے اور اس کا ذہن اس منصوبے پر کام کرتا رہا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس کا باقاعدہ گروہ پہلے تھا یا مہر حاصل کرنے کے بعد اس نے کوئی گروہ ترتیب دیا۔ جو بھی ہے، اس سے ہماری رائے تبدیل نہیں ہوگی۔ پہلے مرحلے پر اس نے مہر حاصل کی۔ پھر اغوا کا منصوبہ بنایا۔ ویسے انسپکٹر صاحب! کیا اس شخص کے مارے جانے کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکتی۔ لگتا ہے یہ زیادہ پرانی بات نہیں۔"

"یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔ میں اخبار میں وہ خبر تلاش کر چکا ہوں۔"

"اوہ...... اچھا! اس کا مطلب ہے کہ اس نے مہر تین سال پہلے حاصل کر لی تھی، پھر منصوبہ بناتا رہا کہ اب کیا جرم کرے، کہاں ڈاکا ڈالے یا کسی بچے کو اغوا کرے۔" کرامت نسیم نے خیالی گھوڑے دوڑائے۔

"ہاں! ضرور ایسا ہی ہے، لیکن بات تو پھر وہیں اٹک جاتی ہے۔ ہم اس کیس میں آگے کیسے بڑھیں؟ ظاہر ہے، مجرم کا مرنے والے مزدور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہوا یہ ہوگا

کہ اس نے اس مزدور کو اپنے گھر میں مزدوری کے لیے بلایا ہوگا۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ اس کے پاس موبائل ہے۔ بس اس نے اسے کچل دیا اور رقم حاصل کر لی۔'' انسپکٹر وقار بیگ کہتے چلے گئے۔

''تو کیا انسپکٹر صاحب! ہم اس کا سراغ نہیں لگا سکیں گے؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ سب ابھی ہمارے اندازے ہیں۔ ہو سکتا ہے، مزدور واقعی کسی حادثے میں شدید زخمی ہو گیا ہو اور اغوا کرنے والا اسے اسپتال پہنچانے کے لیے اپنی کار میں لے گیا ہو۔ بس اسی دوران اس نے رقم اُڑا لی ہو اور پھر وہ زخمی، زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا ہو۔ میں اپنی کوشش بہر حال کروں گا، لیکن اس کیس میں کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں، پھر بھی ایک بات میں کہہ سکتا ہوں۔''

''چلیے پھر وہ ایک بات ہی بتا دیں۔'' کرامت نسیم نے اداس انداز میں مسکرا کر کہا۔

''وہ یہ کہ کبھی ایسا ہوتا ہے مجرم نہیں پکڑا جاتا، لیکن قدرت کی سزا سے وہ پھر بھی نہیں بچ پاتا۔''

''لیکن انسپکٹر صاحب! ہمیں تو نہیں معلوم ہو سکے گا کہ اغوا کرنے والا کون تھا، قدرت نے اسے کیا سزا دی۔'' کرامت بیگ کی آواز غم کے بوجھ تلے دب گئی۔

''یہ ضروری نہیں، کیا پتا وہ کسی طرح ہمارے سامنے آجائے اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ یہی وہ شخص تھا، جس نے توقیر کو اغوا کیا تھا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں کچھ معلوم کر سکا تو آپ کو ضرور فون کروں گا۔''

''میری تو دلی خواہش ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح پکڑا جائے۔''

''ہونی بھی چاہیے۔ میں خود اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ آمین۔'' کرامت نسیم نے فوراً کہا۔

"اب یہ طے رہا کہ ہم یہیں ملاقات کیا کریں گے۔ جب بھی ضرورت ہوگی، ایس ایم ایس کر کے یہاں آ جایا کریں گے۔ اس طرح آپ کی بھابی صاحبہ کو پتا نہیں چلے گا اور مجرم بھی بے فکر ہو جائے گا کہ ہم لوگ اب اس کا خیال دل سے نکال چکے ہیں۔ اُدھر وہ بے خبر ہوا۔ اِدھر ہم اس تک پہنچے۔"

"ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب!" کرامت نسیم مسکرائے۔

"آپ مجھے انسپکٹر صاحب نہیں، بھائی کہا کریں۔ میں یہاں سادہ لباس میں آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان!" کرامت نسیم نے مسکرا کر کہا۔

انسپکٹر وقار بیگ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

......☆......☆......

کرامت نسیم اپنے شان دار دفتر میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ایس ایم ایس کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے بے دھیانی میں اسکرین پر نظر ڈالی۔ انھیں قدرے حیرت ہوئی۔ مدت ہوئی، اس نام سے کوئی ایس ایم ایس نہیں آیا تھا۔ جواب میں ایس ایم ایس کرنے کے بجائے انھوں نے نمبر ڈائل کر ڈالا: "کرامت نسیم بات کر رہا ہوں۔ انسپکٹر وقار بیگ صاحب!"

"جی کرامت صاحب! میں ہوں آپ کا خادم۔"

"اتنی مدت بعد میرا خیال کیسے آ گیا؟ شاید آپ پندرہ سال بعد فون کر رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ پندرہ سال پہلے ہم نے ریسٹورنٹ میں ملاقات کی تھی، چائے پی تھی اور اس وقت آپ نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ ان شاء اللہ ہم مجرم تک پہنچ کر رہیں گے۔ پھر تو گویا آپ کا فون یا ایس ایم ایس ایسے غائب ہوئے کہ آج پندرہ سال بعد اسکرین پر آپ کا نام نظر آیا ہے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا کرامت صاحب! لیکن میں کیا کرتا، اپنی پوری کوشش کے

باوجود بھی اغوا کرنے والے کا سراغ نہیں لگا سکا تھا، کسی قسم کی کوئی معلومات حاصل نہ کر سکا، لہٰذا خاموش ہو رہا۔"

"لیکن آپ خیریت معلوم کرنے کے لیے بھی تو فون کر سکتے تھے؟" کرامت نسیم نے منھ بنایا۔

"بس شرم آڑے آتی رہی کہ آپ کیا خیال کریں گے۔ یہ پولیس انسپکٹر ہیں اور ایک مجرم کا سراغ لگا نہیں سکے۔ بس یہی سوچ کر میں نے فون نہیں کیا، یہاں تک کہ پندرہ سال گزر گئے اور آج آپ کو فون کرنے پر خود کو مجبور پا رہا ہوں اور میری احتیاط دیکھ لیں، میں نے اب بھی آپ کو ایس ایم ایس کیا، حالاں کہ اب وہ قصہ پندرہ سال پرانا ہو چکا ہے۔"

"واقعی، اس بات کی تو تعریف کرنی چاہیے۔"

"شکریہ، شکریہ!" انسپکٹر وقار بیگ ہنسے۔

"ہاں تو پھر یہ بھی تو بتائیں نا، آج کیسے یاد آ گیا میں آپ کو؟ کیا اتنی مدت بعد آپ نے اس شخص کا سراغ لگایا ہے؟"

"یہ بات نہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔

"آپ کا مطلب ہے، آپ اب تک اس شخص کا سراغ نہیں لگا سکے؟"

"یہی بات ہے، لیکن۔" انسپکٹر وقار بیگ کہتے کہتے رک گئے۔

"لیکن کیا؟"

"لیکن اتنی مدت بعد ایک عجیب بات سامنے آئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس عجیب بات کا تعاقب کروں۔"

"جی کیا کہا آپ نے ...... بات کا تعاقب ..... یہ کیا بات ہوئی ہے؟"

"میں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ یہ بات کا تعاقب ہی ہو گا۔ آپ لوگوں کی کوٹھی

بھلا کس نے خریدی تھی؟''

''جی، کوٹھی؟ پندرہ سال ہو گئے، مجھے تو اس شخص کا نام بھی یاد نہیں رہا۔''

''وہ شخص اپنی کوٹھی فروخت کر رہا ہے۔ آپ لوگ تو خیر اب اسے خریدنے کے قابل نہیں رہے، ورنہ میں آپ لوگوں سے کہتا کہ اپنی کوٹھی خود خرید لیں۔''

''وہ اپنی کوٹھی فروخت کر رہا ہے، لیکن جناب! اس میں عجیب بات کیا ہو گئی، وہ اس کی چیز ہے، جب چاہے فروخت کر سکتا ہے اور یہ آپ نے کیا کہا کہ آپ تو خیر اس کو خرید نہیں سکتے۔''

''آپ اس کوٹھی کو خرید سکتے ہیں!'' مارے حیرت کے انسپکٹر وقار بیگ کے منھ سے نکلا۔

''میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں انسپکٹر صاحب!''

''آپ میرے دفتر آ جائیں یا جہاں آپ کہیں، وہاں آ جاتا ہوں۔ اب تو تو تو والی بات پرانی ہو گئی۔''

''آپ میرے دفتر آ جائیں۔''

''دفتر..... تو کیا آپ نے کسی دفتر میں ملازمت کر لی ہے؟''

''جی ہاں۔ آپ بس آ جائیں، میرا دفتر اسٹریٹ نمبر چھے، آسام روڈ پر واقع ہے۔ یہاں آ کر فون کر لیں۔ میں خود باہر آ کر آپ کا استقبال کروں گا۔''

''اوہ اچھا۔'' انسپکٹر وقار بیگ نے قدرے حیرت سے کہا۔

جلد ہی انسپکٹر وقار بیگ نے انھیں فون کیا۔ گھنٹی سنتے ہی وہ اپنے دفتر سے باہر نکل آئے۔ کچھ دور انسپکٹر وقار بیگ کھڑے نظر آئے۔

''انسپکٹر صاحب!'' انھوں نے آواز دی۔ انسپکٹر وقار بیگ نے آواز کی سمت

میں نظر اُٹھائی۔ انھوں نے دیکھا کہ کرامت نسیم ایک بہت شان دار دفتر کے باہر کھڑے تھے اور اس دفتر کی پیشانی پر ماربل کے حروف سے لکھا گیا تھا: ''توقیر انڈسٹریز۔''

مارے حیرت کے اس نے پلکیں جھپکائیں۔ پھر کرامت نسیم سے گرم جوشی سے ملے: ''یہ...... یہ کیا...... توقیر انڈسٹریز! تو کیا آپ لوگوں نے پھر کوئی مل قائم کر لی؟''

''جی! اللہ کی مہربانی ہے، یہ سب اس کا کرم ہے، بندوں کا اس میں کوئی کمال نہیں، ہاں! یہ ہے کہ میں نے، بھائی جان نے، توقیر نے، بھائی صاحب نے اور میری بہن نے محنت سے جی نہیں چرایا۔ ساری دولت چھن جانے کے باوجود ہم دل مایوس نہیں ہوئے۔ ہم نے مسلسل محنت کی اور کرتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ پھر ہم نے اپنے قدم جمانے شروع کر دیے۔ ہمارا کپڑا ایک بار پھر مقبول ہو گیا۔ نام نیا تھا، لیکن اس کاروبار سے تعلق رکھنے والے لوگ تو ہم سے واقف تھے۔ انھوں نے بھی ہمارا خوب ساتھ دیا اور اللہ کی مہربانی سے پہلے جتنی بڑی مل تو خیر ابھی نہیں بنی ہے، لیکن پھر بھی ایک بہت اچھی مل کے مالک ہیں اور الحمد للہ! ہم اپنی کوٹھی ایک بار ضرور خرید سکتے ہیں، آیئے میں آپ کو بھائی جان اور توقیر سے ملواتا ہوں۔ توقیر نے اس دوران انجینئرنگ کی اعلا تعلیم حاصل کر لی ہے اور اب وہ جدید تقاضوں کے عین مطابق اپنے کاروبار کو روز بروز ترقی دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب وہ دن دور نہیں جب ہم پہلے سے بڑی مل بنانے میں کام یاب ہو جائیں گے۔''

''حیرت انگیز! میں کس قدر خوشی محسوس کر رہا ہوں اس وقت۔'' انسپکٹر وقار بیگ بولے۔

پھر کرامت نسیم انھیں اندر لے آئے۔ وجاہت نسیم کا دفتر بھی بہت شان دار تھا۔ وہ انھیں دیکھتے ہی احتراماً کھڑے ہو گئے۔

''ایک مدت بعد آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے توقیر کی وجہ سے میں نے

آپ سے رابطہ ختم کر دیا تھا، لیکن آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟''

''یہ تفصیل آپ کو کرامت صاحب سنا دیتے ہیں، پہلے میں توقیر صاحب سے ملنا پسند کروں گا۔ وہ تو اب کڑیل جوان بن چکے ہوں گے؟''

''جی ہاں! الحمد اللہ! آیئے، انھی کے دفتر میں بیٹھتے ہیں۔''

اب وہ سب ایک عالی شان کمرے کی طرف بڑھے۔ اس کی چمک دمک سے ہی پتا چل رہا تھا کہ اس کمرے کو خاص طور پر بنایا گیا ہے۔ وہ تینوں اندر داخل ہوئے۔ اندر ایک خوبرو نوجوان سرخ سفید رنگت والا خوب رو نوجوان کام میں مصروف تھا۔ انھیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا: ''ابو جی! آپ اور چچا جان آپ...... آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے بلا لیا ہوتا۔''

''انسپکٹر صاحب! آپ کا دفتر دیکھنا چاہتے ہیں اور ملاقات کرنا بھی، اس لیے ہم ادھر ہی چلے آئے۔''

''انسپکٹر صاحب؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں بیٹا! یہ انسپکٹر وقار بیگ ہیں۔ یہی میرے وہ دوست ہیں، جب آپ کو اغوا کر لیا گیا تھا تو انھوں نے مجرم کو پکڑنے کی کوشش کی تھی، لیکن اللہ کی مرضی۔ کام یاب نہیں ہو سکے تھے۔''

''اوہ...... تو یہ انکل وقار بیگ۔''

وہ تیزی سے آگے آیا اور ان کے گلے سے لگ گیا۔ اب چاروں بیٹھ گئے۔ کرامت نسیم نے ساری تفصیل سنائی، پھر انھیں بتایا کہ کس طرح انھوں نے ایک ریسٹورنٹ میں چوری چھپے ملاقاتیں کی تھیں، پھر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اتنی مدت بعد انھیں ان کا خیال کیوں آیا ہے۔

"اوہ! تو ہماری کوٹھی فروخت ہو رہی ہے؟" وجاہت نسیم نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں!"

"ہم اسے ضرور خریدیں گے، ابھی چلتے ہیں، پوچھتے ہیں، وہ اس کے لیے کتنی رقم چاہتے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"ہمیں خوشی ہوگی۔"

وہ اسی وقت کرامت نسیم کی کار میں روانہ ہوئے۔ انسپکٹر وقار بیگ نے اپنی جیپ وہیں چھوڑ دی۔ آخر پندرہ سال بعد وہ اپنی اسی کوٹھی کے سامنے کھڑے تھے، جس کو اپنے بیٹے کو چھڑوانے کے لیے بیچنا پڑا تھا، بلکہ اس کو ہی نہیں، اپنی مل کو بھی فروخت کرنا پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک نظر ہی میں انھوں نے دیکھ لیا، کوٹھی کی حالت بہت خراب تھی۔ شاید پندرہ سال میں ایک بار بھی اس کو رنگ و روغن نہیں کرایا گیا تھا۔ انسپکٹر وقار بیگ نے آگے بڑھ کر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

جلد ہی ایک شخص باہر آیا، انھیں دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی، جب کہ ان لوگوں کے منھ سے نکلا: "ارے یہ وہ صاحب تو نہیں ہیں، جنھوں نے یہ کوٹھی ہم سے خریدی تھی۔"

یہ سن کر اس نے کہا: "ہاں! میں وہ شخص نہیں ہوں، جس نے آپ سے یہ کوٹھی اور آپ کی مل خریدی تھی۔ میں نے تو بعد میں اس شخص سے یہ دونوں چیزیں خریدی تھیں۔ میرا نام فواد میاں راہی ہے اور آج میں یہ دونوں چیزیں فروخت کرنے پر مجبور ہوں۔ آیئے اندر آجایئے۔"

وہ انھیں اندر لے آیا۔ ان کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ ان کا جی چاہا، وہ ان

دیواروں سے لپٹ لپٹ کر روئیں، مگر انھوں نے صبر سے کام لیا اور فواد میاں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے: ''ہاں تو آپ کا کیا مطالبہ ہے؟''

''میرے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ مجھے پیسوں کی شدید ضرورت ہے، اس لیے میں آپ سے اتنے ہی پیسے لے لوں گا، جتنے میں آپ نے کوٹھی فروخت کی تھی۔ اگرچہ پندرہ سال گزر چکے ہیں اور زمینوں کے اور دوسری چیزوں کے نرخ کہیں کے کہیں پہنچ چکے ہیں، لیکن کوئی گاہک نہیں مل رہا۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔''

''ٹھیک ہے...... اسی قیمت میں ہم اسے خریدنے کے لیے تیار ہیں۔''

''بس تو پھر کل صبح آ جائیں۔ میں رجسٹری کرا دوں گا۔''

''بالکل ٹھیک۔'' وجاہت نسیم نے خوش ہو کر کہا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ کسی روز وہ اپنی کوٹھی پھر سے حاصل کر سکیں گے۔

''اچھا تو پھر اب ہم چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اجازت ہو تو میں ان سے ایک دو باتیں پوچھ لوں؟'' انسپکٹر وقار بیگ نے وجاہت نسیم کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہاں...... ضرور...... کیوں نہیں۔''

''فواد میاں صاحب! آپ کو رقم کی اتنی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ آپ نے تو اس شخص سے ان کی مل بھی خریدی تھی۔''

''جی ہاں۔ یہ قسمت کے کھیل ہیں۔ کسی وقت میں نے یہ دونوں چیزیں خریدی تھیں اور آج بیچنے پر مجبور ہوں۔''

''اوہ! تو آپ مل بھی بیچ رہے ہیں؟'' وہ چونکے۔

''جی...... جی ہاں ...... مجبوری ہے۔''

''ایسی کیا مجبوری پیش آ گئی؟''

''بس! اب آپ کو کیا بتاؤں اور آپ کیا کریں گے سن کر، کیا آپ مل بھی خرید سکتے ہیں؟''

''ابھی ہم مل کی قیمت تو خیر ادا نہیں کر سکتے، لیکن ایسا ہے دس بارہ سال بعد ہم اس قابل ہو جائیں گے۔ آپ کو بہرحال آج ضرورت ہے۔ خیر آپ کو گاہک مل جائیں گے۔ کپڑوں کی ملیں لگانے والے مل جائیں گے۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں گاہک تلاش کر لوں گا۔'' اس نے فوراً کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم صبح آئیں گے۔ میں آپ سے ایک بار پھر پوچھتا ہوں کہ آپ کو آخر اتنی رقم کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟'' انسپکٹر وقار بیگ نے کہا۔

''اگر آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو بتائے دیتا ہوں۔ میرا بیٹا غلط راستوں پر چل نکلا ہے۔ اس نے بُری صحبت اختیار کر لی۔ دولت کی ریل پیل نے اس کا دماغ خراب کر دیا۔ دونوں ہاتھوں سے دولت کو اُڑانے لگا۔ اس نے بے تحاشا دولت اُڑائی۔ بات صرف یہیں تک رہتی تو بھی کوئی بات نہیں تھی، لیکن وہ تو اس سے بھی آگے نکل گیا اور پھر......'' وہ کہتے ہوئے رک گیا۔

''اور پھر کیا؟'' ان سب کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔

''اور پھر ایک دن اس سے قتل ہو گیا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ کئی سال مقدمہ چلا اور آخر اسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔''

''اوہ!'' انسپکٹر کے منھ سے نکلا۔

''میں باپ ہوں کیا کروں؟ میں نے مقتول کے وارثوں سے ملاقاتیں کیں، ان

کے پاؤں پکڑے۔ ان کے آگے رویا، گڑگڑایا، کیوں کہ اگر وہ میرے بیٹے کو معاف کر دیتے ہیں تو میرا بیٹا چھوٹ سکتا ہے۔ منتیں کرتے کئی ماہ گزر گئے، آخر اب وہ اس بات پر آئے ہیں کہ......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں ہاں، کہیے...... کس بات پر آئے ہیں وہ؟" انسپکٹر وقار بیگ نے بے چین ہو کر کہا۔

"اس بات پر کہ میں اپنی ساری دولت انھیں دے دوں۔ صرف اس صورت میں وہ اسے معاف کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں دونوں چیزیں فروخت کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ اس کی بات سن کر انھیں ایک زبردست جھٹکا لگا۔ خاص طور پر انسپکٹر وقار بیگ تو بہت حیران ہوئے۔

"آپ کو کیا ہوا، انسپکٹر وقار بیگ! میرے دوست!"

"فواد میاں راہی کی بات سن کر مجھے شدید حیرت ہوئی ہے۔ مسٹر فواد! آپ اس سے پہلے کیا کرتے رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ جب آپ نے یہ کوٹھی اور مل خریدی تھی۔ ان دنوں آپ کیا کرتے تھے؟"

"باپ دادا کے زمانے کی جائداد پاس تھی سوچا تھا کہ ان کی جائداد بیچ کر کوئی ایسی چیز خرید لوں، جس سے مستقل منافع ہوتا رہے۔"

"لیکن مل جیسا کام تجربے کے بغیر تو ہو نہیں سکتا؟"

"اس وقت مل فروخت ہوتی نظر آئی تھی۔ میں نے سوچا، فی الحال یہ خرید لیتے ہیں۔ بعد میں منافع پر بیچ دوں گا، دراصل جائداد خریدنا اور بیچنا ہی میرا کام تھا۔"

"ہوں...... اور پھر آپ کے بیٹے سے قتل جیسا ہولناک جرم ہو گیا۔"

"ہاں، اب اگر میں ان لوگوں کو ان کی منھ مانگی رقم نہیں دیتا تو میرا بیٹا پھانسی

چڑھ جائے گا۔"

"ہوں...... اب میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں۔" انسپکٹر وقار بیگ مسکرائے۔

"جی کہیے!"

"آپ ہی وہ شخص ہیں، جس نے پندرہ سال پہلے میرے دوست وجاہت نسیم کے بیٹے توقیر کو اغوا کیا تھا۔"

"کیا......" مارے حیرت کے وجاہت نسیم، کرامت نسیم اور توقیر کے منھ سے نکلا۔

"ہاں جناب!"

"نہیں، بالکل غلط۔ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ میں وہ شخص ہرگز نہیں ہوں۔"

"آپ کا یہ جملہ آپ کے جرم کا ثبوت ہے، کیوں کہ آپ کو تو یہ کہنا چاہیے تھا کیا مطلب؟ کیسا اغوا؟ میں کیوں کرتا کسی کو اغوا، لیکن آپ نے صاف اور سیدھی بات یہ کہہ دی کہ نہیں میں وہ شخص نہیں ہوں۔ یہ تو ہوئی ایک بات، لیکن میرے پاس ایک اور ثبوت بھی محفوظ ہے۔" انسپکٹر وقار بیگ مسکرائے۔

"اور کیا؟" اس نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"پندرہ سال پہلے آپ نے ان حضرات سے توقیر کو چھوڑنے کے سلسلے میں بات چیت کی تھی۔ اس کی رکارڈنگ ابھی تک ہمارے پاس محفوظ ہے۔"

"نن...... نہیں۔"

"اور میں نے اس زمانے میں اس رکارڈنگ کو بار بار سنا تھا۔ آپ کی آواز میرے دماغ میں محفوظ ہو گئی تھی۔ آپ کی آواز بالکل وہی ہے۔ ہم آپ کو وہ رکارڈنگ سنوا سکتے ہیں۔"

"نن...... نہیں...... اچھا ٹھیک ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں میں نے توقیر کو اغوا کیا تھا، لیکن اگر آپ نے مجھے اس موقعے پر گرفتار کر لیا تو میرا بیٹا رہا نہیں ہو سکے گا۔ وہ پھانسی

چڑھ جائے گا۔ مجھ پر رحم کریں، مجھ پر رحم کریں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

وہ کافی دیر تک اسے روتے دیکھتے رہے۔ آخر انسپکٹر وقار بیگ نے کہا: ''فواد میاں راہی صاحب! اگرچہ آپ نے ان لوگوں پر کوئی رحم نہیں کیا تھا۔ انھیں در بہ در کیا تھا۔ آپ زبردست منصوبہ ساز ہیں، لیکن تقدیر نے آپ کو آپ کی منصوبہ بندی کا اس سے کہیں زیادہ زبردست جواب دیا۔ دیکھ لیں آپ چاروں شانے چت ہو گئے یا نہیں؟''

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر وقار بیگ خاموش ہو گئے۔ اب سب فکر فکر فواد میاں کو دیکھ رہے تھے۔

آخر وجاہت نسیم نے کہا: ''پھر اب کیا ہوگا؟ کیا آپ اس شخص کو گرفتار کر لیں گے؟''

''ہونا تو یہی چاہیے، ویسے جو آپ چاہیں گے، وہی کریں گے۔ بتائیں آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میرے خیال میں اس شخص کو بہت سزا مل چکی۔ اب بھی یہ ساری دولت دے کر صرف اپنا بیٹا حاصل کرے گا۔ وہ بیٹا جو ہے بھی ناکارہ۔ میرے بیٹے کی طرح نہیں، لہٰذا میں نہیں چاہتا آپ اسے گرفتار کریں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ ہم اس سے کوٹھی خرید لیتے ہیں اور جل کا گاہک بھی اسے تلاش کر دیں گے۔ یہ اپنے بیٹے کو چھڑوا لے۔ اس نے میرے لیے کوئی رحم نہیں کیا تھا، لیکن ہم اس کی بے رحمی کا جواب بے رحمی سے نہیں دیں گے۔ شاید یہ دونوں اس طرح معاشرے کے اچھے انسان بن جائیں۔ آیئے انسپکٹر صاحب! چلیے، چلتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے وجاہت نسیم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ باقی لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے میں فواد میاں راہی ان کے قدموں میں گر گیا اور رونے لگا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ وہ آنسوؤں کی زبان میں بات کر رہا تھا۔

☆☆☆

ایک عظیم درس گاہ

نسرین شاہین

کراچی شہر کی عظیم درس گاہ "سندھ مدرستہ الاسلام" جسے قائد اعظم محمد علی جناح کی پہلی درس گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے، اہم تاریخی پس منظر رکھتا ہے۔ یہ ایک جدید علمی ادارے کے طور پر قائم ہوا تھا، لیکن بنیادی طور پر یہ اس خطے کے روشن خیال مسلمانوں کی ایک تحریک کی طرح تھا، جس نے اپنے طالب علموں کے ذریعے سے قیامِ پاکستان کو یقینی بنایا۔ سندھ مدرستہ الاسلام نے ان بے شمار ممتاز رہنماؤں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی، جنھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو زندہ رکھا اور آزادی کا سورج طلوع کر کے دم لیا۔ سندھ مدرستہ الاسلام برطانوی دور میں سندھ کے مسلمانوں کو جدید تعلیم دینے کی غرض سے قائم ہوا تھا۔

۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریزوں کے قبضے سے پہلے سندھ کا اپنا نظامِ تعلیم ہوتا تھا۔ اس نظام کے تحت مکتب اور مساجد اسکولوں میں بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی، لیکن وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نہیں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ کے حالات روز بہ روز خراب ہوتے گئے۔ ایسے

وقت میں حسن علی آفندی کے ساتھ سندھ کے کئی باشعور اور روشن خیال لوگ آگے آئے اور انھوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم دینے کے لیے معیاری اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرستہ الاسلام کا قیام عمل میں آیا تو سندھ کے مسلمانوں میں ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہو گیا۔

شروع میں سندھ مدرستہ الاسلام ایک بورڈنگ اسکول کے طور پر قائم ہوا تھا، جس کے چار بورڈنگ ہاؤسز تھے، یعنی ٹالپر ہاؤس، حسن علی ہاؤس، خیر پور ہاؤس اور سردار ہاؤس۔ سندھ مدرستہ الاسلام کی مرکزی بلڈنگ کا سنگِ بنیاد "وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن" نے ۱۴ نومبر ۱۸۸۷ء میں رکھا تھا، جو ۱۸۹۰ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دو منزلہ عمارت کا نقشہ اس وقت کے کراچی میونسپلٹی کے آرکیٹیکٹ جیمز اسٹریچن نے بلا معاوضہ تیار کیا تھا اور تعمیراتی کام کی نگرانی بھی خود کی تھی۔ سندھ مدرستہ الاسلام کی عمارت تقریباً آٹھ ایکڑ کے رقبے پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے پہلے پرنسپل خان بہادر ولی محمد حسن علی تھے۔

سندھ مدرستہ الاسلام کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت ہندستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آئے ہوئے مسلمانوں کو عارضی طور پر سندھ مدرستہ الاسلام کے بورڈنگ ہاؤسز میں رہائش فراہم کی گئی تھی۔

سندھ مدرستہ الاسلام کے ابتدائی دو سال کے عرصے میں قائداعظم نے یہاں داخلہ لیا۔ یہ ۸ جولائی ۱۸۸۷ء کی بات ہے جب سندھ مدرستہ الاسلام کی انگریزی کی پہلی جماعت میں قائداعظم داخل ہوئے۔ تھوڑے ہی دن بعد وہ بمبئی (ممبئی) جا کر انجمنِ اسلام کی پہلی جماعت میں داخل ہو گئے، لیکن پھر واپس کراچی آ کر دوبارہ سندھ مدرستہ الاسلام کی پہلی ہی جماعت میں ۲۳ ستمبر ۱۸۸۷ء سے پڑھائی شروع کی۔ قائداعظم نے سندھ مدرستہ الاسلام میں تین سال تعلیم حاصل کر کے ۱۸۹۰ء میں تیسری جماعت پاس کر لی۔ یوں قائداعظم نے اپنے ابتدائی تعلیمی درجے سندھ مدرستہ الاسلام میں طے کیے۔

قائد اعظم محمد علی جناح کو اپنی مادر علمی سندھ مدرسۃ الاسلام سے اس قدر محبت تھی کہ انھوں نے اپنی وصیت میں بھی اپنی جائداد کا ایک تہائی حصہ اس کے نام کر دیا تھا۔ ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے ۲۱ جون ۱۹۴۳ء کو سندھ مدرسۃ الاسلام کالج کا قیام عمل میں آیا، جس کا افتتاح قائد اعظم نے اپنے دست مبارک سے کیا۔ اس تاریخی موقع پر انھوں نے اس ادارے سے اپنی لگن اور تعلق کو یوں بیان فرمایا: "میں ان شان دار میدانوں کے ایک ایک انچ سے اچھی طرح واقف ہوں، جہاں میں نے مختلف کھیلوں میں حصہ لیا۔"

سندھ مدرسۃ الاسلام اپنے قیام کے ۵۸ برس بعد کالج کے درجے تک پہنچا اور پھر جامعہ کا روپ اختیار کر گیا۔ سندھ مدرسۃ الاسلام یونی ورسٹی کے قیام کا بل دسمبر ۲۰۱۱ء میں سندھ اسمبلی سے منظور ہوا۔ ۲۱ فروری ۲۰۱۲ء کو گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد نے سندھ مدرسۃ الاسلام یونی ورسٹی کا چارٹر شیخ الجامعہ محمد علی شیخ کے حوالے کیا، جس کے بعد اس میں پہلے تعلیمی دور کا آغاز ہوا۔

سندھ مدرسۃ الاسلام میں تقریباً پندرہ ہزار کتب موجود ہیں جن میں کئی تو سو سال پرانی ہیں۔ سندھ مدرسۃ الاسلام میں جناح میوزیم بھی قائم ہے، جس میں بانی پاکستان کے ساتھ ساتھ سندھ مدرسۃ الاسلام کے بانی اور سندھ مدرسۃ الاسلام کے سابق ممتاز طالب علموں کی یادگار چیزیں رکھی گئی ہیں۔ سندھ مدرسۃ الاسلام کے بانی حسن علی آفندی سابق صدر پاکستان آصف علی زرداری کے پر نانا تھے۔

☆☆☆

خاص نمبر

شمس القمر عاکف

بہاریں لے کے آئے خاص نمبر
کلی دل کی کھلائے خاص نمبر

جونہی ہاتھوں میں آئے خاص نمبر
ہر اک غم کو مٹائے خاص نمبر

نہایت خاص تحفہ ساتھ لے کر
محبت کو بڑھائے خاص نمبر

مہینا جون کا اچھا ہے کتنا
ہمیں صورت دکھائے خاص نمبر

ہر اک تحریر، اک پیغام بھی ہے
ہمیں رستہ دکھائے خاص نمبر

ہمیشہ "نونہال" اپنا ہو ہمدم
ہمیشہ یونہی آئے خاص نمبر

بہ طورِ تہنیت یہ نظم میں نے
رقم کر لی برائے خاص نمبر

ایک پانچ کا کھیل

سلیم فاروقی

وہ ایک بہت ہی پیارا اور معصوم سا بچہ تھا۔ خوب صورت اور بھولا بھالا اتنا کہ ہر کسی کی توجہ حاصل کر لیا کرتا۔ ہر کوئی اسے بے اختیار گود میں بٹھا کر پیار کرنا چاہتا۔ اس کے چہرے پر معصومیت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ شرارت تو اس کے قریب سے بھی نہیں گزری۔ جب بھی کوئی اس سے مذاق کرتا تو وہ اس کو نہ صرف بڑی خوش اخلاقی سے برداشت کرتا، بلکہ اپنی عمر کے مطابق بڑی تمیز سے اس کا جواب بھی دیتا۔ وہ پورے محلے کی آنکھوں کا تارا اور راج دلارا تھا۔

ایک بار وہ اپنے محلے ہی میں کہیں جا رہا تھا۔ اس کا ایک پڑوسی اپنے گھر کے باہر اپنے کسی دوست کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔ انھوں نے جونہی بچے کو دیکھا تو اس کو بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا اور اپنے دوست سے آہستگی سے کہا: ''ایک تماشا دیکھنا۔''

جونہی وہ بچہ قریب آیا، انھوں نے اس بچے کو پیار کیا اور کہا: ''آؤ، وہ ہی پرانا کھیل کھیلیں۔''

یہ کہہ کر انھوں نے اپنی جیب سے دو سکے نکالے۔ ایک پانچ روپے والا اور دوسرا ایک روپے والا۔ انھوں نے یہ دونوں سکے اپنے ایک ایک ہاتھ میں رکھ کر دونوں ہاتھ بچے کی طرف بڑھا کر کہا: ''ان میں سے جو سکہ چاہو اُٹھا لو۔''

بچے نے پہلے تو دونوں ہاتھوں میں موجود سکوں کو غور سے دیکھا، پھر پڑوسی کے چہرے کی طرف ایک نظر ڈالی، پھر اس نے ایک روپے والا سکہ اُٹھایا اور بڑے پیار سے
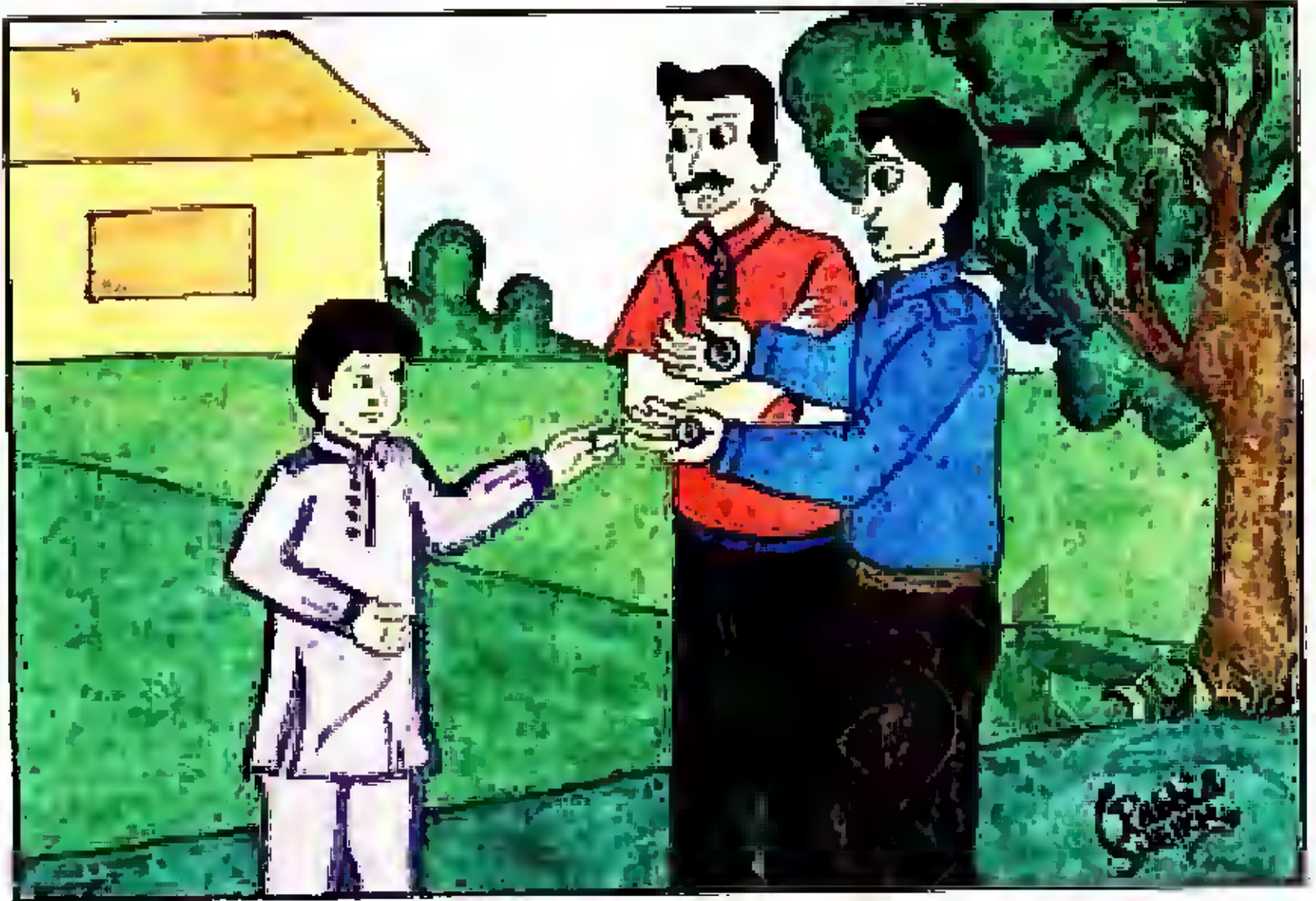
"تھینک یو انکل!" کہہ کر وہاں سے چل دیا۔

بچے کے جانے کے بعد وہ پڑوسی اپنے دوست سے کہنے لگا: "یہ بہت پیارا بچہ ہے۔ معصوم اتنا کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ آج کے کمپیوٹر دور کا بچہ ہے۔ میں جب بھی اس کے ساتھ یہ کھیل کھیلتا ہوں، یہ ہمیشہ ایک روپے والا سکہ ہی اُٹھاتا ہے۔ اس نے کبھی پانچ روپے والا سکہ نہیں اُٹھایا۔"

یہ سن کر دوست کو بھی خوش گوار حیرت ہوئی۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں یوں ہی گپ شپ کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد دوست نے اجازت لی اور واپس چل دیا۔

کچھ ہی فاصلے پر وہ دوست ایک قریبی دکان میں کچھ خریدنے کی غرض سے داخل ہوا تو دیکھا وہی بچہ اس دکان پر موجود ہے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر بچے کو پیار کیا اور اس

سے پوچھا: "کیا مجھ کو پہچانا؟"

بچے نے کہا: "جی ہاں انکل! آپ ہمارے پڑوسی انکل کے دوست ہیں۔"

انھوں نے پوچھا: "کیا تم میرے ساتھ بھی وہی کھیل کھیلو گے جو اپنے پڑوسی انکل کے ساتھ کھیلتے ہو؟"

بچے نے کہا: "جی ضرور انکل!"

انھوں نے اپنی جیب سے دو سکے نکالے، ایک پانچ رپے کا اور دوسرا ایک رپے کا۔ دونوں سکے اپنے ایک ایک ہاتھ میں رکھ کر بچے کی طرف بڑھا دیے اور کہا: "ان میں سے جو چاہو اٹھالو۔"

بچے نے پھر دونوں سکوں کو دیکھا، ان کے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے پانچ روپے والا سکہ اُٹھا لیا۔

یہ دیکھ کر ان کو زور کا ایک جھٹکا لگا کہ بچے نے ایک رپے کے بجائے پانچ رپے والا سکہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے بچے سے کہا: "بیٹا! یہ سکہ تو تمھارا ہوا، لیکن یہ بتاؤ کہ تم اپنے پڑوسی انکل کے ہاتھ پر سے تو ایک رپے کا سکہ اُٹھاتے ہو اور مجھ سے پانچ رپے کا سکہ لیا، ایسا کیوں؟"

بچے نے سنجیدگی سے کہا: "اصل میں پڑوسی انکل میرے ساتھ کافی دن سے یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے سکوں کی پہچان نہیں ہے، اس لیے میں ہمیشہ ایک رپے کا سکہ اُٹھاتا ہوں، حال آں کہ مجھے سکوں کی اچھی طرح پہچان ہے۔"

انھوں نے پوچھا: "پھر تم ایک رپے کا سکہ کیوں اُٹھاتے ہو؟"

بچہ بولا: ''جس دن میں نے پانچ روپے والا سکہ اُٹھا لیا، اس دن انکل یہ کھیل کھیلنا بند کر دیں گے، یوں مجھے نقصان ہو جائے گا۔''

ان کو اس معصوم بچے کی ذہانت پر رشک آیا، پھر انھوں نے پوچھا: ''اگر تم اس کھیل کو روکنا نہیں چاہتے ہو تو تم نے مجھ سے پانچ روپے کا سکہ کیوں لے لیا؟''

بچہ بولا: ''اصل میں آپ کو آج پہلی بار دیکھا ہے، دوبارہ پتا نہیں آپ کب ملیں گے؟ آپ کون سا روز روز یہ کھیل کھیلیں گے، اسی لیے میں نے پانچ روپے والا سکہ اُٹھا لیا ہے۔''

☆☆☆

بلاعنوان انعامی کہانی

م۔ عدیم علیگ
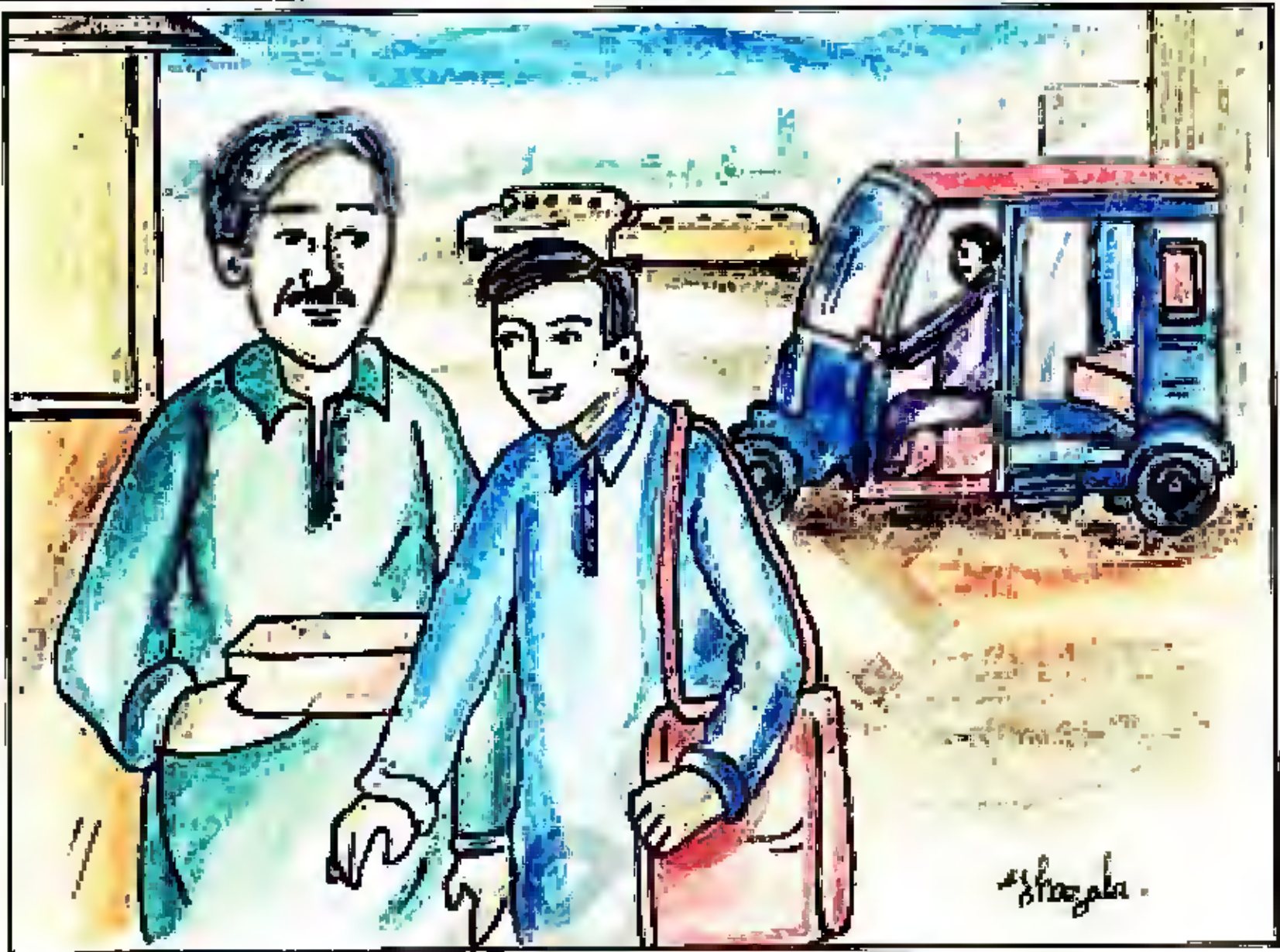
کریم بھائی کا بیگ کھو گیا تھا۔ وہ بینک سے رپے نکال کر اپنی کار میں بیٹھے اور راستے میں دو تین جگہوں پر دوستوں سے ملاقات کرنے کو رکے تھے۔ فون کر کے انھوں نے معلوم کر لیا، مگر ان کے بیگ کا پتا نہیں چل سکا۔ اس بیگ میں اَسّی ہزار رُپے تھے، مگر ان کو رپوں کی اتنی فکر نہیں تھی، جتنی ان اہم کاغذات کی تھی، جو اسی بیگ میں تھے۔ دراصل اس میں ایک بڑی تجارتی کمپنی سے مال ایکسپورٹ کرنے کا معاہدہ اور آرڈر تھا اور کچھ کاغذات حساب کتاب سے متعلق تھے۔

اگر یہ کاغذات اور رُپے کسی ملازم سے کھو جاتے تو وہ یقیناً اس پر چوری یا غبن کا

الزام لگا کر اس کو پولیس کے حوالے کر دیتے، مگر یہ غلطی تو خود ان سے ہی ہوئی تھی، اس لیے وہ کسی پر غصہ بھی تو نہیں اُتار سکتے تھے۔ بھلا جس کو اتنی بڑی رقم ملے گی وہ کیوں واپس کرے گا! وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہے تھے اور ساتھ میں ہونے والے نقصان کا حساب لگا رہے تھے۔ وہ دن اور تمام رات بہت بے چینی سے گزرا۔

ان کا ارادہ تھا کہ وہ اخبار میں اشتہار دے دیں کہ جو بھی اس بیگ کو تلاش کر کے ان تک پہنچائے گا، اس کو بیس ہزار روپے انعام دیں گے۔ دوسرے دن کچھ لوگ ان سے ملنے آنے والے تھے، ان سے بھی ملاقات نہیں کی اور نوکر سے کہلوا دیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

نوکر ڈرتے ڈرتے بولا: ''حضرت! ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''میں نے تم سے کہہ دیا کہ میں بہت پریشان ہوں۔ میں کسی سے نہیں ملوں گا۔'' وہ غصے سے بولے۔

''مگر وہ کہتا ہے کہ آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ آپ کی امانت واپس کرنا ہے۔''

''امانت کیسی امانت!'' انھوں نے سوچا اور پھر بولے: ''بلاؤ! بلاؤ شاید وہ میرے بیگ کا پتا بتا سکے۔ دیکھو چلا نہ جائے۔''

چند لمحوں بعد ایک نوجوان ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا: ''کیا آپ کا نام کریم بھائی ہے؟''

''ہاں ہاں میرا نام کریم بھائی ہے۔''

''کیا آپ کی کوئی چیز کھوئی ہے؟''

''میرا روپوں کا بیگ ہے اس میں دس ہزار روپے اور کاغذات ہیں۔'' کریم بھائی

نے کھڑے کھڑے ہی جواب دیا۔

پھر خیال آیا کہ بدحواسی میں اس نوجوان سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تو بولے:

"میاں صاحب زادے! بیٹھو بیٹھو۔"

اس نوجوان نے کپڑے میں لپٹا ہوا بیگ نکالا اور ان کو تھماتے ہوئے کہا:

"جناب! اس میں آپ کی ساری امانت ہے، آپ گن لیں۔"

کریم بھائی نے بیگ کھولا اور اس میں سے کاغذات کو نکال کر چوما، کیوں کہ وہی سب سے زیادہ قیمتی تھے۔ پھر دس ہزار کی ایک گڈی نکال کر اس نوجوان کی طرف بڑھا دی اور بولے: "صاحب زادے! تم نے مجھے بہت بڑی پریشانی اور نقصان سے بچا لیا۔ اللہ تم کو خوش رکھے۔ یہ انعام نہیں بلکہ نذرانہ ہے۔"

نوجوان نے سادگی سے کہا: ''جناب! ایمان داری اپنا انعام خود ہے۔ میں نے یہ کام کسی انعام کے لالچ میں نہیں کیا۔ اگر آپ کا پتا نہیں ملتا تو میں اسے پولیس کے حوالے کر دیتا۔''

کریم بھائی نے بہت اصرار کیا، مگر نوجوان نے انعام کی رقم لینے سے انکار کر دیا۔

کریم بھائی اس کی ایمان داری اور سادگی سے بہت متاثر ہوئے اور اس سے اس کے خاندان کے بارے میں گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہ نوجوان ناصر حسین ہے اور کسی پرائیوٹ کمپنی میں کلرک ہے۔ گھر میں بوڑھے ماں باپ ہیں۔

اور پھر ناصر حسین نے ایک عجیب واقعہ سنایا کہ جس کو سن کر کریم بھائی کے دل و دماغ میں بے چینی پیدا ہو گئی۔

''دراصل میرے والد کے ساتھ اسی قسم کا حادثہ پیش آ چکا ہے۔ میری عمر اس وقت آٹھ دس سال کی تھی۔ میرے والد اپنی پنشن اور فنڈ کا چیک کیش کرا کر ایک آٹو رکشے میں آ رہے تھے۔ راستے میں میرا اسکول تھا۔ وہ مجھے اسکول سے لے کو خوش خوش گھر واپس آ رہے تھے۔ میں کلاس میں فرسٹ آیا تھا۔ ان کو اپنا رزلٹ دکھلا رہا تھا۔ اسی خوشی میں انھوں نے آٹو رکشہ رکوا کر ایک دکان سے مٹھائی خریدی اور کچھ دوسرا سامان بھی خریدا تھا۔ بدقسمتی سے رپوں کا تھیلا آٹو رکشے میں رہ گیا جس میں بیس ہزار رپے تھے۔ میری بہن کی شادی ہونے والی تھی اور ابا نے یہ رپے اس کی شادی کے لیے نکالے تھے۔ آٹو رکشے والے کو ہم نے بہت تلاش کیا اور پولیس میں بھی رپورٹ لکھوا دی، لیکن اتنے بڑے شہر میں کسی شخص کا ملنا ناممکن تھا، جس کو ہم جانتے بھی نہ ہوں۔ میری اماں اور ابا کو بہت صدمہ ہوا۔ ان کی تمام عمر کی کمائی یہی رقم تھی اور پھر میری بہن کی شادی ہونے کو

تھی، مگر میرے ابا بہت صابر انسان ہیں۔ انھوں نے اس آٹو رکشے والے کو نہ بددعا دی اور نہ کوسا، بلکہ جب بھی اماں کچھ اس کے بارے میں بُرا بھلا کہنے لگتیں تو ابا منع کر دیتے اور کہتے: ''صبر کرو منے کی اماں! شاید اللہ کی کوئی بہتری اس میں پوشیدہ ہو۔ شاید اس آدمی کو ان روپوں کی ہم سے زیادہ ضرورت ہو، اللہ رازق ہے ہمیں کہیں اور سے دے دے گا۔ شاید وہ رقم ہماری قسمت میں نہیں تھی۔ میرے ابا نے اپنے آبائی مکان کو فروخت کر دیا اور میری بہن کی شادی میں اس روپے کو خرچ کیا اور ہم لوگ ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ میں نے کسی طرح سے ہائی اسکول پاس کیا اور ایک کمپنی میں نوکری کر لی۔ مجھے یہ بیگ پا کر احساس ہوا کہ اس کے مالک کو اس کے کھو جانے سے نہ جانے کتنا بڑا نقصان پہنچے، اس لیے جلد سے جلد یہ امانت اس کے سپرد کر دینی چاہیے۔ بس میری یہ خواہش ہے کہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ اپنا پرانا مکان پھر سے حاصل کر لوں۔''

''ناصر میاں! تمھاری کہانی بہت دکھ بھری ہے۔ اس سے مجھے بہت بڑا سبق حاصل ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم اپنا مکان ضرور حاصل کر لو گے۔ میری کمپنی میں ایک اکاؤنٹس کے آدمی کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کے لیے موزوں شخص ہو۔ کیا تم میری کمپنی میں کام کرنا پسند کرو گے۔ ہاں یہ تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں، بلکہ تمھاری ایمان داری ہماری کمپنی کے لیے انعام ہو گی۔''

''مجھے آپ کی کمپنی میں، آپ کی نگرانی میں کام کر کے بہت خوشی ہو گی جناب! مگر میں اپنے ابا جی سے بھی رائے لے لوں۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''ہاں میں تمھارے ابا سے جلد ہی ملوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کو کوئی اعتراض نہیں

ہوگا کہ تم میری کمپنی میں کام کرو اور اگر ہوگا تو میں ان کو منالوں گا۔" کریم بھائی نے ناصر کی پیٹھ تھپ تھپائی۔

اب ناصر حسین، کریم بھائی کی کریم آٹو کمپنی میں اکاؤنٹینٹ تھا اور آٹھ ہزار روپے ماہانہ پاتا تھا اور کمپنی کی گاڑی اس کو گھر سے لے جاتی تھی اور گھر چھوڑنے آتی تھی۔

......☆......

اس کہانی کا ایک حصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے، مگر کہانی کا دوسرا حصہ باقی ہے، جو سبق آموز بھی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ایک سال بیت چکا ہے۔ ناصر حسین کے پاس اب اتنی رقم ہے کہ وہ اپنا مکان خرید سکتا ہے۔ وہ اپنے ابا کو لے کر پرانے مکان کو دیکھنے جاتا ہے تو ان کو بہت مایوسی ہوتی ہے، کیوں کہ اس مکان کی تو صورت ہی بدل چکی تھی۔ اب وہاں دو منزلہ خوب صورت عمارت کھڑی تھی، جس کی قیمت کئی لاکھ ہوگی اور ابھی اس کی آرائش کا کام چل رہا تھا۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ کسی امیر آدمی نے اس کو ایک سال پہلے خرید لیا تھا اور سال بھر سے یہاں تعمیر جاری تھی۔

ناصر حسین نے ٹھنڈی سانس لی اور ابا سے بولا: "ابا میاں! شاید اب ہم اپنا مکان واپس نہیں لے سکیں گے۔"

باپ نے بیٹے کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا اور کہا: "بیٹا! شاید اللہ کی کوئی مصلحت ہماری بہتری کے لیے اس میں ہوگی۔ اس کا شکر ادا کرو کہ ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔"

کریم بھائی ایک دن اچانک ناصر حسین کے گھر پہنچ گئے اور ناصر کے والد سے اپنا تعارف کرایا: "مجھے کریم بھائی کہتے ہیں۔ ناصر میاں میری کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ بہت

محنتی اور لائق نوجوان ہیں۔'' کریم بھائی نے کہا۔

''جناب! آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ آپ کا بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے ناصر کو اپنی کمپنی میں کام دیا اور اس پر اعتبار کیا۔ ابھی تو وہ ناتجربے کار ہے۔'' ناصر کے والد نے کہا۔

''محترم! تجربے کے لیے عمر کی قید نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی نوجوان جلد وہ تجربے حاصل کر لیتے ہیں جو ہم بوڑھے لوگ بھی مدتوں نہیں کر پاتے۔'' کریم بھائی نے ہنس کر کہا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کروں۔ آپ مجھے حکم دیتے تو میں آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو جاتا۔ میں غریب آدمی ہوں، آپ بہت بڑے انسان ہیں۔ آپ کا یہ احسان ہے کہ مجھے یہ عزت بخشی۔'' ناصر کے والد نے کہا۔

''آپ مجھے شرمندہ نہ کریں، میں ایک گناہ گار انسان ہوں۔ آپ کی خدمت میں حاضری میرے لیے ایک نئی زندگی کا باعث ہے۔'' کریم بھائی نے ناصر کے والد کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

''ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اللہ نے آپ کو دولت، عزت، راحت ہر چیز دی ہے۔ آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔''

''بھائی صاحب! یہ واقعی اللہ کا رحم و کرم ہے کہ وہ اپنے گناہ گار بندوں کو بھی نعمتوں سے نوازتا ہے، مگر میں واقعی گناہ گار ہوں اور بہت دکھی انسان ہوں۔'' کریم بھائی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''ناصر میاں نے بتایا تھا کہ اب سے تقریباً پندرہ سال پہلے کوئی آٹو رکشے والا آپ

کا روپوں کا تھیلا لے کر بھاگ گیا تھا۔"

"جی ہاں، مجھے وہ حادثہ کل جیسا لگتا ہے، مگر اب اس کے دہرانے سے کیا حاصل۔ اللہ کرے کہ وہ رقم اس آٹو رکشے والے کے لیے آرام کا باعث ہوئی ہو۔" ناصر کے والد نے جواب دیا۔

"ہوا یہ کہ جب آٹو رکشے والا گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پیچھے سیٹ پر ایک تھیلا رکھا ہوا ہے۔ اس نے تھیلا کھولا تو اس میں بیس ہزار روپے تھے۔ اس نے سوچا کہ یہ روپے واپس کر دوں، پھر اس کو شیطان نے بہکایا کہ یہ بے وقوفی مت کرنا، یہ تمھاری قسمت کے ہیں، رکھ لو۔ اس آٹو رکشے والے نے وہ رقم واپس نہیں کی اور آٹو رکشہ چلانا چھوڑ کر ورک شاپ قائم کر لی۔ اس چوری کی رقم سے اس نے مشین خریدی۔ کام چل نکلا۔ پھر ایک پُرزوں کا کارخانہ قائم کیا۔ حکومت سے قرضہ لے کر کام بڑھایا اور پندرہ سالوں میں وہ لکھ پتی بن گیا۔ اب کاروں کے پُرزے اس کے کارخانے میں بنتے ہیں اور بھی کئی کام کر لیے ہیں، مگر اس کا دل اس کو برابر ملامت کرتا ہے کہ اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ وہ آپ کی رقم جرمانے کے ساتھ واپس کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر سیٹھ صاحب! آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"اجی! مجھے کیسے معلوم ہوتا۔ اس رکشے والے نے مجھے یہ سب بتایا ہے۔"

"تو آپ جانتے ہیں اسے؟"

"خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تو کیا آپ مجھے اس سے ملوا دیں گے؟"

"وہ آپ کے پاس سر کے بل خود آئے گا، مگر بھائی جان! ایک شرط ہے کہ آپ اسے دل سے معاف کر دیں۔ وہ بہت شرمندہ ہے۔ شیطان نے اسے بہکا دیا تھا۔ وہ کہتا

ہے کہ آپ کا مکان بھی آپ کو واپس کر دے گا۔" کریم بھائی نے اس آٹو رکشے والے کی وکالت کی۔

"مگر جناب! وہ مکان تو کسی سیٹھ نے خرید لیا ہے اور اب کئی لاکھ روپے کا ہو گا۔ بھلا وہ مجھے کیوں ملے گا؟"

"معافی کی شرط یہی ہے کہ مکان آپ کو واپس ملنا چاہیے۔ بولیے منظور ہے؟"

"جی...... مجھے منظور ہے۔ میرا مکان مجھے مل جائے گا۔" ناصر کے والد نے خوش ہو کر کہا۔

"تو آپ نے گویا اسے معاف کر دیا۔ سچے دل سے؟"

"ہاں جناب! مگر اسے لایئے تو، ملوایئے تو، کہاں ہے وہ؟"

"جناب! وہ چور، گناہ گار، وہ شیطان، نامعقول اور سزا کا مستحق انسان آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ جس کا نام سیٹھ کریم بھائی ہے۔"

کریم بھائی کھڑے ہو گئے، سر جھکائے مجرم کی طرح۔

"ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں سیٹھ صاحب! یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" ناصر کے والد کا منھ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"جی ہاں، یہ سب سچ ہے۔ میں ہی ہوں وہ گناہ گار انسان، جس نے آپ کو بہت صدمہ دیا۔ میں آپ کے گزرے ہوئے پندرہ سال واپس نہیں کر سکتا اور نہ ان مصیبتوں کا جرمانہ ادا کر سکتا ہوں، مگر آپ کا مکان آپ کو واپس کرتا ہوں۔ جس کو میں نے ایک سال قبل ناصر میاں سے پہلی ملاقات کے بعد ہی خرید لیا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ آپ کا مکان بہترین شکل میں آپ کو واپس کروں گا۔" یہ کاغذات اب آپ کے ہوئے۔

ناصر میاں کے ابا نے کریم بھائی کو سینے سے لگا لیا۔

ناصر کے ابا نے کہا: ''آپ بہت بڑے دل کے انسان ہیں۔ احساسِ گناہ اور اس سے توبہ کرنا بہت بڑی بات ہے، میں نے آپ کو معاف کیا۔ اللہ تعالیٰ بھی آپ کو معاف فرمائے۔ کاش! ہمارے ملک میں سارے سیٹھ آپ کے جیسے ہو جائیں۔''

یہ سن کر کریم بھائی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل پڑے۔

ایک درخواست اور ہے اگر آپ قبول کرلیں تو مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ میری ایک بیٹی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ناصر میاں جیسے نیک اور مخلص نوجوان سے اس کی شادی ہو۔ کیا آپ اس کی اجازت دیں گے؟'' کریم بھائی بولے۔

''ناصر آپ کا بیٹا ہے۔ آپ بخوشی اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر سکتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی کہ ناصر آپ کی سرپرستی میں رہے۔'' ناصر میاں کے والد نے آسمان کی جانب نظر اُٹھا کر کہا: ''اے ربِ کریم! تُو جو بھی کرتا ہے ہماری بھلائی کے لیے کرتا ہے، تیرا شکر ہے۔'' ☆

اس بلاعنوان انعامی کہانی کا اچھا سا عنوان سوچیے اور صفحہ ۱۷۱ پر دیے ہوئے کوپن پر کہانی کا عنوان، اپنا نام اور پتا صاف صاف لکھ کر ہمیں ۱۸- جون ۲۰۱۴ء تک بھیج دیجیے۔ کوپن کو ایک کاپی سائز کاغذ پر چپکا دیں۔ اس کاغذ پر کچھ اور نہ لکھیں۔ اچھے عنوانات لکھنے والے تین نونہالوں کو انعام کے طور پر کتابیں دی جائیں گی۔ نونہال اپنا نام پتا کوپن کے علاوہ بھی علاحدہ کاغذ پر صاف صاف لکھ کر بھیجیں تاکہ ان کو انعامی کتابیں جلد روانہ کی جاسکیں۔

نوٹ: ادارۂ ہمدرد کے ملازمین اور کارکنان انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔

یہ باتیں چھوڑو

شمیم فاطمہ

کسی کی بات میں ٹانگ اڑانا
کسی کے مسئلے میں گھس جانا
دھیان نہ دینا کام پہ اپنے
دیکھتے رہنا دن میں سپنے
باتیں کرنا اِن کی ، اُن کی
سچی ہوں ، چاہے ہوں جھوٹی
کانا پھوسی ہر محفل میں
میل بھرا رکھنا اس دل میں
لوگوں کو لڑواتے رہنا
غصے کو بھڑکاتے رہنا
یہ باتیں اچھی ہی کب ہیں؟
انساں پہ جچتی ہی کب ہیں
ان باتوں کو چھوڑو بھائی!
اپناؤ کوئی اچھائی

جادو کی چھڑی

وقار محسن

طوبی میاں کو جس دن سے نانی نے جادوئی ٹوپی کی کہانی سنائی تھی، جس کو پہننے والا غائب ہو جاتا ہے۔ طوبی اس دن سے جادوئی ٹوپی کے سحر میں گرفتار تھے اور ان کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح ان کو جادو کی وہ ٹوپی حاصل ہو جائے تو وہ غائب ہو کر جہاں چاہیں پہنچ جائیں۔

ایک دن رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے بستر پر لیٹے اسی ٹوپی کے خیال میں گم تھے کہ کھڑکی کے شیشے سے ان کی نظر باہر لان میں گلاب کی کیاری کے نزدیک ایک بوڑھی عورت پر پڑی، جس کے بال روئی کی طرح سفید تھے۔ بڑھیا طوبی کو اشارے سے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ طوبی میاں ڈرتے ڈرتے اس بڑھیا کے پاس گئے۔ بوڑھی عورت نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا: ''بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ تم بہت دنوں سے جادو کی ٹوپی کی تلاش میں ہو۔ یہ لو، ٹوپی کی جگہ میں تمھیں جادو کی یہ چھڑی دیتی ہوں۔ تم جس چیز کی طرف اس چھڑی کا رخ کر کے ''چھو'' کہو گے، وہ چیز غائب ہو جائے گی، لیکن تم اسے دوسروں کو پریشان کرنے کے لیے تفریح کے طور پر استعمال نہ کرنا۔'' اتنا کہہ کر وہ بڑھیا مولسری کے درخت کے پیچھے غائب ہو گئی۔

طوبی میاں حیرت سے سرخ رنگ کی اس چھڑی کو دیکھتے رہے۔ ان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی انھوں نے تجربہ کرنے کے لیے جادو کی چھڑی جنوبی دیوار پر لہراتی چنبیلی کی بیل کی طرف کر کے ''چھو'' کہا تو اچانک وہ بیل غائب ہو گئی۔ وہ خاموشی سے آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔

تھوڑی دیر بعد طوبی کو لان میں امی کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ ان کے

سامنے رحیم خاں مالی سر جھکائے کھڑا تھا۔ امی کہہ رہی تھیں: ''ارے تو کیا چنبیلی کی بیل کو جن کھا گئے۔ضرور اس میں تمھاری بے پروائی سے کیڑا لگ گیا ہوگا اور تم نے اس کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔''

مالی حیرت سے دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا اور قسمیں کھا کر بتا رہا تھا کہ کل شام تک بیل دیوار پر تھی۔

طوبیٰ نے اسکول جاتے وقت جادو کی چھڑی اپنے بستے میں چھپا لی۔ جب کلاس میں حامد صاحب حساب پڑھا رہے تھے اور انھوں نے چاک کا ڈبا میز پر رکھا ہوا تھا، طوبیٰ کو شرارت سوجھی اور اس نے چھڑی چاک کے ڈبے کی طرف کر کے آہستہ سے ''چھو'' کہا تو چاک کا ڈبا غائب ہو گیا۔ جب حامد صاحب کا چاک بلیک بورڈ پر لکھتے لکھتے ختم ہو گیا اور دوسرا چاک لینے کے لیے وہ مڑے تو دیکھا کہ ڈبا غائب تھا۔ انھوں نے غصے سے کہا: ''یہ کس نامعقول کی شرارت ہے؟''

جب کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو میز کے نزدیک بیٹھے صدیق بخش کی شامت آئی اور حامد صاحب نے اپنے مخصوص بید سے صدیق کی پٹائی کر دی۔ طوبیٰ میاں دل ہی دل میں اپنی شرارت پر خوش ہو رہے تھے۔ یوں پورے دن وہ اپنی چھڑی سے کسی نہ کسی کو پریشان کرتے رہے۔

اس شام طوبیٰ میاں لان میں اپنے پیارے کتے موتی کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ ٹینس بال ہوا میں اُچھالتے اور موتی بال زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنے جبڑوں میں پکڑ لیتا۔ ان کی چھڑی بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ سامنے ان کی چھوٹی بہن ماہا کی بلی ''ریشم'' اون کے گولے سے کھیل رہی تھی۔ طوبیٰ نے سوچا کہ ریشم کو غائب کر کے ماہا کو پریشان کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر انھوں نے اپنی جادو کی چھڑی ریشم کی طرف کر کے

''چھو'' کہا، اتفاق سے اسی دوران ان کے پیارے کتے موتی نے تتلی کے پیچھے چھلانگ لگائی اور چھڑی کے سامنے آ گیا اور اس پر جادو کا اثر ہو گیا۔ یوں موتی اچانک غائب ہو گیا۔

طوبیٰ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ موتی کی ہلکی ہلکی غراہٹ کی آواز آ رہی تھی، لیکن وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد غراہٹ بند ہو گئی۔ شاید وہ کسی اور طرف چلا گیا تھا۔ اسی دوران مناظر چچا کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ چند لمحوں بعد گاڑی سے کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز آئی اور موتی کی دلخراش چیخ گونجی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا، لیکن طوبیٰ سمجھ گئے تھے کہ موتی، چچا مناظر کو نظر نہیں آیا اور گاڑی سے ٹکرا گیا۔ اب موتی کے کراہنے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ شاید وہ مر چکا تھا۔

طوبیٰ میاں نہ جانے کب تک روتے روتے سو گئے۔ رات کے تیسرے پہر ان کو وہ بڑھیا پھر نظر آئی۔ بڑھیا نے طوبیٰ کے قریب آ کر کہا: ''طوبیٰ! میں تمھیں اس چھڑی سے محروم کر رہی ہوں اور تمھیں ایک نصیحت کر رہی ہوں۔ اس کو زندگی بھر یاد رکھنا۔ بیٹا! یاد رکھو کہ انسان کو جو دولت، طاقت، رتبہ، صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہیں، وہ اس شخص کے لیے نعمت ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی امانت ہوتی ہیں، جسے دوسروں کی مدد اور خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ ان سے دوسروں کو تکلیف یا نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ تم نے اس چھڑی کا غلط استعمال کیا اور اپنے پیارے موتی کو گنوا بیٹھے۔''

اچانک طوبیٰ کو امی کی آواز آئی: ''طوبیٰ بیٹا! جلدی اُٹھو اسکول کی وین آنے کا وقت ہو گیا۔''

طوبیٰ نے آنکھیں ملتے ہوئے شکر ادا کیا کہ یہ صرف ایک خواب تھا۔

☆☆☆

تہذیب کی ابتدا کیسے اور کہاں ہوئی

مسعود احمد برکاتی

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ دنیا میں تمدن و تہذیب کی ابتدا سب سے پہلے مشرقِ وسطیٰ کے اس حصے میں ہوئی، جسے آج کل عراق کہا جاتا ہے۔ اس خطے میں دو ندیاں تھیں، جنھیں ہم دجلہ اور فرات کہتے ہیں۔ ان دونوں ندیوں کی بدولت اس بنجر زمین کا ایک حصہ جو ہلال کی شکل کا ہے، نہایت زرخیز ہو گیا۔ اس زرخیز خطے کا نام جغرافیہ دانوں نے زرخیز ہلال رکھا ہے۔ اسی زرخیز ہلال میں تمدن کی ابتدا ہوئی۔ تمدن کا مطلب ہے، انسانوں کا مل جل کر رہنے کے طریقے۔ ان طریقوں میں جب سلیقہ آتا ہے تو وہ تہذیب کہلاتی ہے۔ زرخیز ہلال سے ہی تہذیب ساری دنیا میں پھیلی۔

دجلہ اور فرات کے نشیبی علاقوں میں جنگلی پودے (گیہوں اور جو وغیرہ) اور چند جنگلی جانور (بھیڑ، بکری، گھوڑے وغیرہ) بھی پائے جاتے تھے۔ ایک دن کسی شکاری نے سوچا کہ اگر میں شکار کے لیے کتا پال سکتا ہوں تو دوسرے جنگلی جانور کیوں نہیں پال سکتا۔ جب یہ جانور بچے دیں گے تو شکار کی تکلیف ختم ہو جائے گی اور گھر میں گوشت کھانے کو مل جائے گا۔ اس شکاری کے ساتھ ایک عورت بھی رہنے لگی، جو میلوں تک جنگلوں اور میدانوں میں گھوم گھوم کر گیہوں اور جو کے پودوں سے بالیاں توڑ کر لاتی اور ان میں سے دانے نکال کر گھر والوں کو کھلاتی تھی۔ اس عورت نے سوچا کہ اگر وہ ان دانوں کو اپنی جھونپڑی کے اطراف زمین میں گاڑ دے تو ان کے پودے نکل

آ ئیں گے اور اس طرح اس کا جنگلوں میں مارا مارا پھرنا ختم ہو جائے گا۔ گھر کے قریب ہی سے دانے مل جایا کریں گے۔ اس طرح کھیتی باڑی کا طریقہ شروع ہوا اور انسان ۹۰۰۰ سال قبلِ مسیح میں غذا جمع کرنے والے کے بجائے غذا پیدا کرنے والا بن گیا۔

جب انسان غذا کی تلاش میں جنگل جنگل پھرا کرتا تھا تو اسے اپنے لیے گھر بنانے کا خیال نہیں آیا تھا اور نہ وہ کوئی سامان ساتھ رکھ سکتا تھا۔ جب اس نے جنگلی جانور (بھیڑ، بکری وغیرہ) پالنے شروع کیے اور جنگلی غذائی پودے (گیہوں اور جو) اپنی جھونپڑی کے قریب لگانا شروع کیے تو بجائے اِدھر اُدھر گھومنے کے ایک ہی جگہ رہنا ضروری ہو گیا۔ اس نے گھاس پھوس کی جھونپڑیوں کے بجائے مٹی کی دیواریں بنائیں اور یہی سے مکان بننے کی ابتدا ہوئی۔ مٹی ہی سے پانی پینے کے لیے کٹورے بھی بنائے۔ جب اس کے گھر کی تمام عورتیں اور بچے مل کر کھیتی باڑی اور جانوروں کے پالنے میں لگے تو ان کو بہت آرام ملنے لگا۔ یہ دیکھ کر ان کو خیال ہوا کہ دوسرے لوگوں کے خاندان بھی ساتھ مل کر کام کریں گے تو یقیناً زندگی اور بھی آسان ہو جائے گی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ سب لوگوں نے ایک دوسرے کے قریب مکان بنانے شروع کر دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ ہزار سال قبلِ مسیح میں زرخیز ہلال کے خطے میں چند گاؤں نظر آنے لگے۔

زرخیز ہلال کی پہاڑیوں میں پانی کے چشمے اُبلا کرتے تھے۔ اب لوگ ان چشموں کے پانی کو نالیاں کھود کر بنجر زمینوں تک لے آئے، تاکہ زیادہ زمین پر کاشت کی جا سکے۔ یہ تیسرا انقلابی خیال تھا، جس کی وجہ سے چار ہزار سال قبلِ مسیح

سے پہلے آب پاشی کا رواج ہوا۔ جب اناج زیادہ پیدا ہونے لگا تو گھر میں فاضل اناج رکھنے کے لیے برتنوں کی ضرورت پڑی۔ اناج رکھنے کے برتنوں کے ساتھ ساتھ قسم قسم کے اور بھی برتن بننے لگے۔ اس طرح ظروف سازی یعنی برتن بنانے کی صنعت شروع ہوئی۔ گاؤں، پھیل کر شہروں میں بدلنے لگے۔ لوگ اپنا بنایا ہوا سامان دوسروں کو دے کر اس کے بدلے میں اپنے کام کی چیزیں حاصل کرنے لگے۔ یہ تجارت کی ابتدائی شکل تھی۔ اس کے بعد سکہ جاری کیا گیا۔ ان باتوں کی خبر یورپ پہنچی اور تین ہزار سال قبل مسیح میں اسپین اور فرانس میں کھیتی باڑی اپنی ابتدائی شکل میں شروع ہوئی۔

زرخیز ہلال کے خطے میں مختلف قسم کے اناج اور دوسری چیزیں رکھنے والے اتنے لوگ ہو گئے کہ لوگوں کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا کہ کون کیا کام کرتا ہے یا کس کے پاس کون سی چیز مل سکتی ہے۔ چند سوجھ بوجھ والے آدمی سر جوڑ کر بیٹھے اور گیلی مٹی کی ٹکیوں پر ٹیڑھی ترچھی لکیریں کھینچیں۔ ٹکیوں کو جلا کر سخت کیا اور ان کے نشانات کو سب نے ذہن نشین کر لیا۔ ہر ٹکیا کا نشان یہ ظاہر کرتا تھا کہ کون سا آدمی کیا کام کرتا ہے اور اس سے کون کون سی چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس خیال کے ذہن میں آنے کے بعد زرخیز ہلال کے بیچوں بیچ کسی جگہ لکھنے یا تحریر ایجاد ہوئی جو دنیا میں تمدن، تہذیب اور اس کے نتیجے میں تاریخ لکھنے کی ابتدا کا سبب بنی۔

☆☆☆

باغ کی سیر

امان اللہ نیر شوکت

جو پھول مسکرائیں گے
تو رنگ و بُو اُڑائیں گے
چمن میں گیت گائیں گے
خوشی سے جھوم جائیں گے
چمن میں ہم بھی جائیں گے

گلوں پہ جو نکھار ہے
ہوا بھی مشک بار ہے
ہمیں چمن سے پیار ہے
چمن کو ہم سجائیں گے
چمن میں ہم بھی جائیں گے

پھریں گے سبز گھاس پر
کریں گے سیر اِدھر اُدھر
پھر ایک پھول توڑ کر
لباس پر لگائیں گے
چمن میں ہم بھی جائیں گے

خوشی کا دن ہے، غم کہاں
ہیں سارے بچے شادماں
لو آ گئے نیر میاں
انھیں بھی ہم بتائیں گے
چمن میں ہم بھی جائیں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM
نونہال مصور
ذیشان احمد خان، میرپور خاص
ذاکر محمد شاکر، نئی کراچی
اریبہ انصاری، کراچی
کلثوم نواز، ڈیرہ اسماعیل خان
اُمِ حبیبہ، ٹیکسلا
عائشہ علاء الدین، حیدرآباد

فاطمہ رحیم، راولپنڈی کینٹ

فہد حسین کیریو، کراچی

شانزے عامر انصاری، کورنگی

حزل محمد علی، اوتھل بلوچستان

عائشہ کریم، کراچی

حبیبا محمد یونس، حیدرآباد

مریم شفیق، سرائے عالمگیر

بندریا بیگم

عبدالغنی شمس

کسی شہر میں ایک بیگم صاحبہ رہتی تھیں۔ انھوں نے ایک بندریا پال رکھی تھی۔ بیگم صاحبہ نے اس بندریا کو ایک بندر والے سے پانچ سو روپے میں خریدا تھا۔ شہر کے قریب ہی ایک جنگل تھا۔ بندر والا اس بندریا کو وہیں سے پکڑ لایا تھا۔ بیگم کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ قیمتی سامان، خوب صورت فرنیچر، شان دار بنگلہ، نوکر چاکر، مگر بیگم صاحبہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بیگم صاحبہ بندریا کو دل سے چاہتی تھیں، اتنا ہی نہیں، بلکہ بالکل اسے اپنے ہی جیسا لباس پہناتی تھیں۔ سلک کا سفید غرارہ، سلک کا سفید جمپر، اس پر ہلکے رنگ کا

نائیلون کا چاند تارا ٹنکا ہوا دوپٹا، کانوں میں دو چھوٹے چھوٹے جڑاؤ بُندے اور گلے میں موتیوں کی مالا۔ بندریا سچ مچ بیگم صاحبہ کی بیٹی معلوم ہوتی۔ گھر کے تمام لوگ یہاں تک کہ خود بیگم صاحبہ بھی اس بندریا کو بندریا بیگم کہہ کر پکارتیں۔ بندریا ہر وقت بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھی ہوئی پانوں کی ڈبیا سے پان نکال نکال کر کھاتی رہتی۔ یہی نہیں، بلکہ بندریا میں بیگم صاحبہ کی ساری عادتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ صبح کو دیر سے سو کر اُٹھنا، نوکرانیوں سے پاؤں دبوانا، دن بھر گاؤ تکیے کے سہارے لیٹے یا بیٹھے رہنا، اپنی جگہ سے ہل کر پانی تک نہ پینا، بے کاری میں سارا وقت گزارنا اور وہی آلکسی اور آرام طلبی۔ بس یوں سمجھو کہ بندریا ہو بہو بیگم صاحبہ کا نمونہ بن گئی۔ اسی کو کہتے ہیں، جیسی صحبت ویسا اثر۔

ایک رات بیگم صاحبہ کے بنگلے میں کسی طرح ایک چور گھس آیا۔ سامان والے کمرے میں بڑے بڑے تالے پڑے تھے۔ چور بڑا مایوس ہوا۔ اچانک اس کی نظر بیگم صاحبہ پر جا پڑی جو اپنی مسہری پر بڑی گہری نیند سو رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ کے پہلو میں بندریا دوپٹے سے چہرے کو ڈھانپے سو رہی تھی۔ چور نے بندریا کو بیگم صاحبہ کی بیٹی سمجھا اور لپک کر، مگر بڑی ہی آہستگی کے ساتھ اپنی گود میں اُٹھا لیا اور اپنے سینے سے لگائے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ بنگلے سے باہر نکل گیا۔ چور نے دل میں کہا کہ جب بیگم صاحبہ کی بچی کی پورے شہر میں ڈھونڈ مچے گی، اس وقت وہ کسی ترکیب سے اس بچی کے ذریعے سے بیگم صاحبہ سے کافی رُپے اینٹھ سکے گا۔ انھی باتوں کو سوچتے ہوئے اور بندریا کو اپنے سینے سے چمٹائے چور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا، تاکہ بیگم صاحبہ کی بچی کو کسی محفوظ جگہ چھپا دے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد چور جنگل کے قریب پہنچ گیا اور جنگل میں داخل ہوتا ہی

چاہتا تھا کہ بندریا کی آنکھ کھل گئی۔ اب صبح کا دودھیا اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ بندریا سمجھی کہ صبح ہوگئی ہے اور بیگم صاحبہ اس کو اپنی گود میں لے کر ٹہلا رہی ہیں، مگر جب بندریا نے اپنے چہرے پر پڑے دوپٹے کو ذرا سرکا کر دیکھا تو دل میں بہت گھبرائی، کیوں کہ وہ بیگم صاحبہ نہ تھیں، بلکہ کوئی اَن جان اسے پکڑ کر لیے جا رہا تھا۔ بندریا کو بڑا غصہ آیا۔ یکا یک اُچھل کر اس نے زور سے چور کے گال پر کاٹ لیا۔ چور نے چیخ کر بندریا کو اپنی گود سے زمین پر پٹخ دیا۔ بندریا جلدی سے اُچک کر درخت کی ایک شاخ پر جا بیٹھی۔ چور کا سارا بدن ڈر کے مارے بُری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے اور آخر یہ کون سی بلا تھی، جس کو وہ اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے اتنی دور لے آیا تھا؟

اب تو چور وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور ایسا بھاگا کہ پھر مڑ کر بھی جنگل کی

HBL
فیول پر بچت کا صحیح طریقہ
ایک مہینے میں Rs.2000 تک بچائیں
HBL FuelSaver

طرف نہ دیکھا۔ بندریا درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی چور کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

جب وہ نظر سے اوجھل ہو گیا تو بندریا کو اطمینان ہوا، پھر اس کو چور کی بدحواسی پر ہنسی آ گئی۔

جب سارے جنگل میں صبح کا اُجالا اچھی طرح پھیل گیا تو ایک بندر، ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر اُچھلتا کودتا اس درخت کے پاس آیا، جس پر بندریا بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک بندریا کی نظر بندر پر پڑ گئی۔ بندر، بندریا کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ بندریا انسانوں کا لباس کہاں سے پہن کر آئی ہے۔ بندریا، بندر کو بڑی پیاری لگی اور واقعی بندریا تھی بھی بہت ہی پیاری۔ اب بندر، بندریا کے قریب آیا۔ جب بندر نے اس کو غور سے دیکھا تو اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی، کیوں کہ وہ بندریا تو اس کی بیٹی تھی، جو پچھلے سات مہینے پہلے غائب ہو گئی تھی۔ بندر نے دوڑ کر بندریا کو گلے لگا لیا اور بڑے پیار و محبت کے لہجے میں بولا: ''تو میری بیٹی ہے، کیا تو نے مجھے پہچانا ہے؟'' اتنا کہہ کر خوشی کے آنسو بندر کی آنکھوں میں چھلکنے لگے۔ بندریا سچ مچ اپنے باپ کو نہیں پہچان پا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ باپ کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر میں سارے جنگل میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ کھوئی ہوئی بندریا مل گئی۔ جب بندریا کی ماں کو معلوم ہوا تو وہ بھاگم بھاگ بندریا کے پاس پہنچی اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور ہچکیاں لے لے کر بہت روئی۔ بندریا نے اپنی ماں کو پہچان لیا اور ماں کے ساتھ خود بھی رونے لگی۔ جب ماں کا دل ذرا ہلکا ہوا تو آنسو پونچھتے ہوئے بولی: ''بیٹی! تو کہاں کھو گئی تھی اور پھر یہاں کیسے آ گئی؟''

بندریا نے کہا: ''ماں! میں ایک دن جنگل سے اکیلی باہر نکل گئی تھی۔ پیپل کے

بڑے درخت کے پاس وہ جو کھیت ہے نا! اس میں مٹر کی پھلیاں کثرت سے بیل میں لگی ہوئی تھیں۔ میں مٹر کی پھلیاں توڑ توڑ کر مزے سے کھا رہی تھی کہ اتنے میں اُدھر سے دو بندر والے گزرے۔ انھوں نے مجھ کو اکیلا پایا۔ دو طرف سے ان دونوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں بھاگ نہ سکی اور انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور شہر میں لے جا کر ایک بیگم صاحب کے ہاتھ بیچ دیا۔"

پھر ذرا رک کر بندریا نے بڑے ہی پیار کے لہجے میں کہا: "اماں! بیگم صاحب بہت ہی اچھی ہیں۔ بڑے ہی لاڈ پیار سے بیٹی کی طرح انھوں نے مجھے رکھا۔ یہ دیکھو، اچھے اچھے اور عمدہ سونے کے زیور یہ سب بیگم صاحب ہی نے تو مجھے دیے ہیں۔"

بندریا کی ماں نے کہا: "بیٹی! پھر کیا ہوا، تُو یہاں کیسے آ گئی؟"

بندریا نے کہا: "ہوا یہ کہ میں بیگم صاحب کے ساتھ سوئی ہوئی تھی کہ ایک چور مجھ کو وہاں سے چُرا کر اس جنگل کی طرف لیے آ رہا تھا کہ میں نے اُچک کر اس کے گال پر کاٹ کھایا تو وہ ڈر کر مجھے زمین پر پٹخ کر بھاگ گیا اور ایسا بھاگا کہ پھر جنگل کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔" اتنا کہہ کر بندریا ہنس پڑی۔ بندریا کے ہنسنے سے اس کی ماں بھی مسکرائی اور بندریا سے لپٹ گئی اور بولی: "اللہ تیرا شکر، تُو نے میری کھوئی ہوئی بیٹی کو مجھ تک پہنچا دیا۔"

اس کے بعد بڑے پیار کے لہجے میں بولی: "میں اسی لیے تو تجھ کو اکیلی جانے سے روکتی تھی، مگر تُو میری بات نہیں مانتی تھی۔ دیکھ، اب ہرگز اکیلی جنگل سے باہر نہ نکلنا، ورنہ پھر تجھے کوئی پکڑ لے گا۔"

بندریا نے کہا: "ماں! اب میں وعدہ کرتی ہوں کہ اکیلی کبھی نہ نکلوں گی۔ اب سمجھ گئی، تم ٹھیک ہی کہتی تھیں امی!"

اور واقعتاً اس روز کے بعد بندریا کبھی اکیلی جنگل سے باہر نہ گئی۔ جب کہیں جانا چاہتی تو پہلے ماں سے اجازت مانگتی۔ ماں مناسب سمجھتی تو اپنے ساتھ لے جاتی، ورنہ کہہ دیتی: ''بیٹی! تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔'' اور بندریا، ماں کی بات مان جاتی۔ کبھی جانے کے لیے اصرار نہ کرتی۔

اب بندریا کی ماں کو فکر ہوئی کہ بندریا کی کہیں شادی کر دے تو اچھا ہے۔ بندریا جس روز شہر سے آئی تھی تو اس کے خوب صورت لباس اور اچھے زیور دیکھ کر بہت سے بندروں نے بندریا سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، مگر جب آہستہ آہستہ سارے جنگل میں بندریا کی بُری عادتوں کی خبر پھیل گئی کہ وہ صبح کو بہت دیر سے اُٹھتی ہے اور بڑی کاہل، کام چور اور آرام طلب ہے تو ان بندروں کی ماؤں نے کہا کہ وہ بہو جو کاہل اور آرام طلب ہو اور گرہستی کے قابل نہ ہو، وہ ہمارے کس کام کی؟ ہم ایسی بے کار سی بہو لا کر کیا کریں گے۔ اپنی ماؤں کے کہنے میں آ کر تمام بندروں نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جب بندریا کی ماں نے بندریا کو بتایا کہ اس کی بگڑی ہوئی عادتوں کی وجہ سے کوئی بندر اس سے شادی کرنے کو تیار نہیں تو وہ بہت دکھی ہوئی اور بہت جلد وہ ساری بُری عادتیں جو بیگم صاحبہ کے یہاں رہنے کی وجہ سے اس میں پیدا ہو گئی تھیں، چھوڑ دیں۔ جب بندروں کے سردار کے بیٹے کو یہ معلوم ہوا کہ شہر سے آئی بندریا نے ساری بُری عادتیں چھوڑ دیں تو شادی کا پیغام بھیجا۔ بندریا کی ماں نے دیکھا کہ اس کی بیٹی کا ہونے والا دولھا، سردار کا بیٹا ہے اور ہر طرح خود بھی اچھا ہے تو بڑی خوشی کے ساتھ اس کا پیغام قبول کر لیا اور ایک دن بڑی دھوم دھام سے بندریا کی شادی ہو گئی۔ واقعی ماں باپ کا کہنا ماننے اور ان کی ہدایات پر چلنے میں ہی بھلائی ہے۔

☆

دانشوروں کی باتیں

فاطمہ ثریا بجیا

''ہمدرد نونہال'' محبت کے لائق ہے۔ نونہال رسالہ اپنی جگہ ایک معتبر نام ہے، مگر میں فاطمہ ثریا، جسے سب بجیا کے نام سے پہچانتے ہیں، سند یافتہ عالمہ نہیں ہوں، لیکن اب یہ حال ہے کہ اعزازی طور پر میرے پاس تین پی ایچ ڈی کی ڈگریاں ہیں اور میرے خیال میں نہیں، یقین کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ یہ میرے بزرگوں کی شفقت اور ان کی تربیت ہے کہ آج میں عالمہ فاضلہ سمجھی جاتی ہوں۔ بہرحال بزرگوں کی تربیت اور مہربانیاں اپنی جگہ، مگر یہ میرے رب کی رحمت اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت ہے کہ میں صاحبِ علم سمجھی جاتی ہوں۔

تسلیم الٰہی زلفی، کینیڈا

پاکستان میں بچوں کے رسائل و جرائد میں ماہنامہ'' ہمدرد نونہال'' کو ابتدا سے ہی اختصاص اور امتیاز حاصل ہے۔ گزشتہ چھے دہائیوں میں'' نونہال'' کے ذریعے سے جناب مسعود احمد برکاتی صاحب نے نونہالوں کی چھے نسلوں کی تربیت کی ہے اور مجھے شرف حاصل ہے کہ میرا تعلق تربیت پانے والی پہلی نسل سے ہے۔ پاکستان میں بچوں کی تہذیبی، اخلاقی، لسانی اور ایک اچھا شہری بنانے کی سعیِ مسلسل کے حوالے سے ماہنامہ ہمدرد نونہال اور مسعود احمد برکاتی کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔

☆☆☆

بابا چینا

پروفیسر رئیس فاطمہ

بہت دن ہوئے کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، جو بہت نیک دل، سمجھ دار اور رعایا سے محبت کرتا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام دانیال تھا۔ وہ ابھی صرف دس سال ہی کا تھا کہ بادشاہ نے اس کی تربیت اس انداز میں شروع کروائی کہ اس کے دل میں خوفِ خدا ہر وقت رہے۔ وہ غریبوں کے دکھ درد کو سمجھے اور انھیں دور کرنے کی تدابیر بھی کرے۔ عالموں کی قدر کرے اور استاد کی عزت خود بھی کرے اور دوسروں کو بھی اس کا عادی بنائے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ دینی و دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت کا بھی انتظام کیا گیا۔ ملک کے بہترین دماغ شہزادے کی تربیت پہ مامور کر دیے گئے۔ شہزادے کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ خاص طور پر اسے بربط اور ستار بجانا بہت اچھا لگتا تھا۔

بادشاہ سلامت جن کا نام سلطان محمد فاروق تھا۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ اٹھارہ سال کی عمر تک شہزادہ فنِ حرب میں ماہر ہو جائے۔

بادشاہ دربارِ عام اور دربارِ خاص دونوں میں شہزادے کو اپنے ساتھ بٹھاتا تھا اور بعد میں اسے رموزِ سلطنت اور امورِ حکومت سے بھی آگاہ کرتا تھا۔ شہزادے کی والدہ ملکہ سلطان جہاں بیگم اور دادی والدۂ سلطان کہلاتی تھیں۔ محل کے اندرونی انتظامی معاملات کی نگرانی وہی کرتی تھیں۔ سلطان جہاں بیگم بہت دانش مند خاتون تھیں۔ وہ اور بادشاہ دونوں والدہ سلطان کے ہر فیصلے کو مانتے تھے۔

خدا خدا کر کے وہ مبارک دن آیا جب شہزادہ دانیال پورے اٹھارہ سال کا ہو گیا اور ایک مبارک ساعت دیکھ کر بارہ ربیع الاول کو عصر کی نماز کے بعد بادشاہ نے اپنی ملکہ اور والدہ کی موجودگی میں شہزادے کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ اعلان

بھی کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ شہزادے کی تعلیم جاری رہے۔ وہ دوسری زبانیں سیکھنے کے ساتھ ساتھ اُن ملکوں کا ادب بھی پڑھے، جو ان کے ہمسائے ہیں، کیوں کہ زبانیں اور ادب انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں۔ شہزادے کو علمِ نجوم اور پامسٹری کا بھی شوق تھا۔ چناں چہ اس کی دل چسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے بادشاہ نے بغداد اور یونان سے ان علوم کے ماہرین کو بلوایا۔ انھیں بہترین مراعات دیں، وظائف دیے اور ان کے لیے دربار میں الگ کرسیاں رکھوائی گئیں، کیوں کہ سلطان محمد فاروق اساتذہ اور اہلِ علم کا بہت قدر دان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس حکمران کو ایسے قابل لوگ مل جائیں، وہ بہت خوش نصیب ہوتا ہے۔ سلطان فاروق جانتا تھا کہ شہنشاہ اکبر جو زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا تھا اور اپنے باپ ہمایوں کی اچانک وفات کے بعد اسے کم عمری میں تختِ شاہی پر بیٹھنا پڑا۔ اس نے کم و بیش پچاس سال تک نہایت کامیابی سے نہ صرف حکومت کی، بلکہ رعایا کو بھی اپنا گرویدہ بنائے رکھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ وہ نہایت قابل، سمجھ دار اور عالم فاضل لوگ تھے، جو اپنے اپنے میدان میں یکتا تھے۔ جنھیں اکبر نے ''نورتن'' کا خطاب دیا تھا۔ شہنشاہ اکبر کے یہ نو انمول ہیرے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ بچو! ملا دو پیازہ، بیربل، راجا ٹوڈرمل، ابوالفضل، تان سین، عبدالرحیم خان خاناں اور فیضی۔ سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ یقیناً ان ذہین لوگوں کے بارے میں آپ کے استاد نے ضرور بتایا ہوگا۔

ہاں تو بادشاہ سلامت نے بھی ان قابل دماغوں کے لیے ان کے شایانِ شان خلعت اور مراتب عطا کیے، تاکہ شہزادہ دانیال بادشاہ بننے کے بعد اخوت، محبت اور بھائی چارے کے ساتھ رعایا کا دل جیتے۔ اس نے ایک ایسے بے نیاز شخص کو بھی اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا، جو رات کو عشا کی نماز کے بعد ایک بزرگ کے مزار پر چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا، جو کچھ نذرانہ یا رقم لوگ اس کی جھولی میں ڈال جاتے، وہ اسے سمیٹ کر کسی نہ کسی

غریب محلے میں چلا جاتا اور وہاں جو سب سے زیادہ مستحق ہوتا اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہتا:
"یہ لو میرے بھائی! اللہ میاں نے بھجوائے ہیں۔ یہ اللہ کی امانت ہے اور امانت کبھی نہ کبھی لوٹانی پڑتی ہے۔ خدا سے دعا کرنا کہ وہ تمھیں اس امانت کے لوٹانے کے قابل بنائے۔"

یہ غریب آدمی جسے لوگ بابا چینا کہتے تھے بادشاہ کے بلانے پر سپاہیوں کے ساتھ چلا تو گیا، لیکن درباری بننے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے وجہ جاننی چاہی تو اس نے بادشاہ سے کہا: "سلطان محمد فاروق آپ مجھے کیوں دربار سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں میں تو فقیر ہوں، بے وقعت، بے توقیر۔"

بادشاہ نے جواب دیا: "میں اپنے ولی عہد سلطنت شہزادہ دانیال کی طبیعت اور تربیت میں فقیروں جیسی عاجزی، انکسار اور قناعت بھی پیدا کرنا چاہتا ہوں، اس لیے تمھیں دربار کا حصہ بنانا چاہتا ہوں، تاکہ شہزادے کے دل میں بھی ایسے بے نیاز لوگوں کا احترام پیدا ہو سکے۔"

بادشاہ کی بات سن کر بابا چینا نے نہایت احترام سے کہا: "بادشاہ سلامت، خدا آپ کو صحت و تن درستی عطا فرمائے، کیوں کہ آپ ایک نیک دل بادشاہ ہیں۔ رعایا ہمیشہ آپ کی لمبی عمر کی دعا کرتی ہے، لیکن آپ نے شاید اسے میری گستاخی سمجھ رہے ہوں کہ میں نے آپ کو بادشاہ سلامت کے بجائے آپ کے اس نام سے پکارا، جو آپ کے والد محترم نے رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے آپ سے کوئی انعام و اکرام نہیں چاہیے۔ اس کائنات کا اصل بادشاہ خدائے بزرگ و برتر ہے۔ آپ زمین پر اس کے نائب ہیں اور بس۔"

بابا چینا سر اُٹھائے بادشاہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وزیر ڈر رہے تھے کہ سر جھکائے ہاتھ باندھ کر مؤدب کھڑے ہونے کے بجائے سیدھا کھڑا ہو کر کہیں یہ کسی سزا کا مستحق نہ قرار دے دیا جائے۔

''آگے کہو بابا چینا! کہ تم نے ہماری درخواست کیوں نہ قبول کی۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ آیندہ نسلوں کو ایک نیک اور قناعت پسند بادشاہ حکومت کرنے کو ملے؟'' بادشاہ نے خوش دلی سے پوچھا۔

بابا چینا نے تھوڑا سا سر جھکایا اور بولا: ''آپ ولی عہد کو قناعت، صبر اور سخاوت کا سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔ بزرگانِ دین سے محبت کرنی سکھانا چاہتے ہیں۔ ان سب کے لیے آپ نے مجھ ناچیز کا انتخاب کیا، لیکن کہتے ہیں کہ غلامی اور حکمرانی کی خصلت چالیس سال تک نہیں جاتی۔ تو آپ نے بھی حکمرانی کی خصلت سے مجبور ہو کر مجھے دربار میں سپاہیوں کے ذریعے طلب کیا۔ اگر آپ انکسار اور قناعت کو اولیت دیتے تو خود میرے پاس آتے۔''

بابا چینا کی بات سن کر سارے دربار پر سناٹا چھا گیا، لیکن سلطان کی والدہ نے یہ کہہ کر سب کو حیران کر دیا کہ بابا چینا سچ کہتا ہے، لیکن یہ میرے بیٹے سلطان محمد فاروق کی غلطی نہیں، بلکہ میری تربیت کی کوتاہی ہے۔ پھر سلطان کی والدہ بابا چینا سے مخاطب ہو کر بولیں: ''اچھا اب اس بات کی وضاحت کرو کہ تم نذرانہ اور نقد رقم دینے کے بعد امانت لوٹانے کی بات کیوں کرتے ہو؟ اور اس کا کیا مطلب ہے ہم جاننا چاہیں گے؟

''جی والدۂ سلطان! خدا آپ جیسی ماؤں کو سلامت رکھے۔ میں عرض کرتا ہوں۔ جس نذرانے کو میں اپنے مرشد کی درگاہ پر اکٹھا کرتا ہوں، اس کے لیے ایک دن پہلے وہ گھر ڈھونڈ لیتا ہوں، جو خودداری سے مجبور سفید پوشی کا بھرم بمشکل نبھا رہے ہیں۔ کبھی کبھی پورا پورا دن لوگ بھوکا رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ امانت لوٹانے کی حقیقت یہ ہے کہ یہ رقم ایک طرح سے صدقۂ جاریہ ہے۔ جب صاحب خانہ کے حالات اجازت دیں تو وہ یہ رقم امانت سمجھ کر کسی دوسرے غیرت مند مستحق خاندان کو دے دے۔''

بابا چینا خاموش ہوئے تو بادشاہ نے انھیں نشست پر بیٹھنے کو کہا اور کہا: ''ہمیں اپنی

غلطی کا احساس ہے۔ سچ ہے انسانوں کا احترام بہت ضروری ہے۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے سر اولیائے کرام کے آستانوں پر جھکتے ہیں۔ ہم یہ کیسے بھول گئے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنے استادِ محترم کو جاتے وقت جوتے خود اپنے ہاتھوں سے پہنایا کریں۔ مامون الرشید اس حکم پر عمل کرتا رہا اور دل سے اپنے اساتذہ کی عزت بھی کرتا رہا۔"

"جی میرے سلطان! میرا یہی مطلب تھا۔ جب شہزادہ دانیال آپ کو فقیروں اور بزرگانِ دین کا احترام کرتے دیکھیں گے تو خود بہ خود ان کے دل میں بے وسیلہ لوگوں کے لیے احترام اور محبت پیدا ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر آپ کب سے ہمارے پوتے شہزادے دانیال کو اپنی تربیت میں لینے کے لیے دربار سے وابستہ ہو رہے ہیں۔" والدۂ سلطان نے بلند آواز میں پوچھا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میری عاجزانہ رائے یہ ہے کہ آپ جس نیک مقصد کے لیے میری خدمات لینا چاہتی ہیں، اس کے لیے بہتر ہوگا کہ تین دن شہزادے محترم مغرب کی نماز میرے ساتھ درگاہ پہ ادا کرنے کے بعد کچھ وقت وہاں میرے ساتھ گزاریں، لیکن وہاں کسی کو بھی شہزادے کی اصلیت کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ وہ بالکل ایک عام عقیدت مند کی طرح وہاں وقت گزاریں گے اور ہفتے میں دو دن، میں دربار میں حاضر رہوں گا۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی کہ آپ نے مجھے شہزادے کی تربیت کے قابل سمجھا۔ یقیناً ہمارا ملک دنیا کا بہترین ملک کہلانے کا مستحق ہے۔ ہمارے بادشاہ صرف نام ہی کے فاروق نہیں ہیں، بلکہ یہ حقیقی معنوں میں اس ورثے کے مالک ہیں جو عدلِ فاروقی کہلاتا ہے۔ جہاں ایک عام آدمی بھی خلیفہ کا دامن پکڑ کر سوال پوچھ سکتا تھا۔"

درگاہ پہ آنے والوں نے دیکھا کہ بابا چینا کے قریب ہی ایک خوش شکل نوجوان

آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ بابا چینا کے معمولات اب بدل گئے تھے۔ وہ مغرب کی نماز کے ایک گھنٹے بعد وہاں سے اٹھ جاتا تھا۔ نوجوان بھی اس کے ساتھ ہی چلا جاتا تھا۔ عشا کی نماز سے پہلے وہ دوبارہ اپنی جگہ آن کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہفتے کے ان دو دنوں میں جب وہ صبح صبح دربار میں موجود ہوتا تو یہ بات خاص طور سے محسوس کرتا تھا کہ دو تین وزیروں کو جیسے اس کی موجودگی گوارا نہ ہو۔ اس میں ایک وزیر خزانہ تھا اور دوسرا بیت المال کا وزیر اور تیسرا وزیر اعظم یعنی بادشاہ کا معتمد خاص۔ ان تینوں کے مشوروں کو بادشاہ بہت اہمیت دیتا تھا۔ وزیر اعظم ابراہیم علی خان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ وزیر خزانہ سلطنت کے وزیر اعظم کا سالا تھا اور بیت المال کا وزیر عباس حیدر بادشاہ کا ہم مکتب اور دوست تھا۔ ان تین وزیروں کو ملکہ بادشاہ اور بادشاہ کی والدہ، تینوں اہم شخصیات کا اعتماد حاصل تھا۔ شاید اسی خصوصی اہمیت کے پیش نظر ان کو بابا چینا کا دربار میں توجہ حاصل کرنا کھٹکتا تھا۔

اسی طرح تقریباً ایک مہینا گزر گیا۔ جب مہینے کے اختتام پر شاہی خزانے سے ایک معقول رقم بابا چینا کو بطور معاوضہ دی گئی تو اس نے بغیر گنے رکھ لی۔ شام کو مغرب کے بعد شہزادے دانیال سے اس رقم کو تین برابر حصوں میں تقسیم کروالیا۔ ایک حصہ خود اپنی ضروریات کے لیے رکھ لیا اور بقیہ دو حصوں کو شہزادے سے کہا کہ وہ اس ماہانہ وظیفے کے لیے خود دو گھر تلاش کرے۔ شہزادے نے کہا کہ وہ ایسے گھر کیسے تلاش کر سکتا ہے، کیوں کہ اس نے آج تک کوئی غریب دیکھا ہی نہیں۔

بابا چینا نے کہا: "تمھارے بابا تم میں وہ خصوصیات دیکھنا چاہتے ہیں، جو ہمارے خلفائے راشدین میں تھیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ کا قول ہے کہ دریائے فرات کے کنارے اگر کوئی کتا بھی پیاسا ہے تو اس کی ذمے داری خلیفۂ وقت پر ہے۔ تم عام لوگوں کی زندگی کا مطالعہ

کرو تو بہت آسانی سے مطلوبہ مساکین کے گھر ڈھونڈ لو گے۔ اس کے لیے میں تمھیں پانچ دن دیتا ہوں۔ ٹھیک چھٹے دن، یعنی جمعہ کو آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ نے کیسے انھیں تلاش کیا۔''

''ٹھیک ہے بابا چینا، لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ اتنی کم رقم میں گزارہ کیسے کریں گے'' شہزادے نے تشویش سے کہا۔

''پہلے بھی تو کرتا تھا۔'' بابا نے مسکرا کر اُنگلی آسمان کی طرف اُٹھا کر کہا اور شہزادے کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

چھٹے دن جب شہزادہ خوش خوش درگاہ پہنچا تو بابا چینا نے کہا'' مجھے معلوم ہے تم اپنے مقصد میں کامیاب لوٹے ہو۔ اب یہ بتاؤ کیسے؟''

شہزادے نے جھک کر بابا کو تعظیم دی اور تفصیل سے بتایا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی روایت پر عمل کرتے ہوئے بھیس بدل کر گلیوں اور محلوں میں نکل گیا۔ کسی سے کچھ نہ کہا۔ بس ہر گھر کے دروازے پر دستک دی اور کھانے کے لیے کچھ مانگا۔ بعض جگہ سے لکا سا جواب مل گیا کہ ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے ہو۔ جاؤ جا کر کہیں کام کرو، محنت کرو۔ ہمارے نبیؐ نے بھیک مانگنے سے منع کیا ہے۔ بعض گھروں سے روٹی، بھجیا یا چنے مل گئے۔ ایک گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ صرف بچوں کے آہستہ آہستہ رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے دستک دی تو ایک نوجوان لڑکی نکلی اور بولی: ''میاں سائل! معاف کرنا میں اور میرے بہن بھائی خود بھوکے ہیں۔ باپ مر گیا ہے۔ میں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہوں۔ ابھی تک تنخواہ نہیں ملی ہے، اس لیے آج فاقہ ہے، لیکن میں تمھیں خالی ہاتھ نہ جانے دوں گی، رک جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر گئی اور گلاب کا ایک سرخ پھول توڑ لائی اور کہنے لگی کہ یہ مزاروں کی رونق بھی ہیں، سہرے کے لیے بھی، میت پہ بھی ڈالے جاتے ہیں اور اس سے گل قند اور عرق گلاب بھی بنایا جاتا ہے۔ پھول تو میں نے لے لیا، لیکن اس سے کہا کہ میں

چوں کہ اس شہر میں اجنبی ہوں اور مسافر بھی، کیا تم چند منٹ کے لیے مجھے اپنی والدہ محترمہ اور بہن بھائیوں سے ملوا سکتی ہو؟ اس نے کہا کہ وہ اپنی ماں سے اجازت لے کر مجھے اندر جائے گی۔ تھوڑی دیر میں وہ مجھے اندر لے گئی۔ ایک ٹوٹی ہوئی چار پائی پر ایک ادھیڑ عمر کی خوش شکل عورت لیٹی تھی۔ پاس ہی ایک تخت پر اس کے تین بھائی بہن بیٹھے تھے۔ میں نے جا کر اس عورت کو سلام کیا۔ کشکول میں سے وہ تمام کھانے پینے کی چیزیں نکال کر اس لڑکی کو دیں اور کہا کہ تم نے مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا، اس لیے میرا بھی فرض ہے کہ آج جو کچھ ملا ہے، وہ ہم مل بانٹ کر کھائیں۔ منع مت کیجیے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں اللہ کی طرف سے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے اس لڑکی کی والدہ کی طرف دیکھا تو انھوں نے بچی کو ہاتھ سے رضا مندی کا اشارہ دیا۔ لڑکی نے جو کچھ بھی تھا پلیٹوں میں نکالا اور سب نے خدا کا شکر ادا کر کے کھایا۔ اور وہ رقم جو لوگوں نے مجھے فقیر سمجھ کے دی تھی وہ اصرار کر کے میں نے اس کی والدہ کو یہ کہہ کر دی کہ جب ان کی بیٹی کی تنخواہ مل جائے تو واپس لے لوں گا۔

محل واپس پہنچ کر میں نے دو قابلِ اعتماد خادموں کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ اس گھرانے خصوصاً اس لڑکی کے متعلق تمام حالات کا پتا لگائیں، کیوں کہ کہیں سے بھی وہ جاہل نہ لگتی تھی۔ اس کی ماں کا لب ولہجہ بھی خاندانی عورتوں والا تھا۔ دونوں خادموں نے صرف ایک دن میں ہی معلومات اکٹھی کر لیں کہ اس لڑکی کا نام ماہ رخ ہے اور یہ ہمارے ایک سپاہی رحیم الدین کی بیٹی ہے، جس نے ایک جنگ کے دوران شہادت پائی تھی۔ سپاہی کے مرنے کے بعد ایک سال تک تو بیت المال سے ایک معقول رقم گھر والوں کو ملتی رہی۔ لڑکی اور اس کے بہن بھائی مکتب اور مدرسے میں پڑھتے بھی رہے، لیکن ایک سال بعد اچانک یہ وظیفہ بند کر دیا گیا اور کہا گیا کہ ایسا بادشاہ سلامت کے حکم پر ہوا ہے۔ تب سپاہی رحیم الدین کی بیوی جو ایک سپہ سالار کی بیٹی تھی، اس نے مکتب میں بچیوں کو فارسی اور عربی پڑھانے

کے ساتھ ساتھ گھر پر دست کاری سکھانا بھی شروع کر دی، لیکن اچانک گٹھیا کے درد نے اسے بستر تک محدود کر دیا، اس لیے ماہ رخ نے بھی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ بچی چار گھروں میں روزانہ کام کرتی ہے۔ ایک گھر میں کھانا پکاتی ہے، دوسرے میں صفائی کرتی ہے، برتن دھوتی ہے۔ تیسرے میں صرف صفائی کرتی ہے، لیکن چوتھے گھر میں کام کرنے کا کوئی معاوضہ نہیں لیتی، کیوں کہ وہ دو بوڑھے میاں بیوی ہیں، جن کا بیٹا اپنی بیوی کے کہنے میں آ کر انھیں چھوڑ گیا ہے اور جب سے گیا ہے، اس نے ماں باپ کی خبر بھی نہیں لی۔ ان دونوں کا گزارہ مرغیوں کے انڈوں پر ہے۔ ماہ رخ ان کی دیکھ بھال بھی کرتی ہے اور خدمت بھی۔ ان دونوں بزرگوں کے بارے میں خادم نے یہ اطلاع دی کہ بیٹا چاہتا تھا کہ اس کا باپ مکان اس کے نام کر دے۔ باپ نے کہا کہ مرنے کے بعد خود ہی مکان اس کے نام ہو جائے گا، لیکن بہو نے بیٹے کو بھڑکایا کہ یہ کام ان سے ابھی کروالو تو میں ساتھ رہوں گی، ورنہ نہیں، دیکھیں پھر کون انھیں پکا کر کھلائے گا۔ یہ کہہ کر وہ بچوں کو لے کر میکے چلی گئی۔ دو دن بعد بیٹا بھی چلا گیا۔ تب سے محلے والے دونوں میاں بیوی کا خیال رکھنے لگے، لیکن زیادہ دن نہیں۔ پھر ماہ رخ کی ماں نے ساتھ دیا اور اب یہی خاندان ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا ہے۔

''ان میاں بیوی کی گزر اوقات کیوں کر ہوتی ہے؟'' بابا چینا نے سوال کیا: ''صرف مرغیوں کے انڈوں کی فروخت سے تو پورا مہینا نہیں چل سکتا۔''

''بابا! یہ تو ابھی پتا نہیں چلا، لیکن دوسرا خاندان میں نے انھی کو منتخب کیا ہے۔ نام ہے ان کا پنڈت سکھ دیو۔ اس سے زیادہ معلومات فی الحال نہیں ہیں۔'' شہزادے نے جواب دیا۔

''شہزادے تم نے جی خوش کر دیا، لیکن سوال یہ ہے کہ ہر سپاہی کو اس کی خدمات کے بدلے ملازمت کے بعد بھی معقول وظیفہ ملتا ہے۔ اگر سپاہی نے دوران جنگ اپنی جان

کو نذرانۂ وطن کے لیے دیا ہو تو اس کے خاندان کو تاحیات وظیفہ ملتا ہے اور بچوں کے جوان ہونے پر انھیں دربار میں نوکری بھی ملتی ہے، لیکن یہاں تو معاملہ کچھ اور ہی ہے کہ سپاہی رحیم الدین کے خاندان کو صرف ایک سال بیت المال سے ایک مخصوص رقم دی گئی اور بس۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا پتا آپ کو چلانا ہے، لیکن یہ یاد رہے کہ یہ کام وزیرِ خزانہ اور وزیرِ بیت المال سے خفیہ رکھ کر کیا جائے، تاکہ آپ کو مشکلات پیش نہ آئیں۔''

شہزادے نے اسی رات بادشاہ سلامت سے اکیلے میں ملاقات کر کے تمام صورتِ حال انھیں بتائی۔ اگلے دن دربار میں بادشاہ نے حکم دیا کہ بیت المال کے اس حساب کا کھاتہ دکھایا جائے، جس میں مستحقین کے نام درج ہیں۔ ساتھ ہی ان سپاہیوں کی تفصیلات بھی طلب کیں، جو اب زندہ نہیں تھے۔ خادموں نے فوری طور پر وہ کھاتے حاضر کر دیے۔ بادشاہ نے ان سپاہیوں کے بارے میں جاننا چاہا، جن کو باقاعدگی سے وظیفہ ہر مہینے بھیجا جا رہا تھا۔ فہرست پڑھتے پڑھتے جب سپاہی رحیم الدین کا نام آیا تو دونوں باپ بیٹوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور بھی کھاتے اپنی تحویل میں لے لیے۔

دربار ختم ہونے کے بعد شہزادے دانیال نے باپ کی توجہ اس بات پر دلائی کہ ایک مخصوص اور معقول رقم جو سپاہی رحیم الدین کی اصل تنخواہ سے کچھ زیادہ تھی، پابندی سے ان کے گھرانے کو جا رہی تھی۔ ساتھ ہی رمضان اور عیدین پر بھی دوسرے شہدا اور معذور سپاہیوں کے گھروں کو دی جا رہی تھی۔ بادشاہ نے اپنے خفیہ کارندوں کے ذریعے رحیم الدین کی بیوہ اور بیٹی کے علاوہ ان تمام سپاہیوں اور ان کے لواحقین کو دو دن بعد دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا، جنھیں شاہی خزانے اور بیت المال سے کھاتے کے مطابق تنخواہیں اور وظیفے دیے جاتے تھے، لیکن اس تمام کارروائی کو وزیروں اور وزیرِ اعظم سے پوشیدہ رکھا گیا۔

دو دن بعد جب تمام وزیروں نے یہ منظر دیکھا تو حیران ہوئے۔ خاص طور پر وہ،

جو ان محکموں سے کرتا دھرتا تھے۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق باری باری ان ناموں کو پکارا جانے لگا جن کا اندراج ہر ماہ وظیفہ لینے والوں کے کھاتوں میں تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جن لوگوں کے نام پکارے جائیں، وہ سامنے آئیں۔ پہلے ان بیواؤں کے نام پکارے گئے، جن کے مرحوم شوہروں اور بیٹوں نے دورانِ جنگ وفات پائی تھی۔ ایسے خاندانوں کی تعداد ساٹھ تھی۔ ان میں ماہ رخ کا خاندان بھی شامل تھا، لیکن یہ جان کر سلطان محمد فاروق کو سخت صدمہ ہوا کہ سوائے چند خاندانوں کے کسی کو بھی ایک سال سے زیادہ وظیفہ نہیں ملا تھا اور یہ وہ خاندان تھے، جن کے بچے چھوٹے تھے یا جن کے گھر کوئی جوان بیٹا نہیں تھا، جب کہ ہر مہینے رقم کی وصولی کے لیے انگوٹھے کا نشان لگا تھا۔ شہزادہ دانیال نے سب سے پہلے ماہ رخ کی والدہ کو بلایا اور حقیقت جاننا چاہی تو انھوں نے بغیر کسی خوف کے وہی سب کچھ بیان کر دیا، جو مخبروں نے بتایا تھا۔ بقیہ خاندانوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ چند مہینے کے بعد وظیفہ بند کر دیا گیا تھا اور ہر ماہ وصول ہونے والی رقم سے ان کا کوئی لینا دینا نہیں۔ بادشاہ نے ان سب سے حلفیہ بیان لے کر ان خاندانوں کی پچھلی تمام رقوم فوری طور پر ادا کرنے کا حکم دیا اور آئندہ سے ان کے وظائف میں اضافہ کیا گیا۔ ساتھ ہی تمام زندہ، لیکن معذور سپاہیوں کی مراعات میں بھی اضافہ کیا گیا اور فوری طور پر وزیر شاہی خزانہ اور وزیر بیت المال کو ان کے عہدوں سے برطرف کر کے انھیں ان کے گھروں میں نظر بند کر کے تاحکم ثانی کسی سے بھی ملاقات کرنے سے روک دیا گیا۔ وقتی طور پر دونوں محکموں کا نگراں بابا چینا اور شہزادہ دانیال کو مقرر کر دیا گیا۔

خفیہ طور پر جو انتہائی اہم معلومات بادشاہ نے اپنے ایک معتمد خاص کے ذریعے سے حاصل کیں ان سے پتا چلا کہ یتیموں اور بیواؤں میں سے اکثریت کا وظیفہ بظاہر تو انھیں دیا جا رہا ہے، لیکن اصل میں یہ رقم وزیر خزانہ اور وزیر بیت المال کے قریبی دوستوں اور

رشتے داروں کو دی جاتی ہے، جس میں سے ایک مخصوص حصہ ہر مہینے خود ان دونوں وزیروں کے گھر جاتا ہے۔ پھر شہزادہ دانیال نے بابا چینا کی مدد سے خفیہ طور پر تمام کہانی معلوم کر لی۔ اب فیصلے کا وقت تھا۔ بادشاہ سلامت نے بابا چینا اور ان عالموں سے جو کسی نہ کسی علم کو سکھانے میں شہزادے کی مدد کر رہے تھے، مشورہ مانگا تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ سب سے پہلے ایمان دار لوگوں کا تعین کیا جائے اور رعایا کو جعل ساز وزیروں کی اصلیت بھی بتائی جائے۔ بابا چینا نے یہ بھی مشورہ دیا کہ محل کے چاروں دروازوں پر فریاد کے لیے ایک زنجیرِ عدل لگائی جائے۔ رعایا میں سے کسی کے ساتھ اگر کوئی ناانصافی یا زیادتی ہو تو وہ بلا کھٹکے اس زنجیر کو کسی وقت بھی ہلا کر بادشاہ کے حضور حاضر ہو سکتا ہے۔

بادشاہ نے دو دن بعد دربار طلب کیا اور ان تمام لوگوں کی موجودگی میں بے ایمان وزیروں کو ان کے عہدوں سے برطرف کیا۔ ان کے لیے سخت سزائیں تجویز کیں اور ان سے اس بے ایمانی کی وجہ جاننا چاہی۔ دونوں وزیروں نے ہاتھ جوڑ کر پہلے بادشاہ سلامت سے جان کی امان مانگی اور پھر بتایا کہ ایسا کرنے کے لیے انھیں وزیرِ اعظم ابراہیم علی خاں نے اُکسایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو اپنے عہدوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ نیز دونوں وزیروں نے اس سازش کا بھی انکشاف کیا کہ وزیرِ اعظم شہزادہ دانیال کو موت کے گھاٹ اُتار کر خود بادشاہ بننا چاہتے تھے۔ کام یابی کے بعد انھوں نے ایک وزیر کے بیٹے سے اپنی بیٹی کی شادی اور دوسرے کی بیٹی سے اپنے فرزند کی شادی بھی طے کر رکھی تھی، کیوں کہ سب آپس میں قریبی عزیز بھی ہیں۔ اس منصوبے پر بابا چینا کی وجہ سے ابھی تک عمل نہ ہو سکا، کیوں کہ وہ ہر دم شہزادے پر نظر رکھتے ہیں۔

اب معاملہ بالکل صاف تھا۔ وزیرِ اعظم نے بہت کوشش کی کہ وہ ان باتوں کو جھٹلا سکے، لیکن دونوں وزیروں نے اپنے اپنے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ قسم کھائی تو

پھر بادشاہ کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ بادشاہ نے وزیر اعظم کو کال کوٹھری میں ڈلوا دیا، تاکہ وہ کسی اور سازش کے تانے بانے نہ بن سکے۔

چند دن بادشاہ سلامت نے اپنی والدہ محترمہ، بابا چینا، شہزادے اور اس کے اساتذہ سے مشورے کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ امور مملکت چلانے کے لیے قابل بھروسا، اعلا تعلیم یافتہ اور اپنے میدان میں ماہر لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ رشتہ داریوں کی۔ ضروری نہیں کہ وزیر کا بیٹا بھی وزیر بنے۔ ہر قابل شخص کو حکومت میں شامل ہونے کا حق ہے۔ محض قابلیت، تدبر اور ہنر مندی کے بل بوتے پر موچی، لوہار، قسائی یا سبزی فروش کا بیٹا، بیٹی اعلا عہدے پا سکتے ہیں۔ کوئی بھی پیدائشی طور پر نہ کنجوا ہوتا ہے، نہ دھوبی، نہ بادشاہ، نہ وزیر۔ اچھی حکومت چلانے اور رعایا کے دل میں جگہ بنانے کے لیے مخلص اور ایمان دار لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بادشاہ کا کام اس جوہری کا سا ہے جو ہیرے اور کنکر پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بزرگ کہہ گئے ہیں کہ ''آدمی آدمی انتر، کوئی ہیرا کوئی کنکر۔'' والدہ سلطان نے بھی اس بات کی تائید کی۔ بادشاہ نے تمام عاملوں اور بابا چینا کو مکمل اختیارات دے کر ایک ماہ میں ایسے قابل نوجوانوں اور ادھیڑ عمر لوگوں کے ساتھ ساتھ ایسی خواتین کو سامنے لانے کو بھی کہا جو روزگار کی تلاش میں ہوں اور طے پایا کہ ان خواتین کا فیصلہ ملکہ سلطان جہاں اور بادشاہ سلامت کی والدہ خود کریں گی۔ اس کے ساتھ ہی پورے ملک میں اعلان کروا دیا گیا کہ تمام اہل علم اور ہنر مند اپنی تفصیلات محل میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اسی عرصے میں شہزادے کو پنڈت سکھ دیو کے بارے میں بھی آگاہی ہوئی کہ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے عالم ہیں۔ پہلے ایک مکتب میں تعلیم دیتے تھے، جہاں سے وزیر اعظم نے ان کی نوکری ختم کروا کر سفارش کی بنیاد پر ایک ایسے شخص کو لگا دیا تھا، جو صرف قرآن ناظرہ کی تعلیم دے سکتا تھا، باقی صفر تھا۔ ساتھ ہی ایسے بھی انکشافات ہوئے کہ

وزیراعظم اور اس کے دونوں بے ایمان وزیروں نے، راجپوتوں اور سکھوں کو ہٹا کر وہاں اپنے آدمی مقرر کر دیے تھے۔ وجہ یہ بتائی تھی کہ یا تو مسلمان ہو جاؤ یا نوکری چھوڑ دو۔ یہ بڑا بھیانک انکشاف تھا، اس بادشاہ کے لیے جو تمام رعیت کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔ ہر انسان خواہ اس کا مذہب کوئی بھی ہو، وہ اس مملکت کا شہری تھا اور ہر معاملے میں برابر کا حق دار تھا۔

اب تمام صورتِ حال کھل کر سامنے آ چکی تھی۔ پندرہ بیس دن کے بعد تمام علما اور اہلِ دانش نے آنے والی تمام درخواستوں کی جانچ پڑتال کی۔ لائق لوگوں کو دربار میں طلب کیا گیا۔ انھیں ان کے متعلقہ محکموں میں تعینات کیا گیا اور ساتھ ساتھ انتباہ بھی کیا گیا کہ اگر رعایا کی جانب سے کوئی شکایت موصول ہوئی اور تحقیقات کے بعد الزام درست ثابت ہوا تو فوراً برطرف کر دیا جائے گا۔ بابا چینا نے بادشاہ سلامت کی مرضی سے پنڈت سکھ دیو کو ان کے منصب پر بحال کروایا اور جہاں جہاں وزیراعظم نے غیر مسلموں کو ہٹا کر سفارشی بنیادوں پر مسلمان رکھ لیے تھے، ان کو برطرف کیا اور پورے ملک میں اعلان کروا دیا کہ زمین اللہ کی، ملک بادشاہ کا۔ یہاں کی رعایا خواہ کسی مذہب سے بھی تعلق رکھتی ہو، بادشاہ کے لیے اس کی اولاد کی طرح ہے۔ تمام لوگوں نے اپنے بادشاہ کے لیے سلامتی کی دعائیں مانگیں اور زنجیرِ عدل کا خیر مقدم کیا۔

شہزادہ دانیال نے ماہ رخ اور اس کے بھائی بہنوں کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ جاری کروا دیا۔ ماہ رخ کی والدہ کو ملکہ سلطان جہاں نے دست کاری کے اسکول کا نگراں مقرر کر دیا۔ پنڈت سکھ دیو ہر لمحہ ماہ رخ کو دعائیں دیتے تھے کہ سگی اولاد چھوڑ گئی اور اجنبی بچی نے ساتھ دیا۔ ماہ رخ منطق اور فلسفے کی تعلیم حاصل کر رہی تھی اور شاعری سے بھی اسے لگاؤ تھا۔ وہ حافظ شیرازی کا فارسی کلام اور شیخ سعدیؒ کی گلستان اور بوستان بہت شوق سے پڑھتی تھی۔

جب تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے تو ایک دن بابا چینا نے شہزادے

سے پوچھا کہ اس کے دل کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟ شہزادے نے جواب دیا: ''وہ ایک انصاف کرنے والا بادشاہ بننا چاہتا ہے اور ہر قیمت پر رعایا کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔''

بابا چینا نے کہا: ''ایسا تو تبھی ممکن ہے جب تم بادشاہ بن جاؤ اور جب تک سلطان محمد فاروق حیات ہیں تو اس بات کا کوئی امکان نہیں۔ ویسے بھی ماشاء اللہ وہ ابھی بوڑھے نہیں ہوئے اور صحت بھی ان کی بہت اچھی ہے۔''

شہزادے نے چونک کر بابا چینا کی طرف دیکھا اور بولا: ''کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے آپ کی بات سن کر۔''

''میرا مطلب ہے کہ کیا تمھارے دل میں اپنے والد محترم کو معزول کر کے یا قتل کر کے بادشاہ بننے کی خواہش تو نہیں پیدا ہوگئی؟ اگر ایسا ہے تو مجھے بے خوف ہو کر بتاؤ۔ میں اس معاملے میں تمھاری پوری مدد کروں گا، کیوں کہ تم مجھے بہت عزیز ہو۔''

شہزادہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھا اور درگاہ سے باہر جانے لگا۔ بابا چینا نے اسے دوڑ کر پکڑ لیا اور سینے سے لگا لیا۔ شہزادے نے رو کر کہا: ''خدا میرے بابا جان اور اماں جان کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر سلامت رکھے۔ بابا چینا! آپ نے ایسی بری بات میرے متعلق سوچی بھی کیسے؟ میں اپنے بابا سے بہت پیار کرتا ہوں۔ ان کی زندگی صحت اور تن درستی کی دعا ہمیشہ کرتا رہوں گا۔''

''بیٹا! میں تو تمھارا امتحان لے رہا تھا اور بس۔ خدا کا شکر ہے کہ تم اپنے امتحان میں سرخرو ہوئے۔ خدا تمھارے جیسی اولاد سب کو دے۔ آمین۔''

''مگر آپ یہ امتحان کیوں لے رہے تھے۔ کیا کوئی بیٹا کبھی اپنے باپ کا دشمن ہوسکتا ہے۔ آج آپ مجھے سچ سچ بتایئے کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور کسی کو بھی اپنے وطن یا خاندان کے بارے میں کچھ کیوں نہیں بتاتے؟ آپ نے ایک دفعہ وعدہ بھی کیا

بتا کر وقت آنے پر آپ سب کچھ بتا دیں گے۔ آج میں حقیقت جان کر دم لوں گا، ورنہ پھر کبھی آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔" شہزادے نے بابا چینا کے گھٹنے پکڑتے ہوئے کہا۔

بابا چینا نے نظریں اوپر اٹھائیں تو وہ سرخ ہو رہی تھیں۔ ٹپ ٹپ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے: "بتاتا ہوں، بتاتا ہوں شہزادے! بتاتا ہوں۔ آج میں جس فقیرانہ حال میں تمھارے سامنے ہوں، اس کی وجہ میرا اکلوتا بیٹا، میری بہن اور اس کی بیٹی ہے، جو اب میری بہو بھی ہے۔ میں ایک ملک کا بادشاہ ہوں۔ جب میرا بیٹا جوان ہوا تو میں نے اپنی سگی بھانجی کو اپنے بیٹے کی دلہن چن لیا۔ میری بیوی بھی خوش تھی۔ شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی، لیکن شادی کے صرف تین ماہ بعد ایک رات کچھ غدار وزیر میری خواب گاہ میں گھس آئے۔ ان کے ساتھ میری سگی بہن، میرا بیٹا اور بہو بھی تھے۔ سلطنت کا وزیراعظم اس سازش میں شریک تھا۔ انھوں نے تلوار سونت کر میرے سامنے ایک حکم نامہ رکھا اور کہا کہ میں ولی عہد کے حق میں دستبردار ہو جاؤں، ورنہ دونوں میاں بیوی کو مار دیا جائے گا۔ میری بیوی غش کھا کر بستر پر گر پڑی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ کل کا انتظار کریں۔ اس طرح معاملات بگڑ سکتے ہیں اور میرے بیٹے کو مشکلات پیش آ سکتی ہیں، لہٰذا کل دربارِ عام میں اس بات کا اعلان میں خود کروں گا اور اپنے ہاتھوں سے تاجِ شاہی اپنے فرزند کے سر پر رکھوں گا۔ میرا بیٹا بولا: اگر آپ مکر گئے اور ایسا نہ کیا تو؟

میری بہن نے آگے بڑھ کر کہا: "ٹھیک ہے، جب تک تم تخت سے دست بردار نہیں ہو جاتے، اس وقت تک تمھاری بیوی ہماری قید میں رہے گی۔" یہ کہہ کر اس نے غلاموں کو اشارہ کیا۔ وہ ملکہ یعنی میرے بیٹے کی ماں کو اس کے سامنے پکڑ کر لے گئے، لیکن میرا بیٹا اپنی دلہن کی طرف دیکھتا رہا۔

اگلے دن دربار منعقد ہوا تو میری بہن بھی وہاں موجود تھی، لیکن ملکہ، یعنی میری

بیوی نہیں تھی۔ میری اجازت سے وزیراعظم نے شہزادے کی ولی عہدی کے ساتھ ساتھ تمام شاہی اختیارات اس کو فوری طور پر منتقل کرنے کا حکم نامہ پڑھ کر سنایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے تمام اہلِ دربار اور رعایا سے اپیل کی کہ وہ ہمیشہ میرے بیٹے کا خیال رکھیں۔ یہ کہہ کر میں نے خود اپنے ہاتھوں سے خلعتِ فاخرہ اپنے بیٹے کے کاندھوں پر ڈالی اور تاجِ سلطانی اپنے سر سے اُتار کر اپنے جگر گوشے کے سر پر پہنایا۔ اس کی درازیٔ عمر کی خود بھی دعا کی اور درباریوں نے بھی میری تائید کی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تب نجانے کیوں قاضی صاحب بول اٹھے کہ ابھی شہزادے کو امورِ مملکت سیکھنے کے لیے آپ کی سرپرستی کی ضرورت تھی۔ آپ کو اتنی عجلت میں یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جنگی امور کے نگراں اور فوج کے بہادر سپہ سالاروں نے بھی قاضی صاحب کی بات کی تائید کی۔ اکثریت اس فیصلے پر حیران تھی کہ ایک ہی دن میں دنیا کیسے بدل گئی۔ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہر معاملے میں دانش مند وزیروں اور عمائدین سلطنت کے مشورے سے فیصلے کیے جاتے تھے، لیکن میں نے یہ کہہ کر سب کو مطمئن کر دیا کہ ہر باپ اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو بلند مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اتنا کہہ کر میں نے تین روزہ جشن کا اعلان کیا اور یہ آخری فرمان بھی جاری کیا کہ تین دن تک رعایا کو مفت کھانا ملے گا۔ ملک کے تمام مذبح خانوں، سرائے کے مالکوں اور پکوان بنانے والوں کو حکم دیا کہ وہ تین دن تک کسی کو بھی کھانا دینے سے منع نہ کریں۔ جو کچھ بھی اخراجات آئیں گے، اسے میری بہن جو میری سمدھن بھی ہے، پورا کرنے کی پابند ہوگی۔ دل کھول کر خوشیاں مناؤ اور غریبوں کو خیرات بانٹنے میں کنجوسی نہ دکھانا۔ خدا کرے میرا بیٹا ایک انصاف پسند اور صاحبِ عدل بادشاہ ثابت ہو۔ آمین۔

اتنا کہہ کر میں نے اپنے بیٹے کو گلے سے لگایا تو مجھے وہ بالکل اجنبی لگا، جیسے وہ مجھ

سے واقف ہی نہ ہو۔ جب میں دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھا تو میری بہن نے اعلان کروایا کہ اس کی خواہش ہے کہ بادشاہ اور ملکہ جلد ہی حج کی سعادت حاصل کرنے چلے جائیں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا کہ یہ کون ہوتی ہے ہمارے معمولات طے کرنے والی؟ لیکن وہاں اجنبیت کے سوا کچھ نہ تھا۔

اسی رات جب ملکہ کو دوبارہ خواب گاہ میں لایا گیا تو وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں، لیکن اس نے ایک بار بھی اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ جو قیامت اس پر سے گزر گئی تھی، اس کی پرچھائیاں پورے وجود سے ظاہر تھیں۔ ہم دونوں نے آپس میں بھی کوئی بات نہیں کی۔ مجھے یاد آیا کہ بہن کے بیوہ ہوجانے کے بعد میری بیوی نے اس کا پورا خیال رکھا تھا۔ اس کے چاروں بچوں کی تعلیم و تربیت شہزادے کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ مجھے چند رفیقوں نے بھانجی کو بہو بنانے سے بھی منع کیا تھا، لیکن ہم دونوں میاں بیوی نے کسی کی نہ سنی، کیوں کہ وہ میری چھوٹی بہن تھی، جو دو سال کی عمر میں والدین کے سائے سے محروم ہوگئی تھی۔ اسے ہم نے ماں اور باپ کا پیار دیا...... اور اس نے......؟ بابا چینا رونے لگے۔

''شاید اسی لیے آپ نے میری تربیت حضرت علی کے اس قول سے کی تھی کہ جس پر احسان کرو، اس کے شر سے بچو۔'' شہزادہ دانیال نے کہا۔

ہاں یہی حقیقت ہے...... پھر ہوا یوں کہ رات کے پچھلے پہر دروازے پر مخصوص دستک ہوئی، جسے میں بخوبی پہچانتا تھا۔ میں نے اٹھ کر آہستہ سے دروازہ کھولا تو چار جاں نثار اور وفادار دوست کھڑے تھے۔

''کیا ہوا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔ انھوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کیا اور جلدی سے اندر آ کر کہا کہ ملکہ اور میں فوراً ان کے ساتھ چلیں کیوں کہ ہماری جانوں کو

خطرہ ہے۔ ہم دونوں سر جھکائے ان کے ساتھ باہر نکلے۔ چور راستوں اور سرنگ سے ہوتے ہوئے ویرانے میں نکلے تو وہاں ایک یکّہ کھڑا تھا، جس کے چاروں طرف پردے بندھے تھے۔ انھوں نے ہمیں اندر بٹھایا، زر و جواہر کی تھیلیاں ہمارے سپرد کیں اور بتایا کہ آپ کی بہن اور وزیر نے آپ دونوں کے قتل کا حکم دے دیا ہے۔ حج کی کہانی بھی اسی لیے بنائی گئی ہے، تاکہ لوگوں کو شک نہ ہو کہ آپ لوگ اچانک کہاں غائب ہو گئے۔ پھر ان جاں نثاروں نے رتھ بانوں سے کہا کہ وہ بادشاہ اور ملکہ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں اور واپس آکر خبر دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی، اتنا کہا اور روتے ہوئے ہمارے ہاتھ چوم کر رخصت کیا تو ملکہ نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کے بیٹے کو اس کا علم ہے تو وزیر نے ایک بھیانک انکشاف کیا کہ شہزادہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ اس پر اس کی ساس اور بیوی نے جادو کروایا ہے۔ جادوگر یعقوب مصر کا مانا ہوا ساحر ہے۔ مختلف عملیات اور جادو کے ذریعے اس کو اپنے تابع کر لیا ہے، اس لیے وہ قصوروار نہیں ہے۔ آپ لوگ شہزادے کے لیے دعا کریں، وہ بالکل معصوم ہے۔ اتنا کہہ کر انھوں نے رتھ بانوں کو یکہ چلانے کا حکم دیا۔ ہم دونوں کاتب تقدیر کے آگے بے بس تھے۔ قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ انسان اپنی تقدیر نہ لکھ سکتا ہے، نہ بدل سکتا ہے۔ بس تماشائی کی طرح سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

رات بھر چلنے کے بعد جب صبح کی روشنی پھیلنے لگی تو رتھ بانوں نے یکہ روکا اور ہمیں اُترنے کو کہا، تاکہ کچھ کھا پی لیں۔ قریب ہی ایک سرائے نظر آ رہی تھی۔ انھوں نے ہمیں مسافروں کی طرح سرائے میں ٹھیرایا اور سامان جو نہ ہونے کے برابر تھا، لیتے چلے گئے۔ جب بہت دیر تک وہ زر و جواہر کی تھیلیاں لے کر واپس نہ آئے تو میں نے باہر نکل کر دیکھا...... وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ مال لے کر فرار ہو گئے تھے۔ خدا جانے کس جرم کی سزا پائی تھی یاد نہیں...... جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو چند اشرفیاں تھیں جو وفادار وزیر نے چپکے سے ڈالی

تھیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ دیکھو تقدیر کیا دکھاتی ہے۔ اندر جا کر جب ملکہ کو ایک اور تلخ حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا تو وہ تمام غموں سے نجات پا چکی تھی۔ سر اسنے کی چار پائی پر خاموشی سے سو رہی تھی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ وہ غموں سے نجات پا گئی۔ اسے دفنانے کے بعد میں نے اس درگاہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ پھر کسی رحم دل نے مجھے اپنے گھر میں ایک کمرہ رہنے کے لیے دے دیا۔ اس کے بدلے میں مجھے کوئی کرایہ نہیں دینا پڑتا، لیکن مجھے یہ بھیک گوارا نہیں تھی، لہٰذا میں نے اس کے دونوں بچوں کی تعلیم کی ذمے داری لے لی۔ دونوں بچے بڑے ہونہار ہیں۔ پندرہ اور بارہ سال کے ہیں۔ باقی کہانی تمھیں پتا ہے۔ یاد رکھنا اس دنیا میں سب سے زیادہ بے وفا چیز دولت ہے اور سب سے وفادار ساتھی آپ کی تعلیم ہے۔ ہنر مند اور پڑھا لکھا انسان سر اٹھا کے جی سکتا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ میں نے تم سے کیوں ایسا تکلیف دہ سوال کیا تھا؟ بابا چینا نے شہزادے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بیوی، یعنی ملکہ کی قبر کہاں ہے؟ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔'' شہزادے نے پوچھا۔ درگاہ کے قریب جو قبرستان ہے، وہاں ایک پکی قبر کے سرہانے رات کی رانی کا پودا لگا ہے، جسے میں روز پانی دیتا ہوں۔ اس کے سرہانے سبز رنگ کا ایک کپڑا بھی لہراتا ہے۔ جب میں مر جاؤں تو وہیں قریب میں دفن کر دینا۔'' بابا نے مسکرا کر شہزادے کو دیکھا اور رو پڑے۔

بابا چینا اب بادشاہ کے خاندان میں شامل تھے۔ والدۂ سلطان، ملکہ اور بادشاہ سب ان کی دکھ بھری کہانی سن کر افسردہ تھے۔ والدۂ سلطان نے بابا چینا سے سوال کیا کہ کیا ان کے دل میں کوئی ایسی بات ہے جو وہ کہنا چاہتے ہوں۔ تب بابا چینا نے کہا کہ ان کی دلی خواہش ہے کہ شہزادہ دانیال کی شادی ماہ رخ سے ہو۔ وہ ایک نیک لڑکی ہے۔ نیک ماں باپ کی بیٹی ہے۔ ذہین اور پڑھی لکھی ہے۔ بے شک وہ ایک سپاہی کی بیٹی ہے، لیکن

سمجھ دار اور وفادار ہے، لیکن اس کے لیے شہزادے کی مرضی جاننا بھی ضروری ہے۔"

بادشاہ سلامت نے شہزادے کی طرف دیکھا تو اس نے سعادت مندی سے سر جھکا دیا۔ ملکہ سلطان جہاں بیگم اور والدۂ سلطان نے بھی خوش دلی سے اس رشتے کی منظوری دی۔

اب یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ کا اصلی نام کیا ہے، آپ کہاں کے بادشاہ ہیں اور آپ کے بیٹے کا کیا نام ہے۔" سلطان محمد فاروق نے ادب سے ان سے پوچھا۔

میرا اصلی نام ظفر سلطان ہے اور میں ملک فارس کا بادشاہ ہوں۔ میرے بیٹے کا نام بختیار ظفر سلطان ہے۔ خدا اس کی حفاظت کرے۔ بابا چیتا نے اچانک روتے ہوئے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

......☆......

شہزادہ دانیال اپنی دلہن ماہ رخ کے ساتھ بابا چیتا کی قبر پر فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ شہزادے کی والدہ، دادی اور بادشاہ سلامت بھی اداس کھڑے تھے۔ والدۂ سلطان نے حکم دیا کہ بابا چیتا اور ان کی ملکہ کی قبریں پکی کی جائیں اور انھیں عالی شان مقبرے کی شکل دی جائے۔ مقبرے کے اندر ان کا شجرۂ نسب کندہ کیا جائے۔ ان کی داستانِ عبرت رقم کی جائے اور تمام کاموں سے فارغ ہو کر ان کے اکلوتے بیٹے کی خبر لی جائے۔ اگر وہ مصیبت میں ہے اور ظالموں کے چنگل میں پھنسا ہے تو اس کی مدد کی جائے۔

چند ماہ میں مقبرہ تیار ہو گیا۔ جس کے داخلی دروازے پہ جلی حروف میں لکھا تھا:

"جس پر احسان کرو، اس کے شر سے بچو"

پھر بھی احسان کرتے رہو کہ یہی انسانیت کی معراج ہے۔

☆☆☆
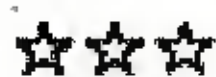
وہ میرا بیٹا نہیں ہے

ثمینہ پروین

رٹائرڈ جج مرزا راحت بیگ رات کو کسی بات پر غور کرتے ہوئے اپنی حویلی میں ٹہل رہے تھے۔ وہ اپنے نوکروں کے ساتھ اکیلے ہی رہتے تھے۔ ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا اور پچھلے دنوں ان کے جوان بیٹے کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے قریبی رشتے داروں میں سے اب کوئی بھی زندہ نہیں تھا۔ انھیں اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی، اس لیے انھوں نے اپنے بیٹے کی قبر حویلی کے ایک گوشے میں ہی بنالی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک ان کی نظر اپنے بیٹے کی قبر پر پڑی۔ انھیں محسوس ہوا جیسے قبر کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہے۔

''کون ہے وہاں؟'' انھوں نے زور سے پکارا۔

قبر کے پاس بیٹھا ہوا سایہ ہڑ بڑا کر اُٹھا اور باڑھ پھلانگ کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ آواز سن کر چوکیدار آیا تو انھوں نے پوچھا: ''کون آیا تھا یہاں؟''

''کوئی نہیں صاحب! میں تو گیٹ پر تھا۔'' چوکیدار نے صفائی پیش کی۔

مرزا صاحب چلتے چلتے بیٹے کی قبر تک پہنچ گئے۔ قبر کے اوپر گلاب کے تازہ پھول رکھے ہوئے تھے۔ کچھ اگربتیاں تھیں جنھیں جلانے کی مہلت اسے نہیں ملی تھی۔

مرزا صاحب نے چوکیدار سے کہا: ''دیکھو، یہ ابھی کوئی رکھ کر گیا ہے۔''

''ہوسکتا ہے، چھوٹے صاحب کا کوئی دوست ہو۔'' چوکیدار بولا۔

مرزا صاحب نے اس خیال کو مسترد کر دیا: ''دوست کو رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح آنے کی کیا ضرورت تھی...... اور پھر وہ گھبرا کر بھاگا کیوں؟''

چوکیدار نے کہا: ''وہ جو کوئی بھی تھا، یہاں سے آگے حویلی میں داخل نہیں ہوسکتا، آپ یہ باڑھ اونچی کرا دیں تو یہاں بھی کوئی نہیں آسکتا۔''

مرزا صاحب نے چوکیدار کو ہدایت کی: ''تم اس طرف کی سخت نگرانی کرو اور جو بھی ہو، اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔''

چار مہینے گزر گئے، پھر کوئی اس طرف نہیں آیا۔

ایک دن صبح دس بجے علاقے کے تھانے سے پولیس افسر کا فون آیا۔ اس نے مرزا صاحب سے کہا: ''مرزا صاحب ہم نے کچھ ڈاکوؤں کو گرفتار کیا ہے۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ پلیز، دس منٹ کے لیے تشریف لے آئیں۔''

مرزا صاحب تھانے پہنچے اور اس ڈاکو کو دیکھ کر چکرا گئے۔ وہ لڑکا ہو بہو ان کے بیٹے کی شکل اور اسی کی عمر کا تھا۔ اس نے 'پاپا' کہہ کر انھیں مخاطب کیا تو وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھنے لگے، لیکن پھر فوراً انھیں یاد آ گیا کہ ان کے بیٹے کا تو انتقال ہو چکا ہے۔

پولیس افسر نے ان دونوں کو آمنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور مرزا صاحب سے کہا: ''آپ دونوں تسلی سے بات کر لیں، ممکن ہے کوئی غلط فہمی ہو۔''

''پاپا! میں آپ کا شیراز ہوں۔ آپ اتنی جلدی کیسے بھول گئے مجھے یہاں سے گھر لے چلیے۔'' لڑکے نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

''تو تم میرے بیٹے کا نام بھی جانتے ہو، پھر تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ میرا ایک ہی بیٹا تھا جو چند مہینے پہلے مر چکا ہے۔ میں نے خود اسے قبر میں اتارا تھا۔ تم اس کے ہم شکل ہونے کا فائدہ اٹھا کر میری جائداد حاصل کرنا چاہتے ہو۔'' مرزا صاحب نے اسے اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر دیا۔

''پاپا! مجھے گھر کے قریب سے ان ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا۔ وہ مجھے سردار کے پاس لے گئے، جسے سب استاد کہتے تھے۔ مجھے یاد ہے سردار مجھے دیکھ کر چونکا تھا، پھر اس نے زبردستی اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔ میری کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔''

مرزا صاحب کسی طرح اس کی بات ماننے پر تیار نہیں تھے: "میں تمھاری اس کہانی پر کیسے یقین کرلوں؟ جسے تم استاد کہتے ہو، ممکن ہے اس نے میرے بیٹے کو کہیں دیکھ لیا ہو اور اسی وقت اس نے سوچا ہو کہ اس شکل کا ایک لڑکا میرے گروہ میں شامل ہے، اس لیے میرے اصل بیٹے کو اغوا کر کے اس کی جگہ تمھیں میرا بیٹا بنا دیا جائے، لیکن میرا بیٹا بیمار ہو کر مر گیا تو اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اب اس نے یہ چال چلی ہے۔"

لڑکا تقریباً روتے ہوئے بولا: "پاپا! مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا، جسے آپ اپنا بیٹا کہہ رہے ہیں، آپ کا بیٹا تو میں ہوں۔"

"اچھا، یہ بتاؤ تم پڑھتے لکھتے ہو؟ مرزا صاحب نے اسے آزمانے کا فیصلہ کیا۔

"پاپا! آپ ہی تو مجھے بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔ آپ نے مجھ پر چھوڑ دیا تھا کہ میں جس شعبے میں جانا چاہوں، جا سکتا ہوں اور پھر جب امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا تو آپ نے مجھے میری پسند کا کمپیوٹر خرید کر دیا تھا۔"

"یہ بات تمھیں کس نے بتائی؟" مرزا صاحب کا شک اپنی جگہ برقرار تھا۔

"صرف یہی نہیں، آپ جو کچھ پوچھیں گے میں ٹھیک ٹھیک بتاؤں گا، کیوں کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔" لڑکے نے اعتماد سے جواب دیا۔

"اچھا، تم میرے بیٹے ہو تو بتاؤ تمھاری ماں کا انتقال کب ہوا تھا؟"

"چار سال پہلے ...... اور اس کے ایک سال بعد آپ ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تھے۔ اسی سال میں نے کالج میں داخلہ لیا تھا۔"

"تمھاری تاریخ پیدائش کیا ہے؟"

"۲۹ فروری ۱۹۹۲ء۔"

"میرا بیٹا روزانہ پابندی سے ڈائری لکھتا تھا۔ شاید وہ ڈائری بھی تمھارے ہاتھ لگ

تھی، جس سے یہ ساری معلومات تمھیں حاصل ہو گئیں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میرا ایک ہی بیٹا تھا، جو مر چکا ہے۔ اب اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ مجھے اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی۔" مرزا صاحب نے اسے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کیا اور فوراً جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

گھر پہنچ کر وہ بڑی الجھن میں مبتلا ہو گئے۔ کبھی سوچتے کہ وہ میرے بیٹے کا ہم شکل ہے اس کو اپنا بیٹا بنا لیں، پھر خیال آتا کہ یہ سازش کے تحت بیٹا بننا چاہتا ہے، یہ ضرور نقصان پہنچائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ اپنی جائداد فلاحی ادارے کے نام کر دوں۔ سوچ سوچ کر ان کی بھوک پیاس اُڑ چکی تھی۔

اس دن شام کے وقت وہ لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر شخص گیٹ پر نظر آیا، جو چوکیدار سے اندر جانے کے لیے بحث کر رہا تھا۔ آخر چوکیدار اسے لے کر مرزا صاحب کے پاس آ گیا: "صاحب! یہ آپ سے ملنے کو آیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔"

انھوں نے اجنبی کا جائزہ لیا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا آدمی تھا جس کی عمر پچاس سال سے زیادہ لگ رہی تھی، لیکن اس کے ہاتھ پیر مضبوط تھے۔ چہرے پر بے ہنگم کالی سفید داڑھی پر مہندی کی سرخی بھی نمایاں تھی۔ سر کے بال بھی آدھے سفید تھے۔ چہرے سے وہ کچھ تھکا ہوا سا لگ رہا تھا۔

مرزا صاحب نے پوچھا: "کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟"

اجنبی دھیمے لہجے میں بولا: "آپ نے مجھے پہچانا نہیں جج صاحب! میں دلاور ہوں، استاد دلاور۔"

مرزا صاحب چونک اُٹھے۔ انھوں نے اخبار پہلو میں رکھا اور کرسی سے ٹیک لگا کر ماضی میں پہنچ گئے۔

دلاور نے پھر کہا: ''بیس سال پہلے آپ نے میرے بھائی کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ میں اس بات کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ آپ کے گھر کام کرنے والی ماسی کو پیسے دے کر میں نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسی سے مجھے پتا چلا کہ آپ کے ہاں اولاد ہونے والی ہے۔ پھر اسپتال میں کام کرنے والی ایک عورت کو بڑی رقم کا لالچ دیا تو اس نے بڑی چالاکی سے بچہ میرے حوالے کر دیا۔ میں اسے ڈاکو کے روپ میں آپ کے سامنے لانا چاہتا تھا۔''

مرزا صاحب نے کہا: ''اچھا، اب سمجھا۔ جو ڈاکو گرفتار ہوئے ہیں، وہ تمھارے کارندے ہیں۔ ان میں سے ایک میرا بیٹا ہونے کا دعوا کر رہا ہے...... اور تم یہ من گھڑت کہانی اسی لیے مجھے سنانے آئے ہو کہ میں اسے اپنا مان کر سب کچھ اس کے حوالے کر دوں۔ ایک بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میرا بیٹا پیدائش سے لے کر اپنی وفات تک میری نظروں کے سامنے رہا ہے۔''

دلاور نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھے: ''آپ اپنے جس مرے ہوئے بیٹے کی بات کر رہے ہیں، اس کی پرورش میں نے کی تھی۔ وہ مجھے اپنا ہی بیٹا لگتا تھا۔''

مرزا صاحب جھنجلا گئے: ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیا وہ میرا بیٹا نہیں تھا، جس کا انتقال میرے گھر میں ہوا تھا اور تھانے میں بند دولڑ کا میرا بیٹا ہے۔''

دلاور نے کہا: ''جو فوت ہو گیا، وہ بھی آپ کا بیٹا تھا اور جو تھانے میں بند ہے، وہ بھی آپ کا بیٹا ہے۔ آپ کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے، جو ہم شکل تھے۔''

مرزا صاحب کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

دلاور بولتا رہا: ''آپ کے جس بیٹے کو میں نے اپنا بیٹا بنا کر پالا تھا، مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ ایک دن نہ جانے کیوں میں نے اسے سچ سچ بتا دیا کہ تم میرے نہیں، ایک جج کے بیٹے ہو اور تمھارا ایک بھائی بھی ہے۔ یہاں تک کہ میں نے اسے آپ کے گھر کا پتا تک بتا دیا۔ وہ اپنے باپ اور بھائی سے ملنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ ایک بار وہ سخت بیمار

ہوگیا۔ اسی دوران وہ چپکے سے ڈیرے سے نکل کر اپنے باپ اور بھائی سے ملنے چل دیا۔ شاید وہ گھر تک پہنچ کر بے ہوش ہوگیا تھا اور آپ کے ملازم اسے آپ کا بیٹا سمجھ کر اندر لے گئے، جہاں ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ شاید آپ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔"

"ہاں، مجھے فون پر اس کی طبیعت خراب ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ مر چکا تھا۔" مرزا صاحب نے کہا۔

دلاور نے اپنی بات جاری رکھی: "آپ کا دوسرا بیٹا بھی اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ ادھر جب مجھے خبر ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ آہ کے گھر گیا ہوگا۔ میں نے اپنے کارندوں کو بھیجا کہ اسے پکڑ کر لائیں۔ جب میرے بھیجے ہوئے لوگ وہاں پہنچے تو انھیں شیراز نظر آ گیا اور وہ اسے میرا بیٹا سمجھ کر اٹھا لائے۔ میں شیراز کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔"

مرزا صاحب کا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ انھیں کچھ یاد آیا: "اس دن قبر پر پھول ڈالنے تم ہی آئے تھے؟"

"ہاں، وہ میں ہی تھا۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ اب میں آپ کے دوسرے بیٹے کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجرم میں ہوں کہ میں نے آپ کا ایک بیٹا چھینا اور دوسرے کو بھی چھیننا چاہتا تھا۔"

"تو تم اقرارِ جرم کر رہے ہو؟"

"ہاں، اور اب میں خود کو قانون کے حوالے کر رہا ہوں۔"

مرزا صاحب نے اسی وقت ڈرائیور کو آواز دی: "جلدی گاڑی نکالو، اسی وقت تھانے جانا ہے۔"

مرزا صاحب کی آنکھوں میں غم اور خوشی کے آنسو تھے۔ انھیں ایک بیٹے کی موت کا غم تھا اور ایک بیٹے کے مل جانے کی خوشی بھی تھی۔ ☆

حیاتیاتی ذرائع کے سبب پھیلنے والے وبائی امراض

احتیاطی تدابیر اور سدِّ باب

ہمدرد نونہال اسمبلی راولپنڈی .... رپورٹ : حیات محمد بھٹی

ہمدرد نونہال اسمبلی راولپنڈی میں عالمی یوم صحت سے متعلق منعقد ہونے والے اجلاس کے مہمانِ خصوصی محترم شہزاد عالم خان نیشنل پروگرام (پروفیشنل) عالمی ادارۂ صحت پاکستان تھے۔ رکن شوریٰ ہمدرد معروف براڈ کاسٹر محترم نعیم اکرم قریشی نے بھی خصوصی شرکت کی۔ اجلاس کا موضوع تھا:

''حیاتیاتی ذرائع کے سبب پھیلنے والے وبائی امراض - احتیاطی تدابیر اور سدِّ باب''

اسپیکر کے فرائض نونہال عمارہ حفیظ نے سر انجام دیے۔ تلاوتِ قرآن مجید اور ترجمہ نونہال حمزہ شبیر نے، حمد باری تعالیٰ نونہال عیشا مجید نے اور ہدیۂ نعت رسول مقبول نونہال ذیشان نے پیش کی۔ نونہال مقررین میں اریج یعقوب، اروما شہزاد، ایمن شہباز، حسن جمیل اور ذیشان حیات شامل تھے۔ اس موقع پر قومی صدر ہمدرد نونہال اسمبلی محترمہ سعدیہ راشد نے نونہالوں کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ ویکٹر (VECTOR) اُن حیاتیاتی ذرائع کو کہتے ہیں جو کسی متاثرہ انسان یا جانور سے بیماری کے جراثیم لے کر صحت مند انسانوں اور جانوروں میں منتقل کرتے ہیں۔ یہ مچھر، مکھی، کھٹملے اور دیگر کیڑے مکوڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ وبائی امراض زیادہ تر اُن علاقوں میں تیزی سے پھیلتے ہیں، جہاں پینے کا صاف پانی میسر نہ ہو اور گندے پانی کے نکاس کا انتظام ناقص ہو۔ بیماریاں منتقل کرنے والے حیاتیات کے سبب پھیلنے والی بیماریوں میں ملیریا اور ڈینگی جیسے مہلک امراض نے ان دنوں پوری دنیا کو فکر مند کر دیا ہے۔ پاکستان میں ڈینگی کا ذکر چند برس پہلے ہی سنا گیا اور اس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے مختلف تدابیر پر تیزی سے عمل کیا جا رہا ہے۔ ماحولیاتی تبدیلیاں بھی امراض کے پھیلنے کا ایک بڑا سبب ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں دنیا بھر کی حکومتوں، مختلف تنظیموں اور معاشروں نے اپنے اپنے طور پر وبائی

ہمدرد نونہال اسمبلی راولپنڈی میں محترم شہزادہ عالم خان،
محترم نعیم اکرم قریشی اور نونہال تقریر کر رہے ہیں۔

امراض سے بچاؤ کے لیے آگہی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) نے اس سال عالمی یوم صحت (۷-اپریل ۲۰۱۴ء) پر صحت کے اس اہم مسئلے کو اپنی آگہی مہم کا عنوان بنایا ہے اور ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان اس مہم میں عالمی یوم صحت کے شانہ بشانہ ہے۔

محترم نعیم اکرم قریشی نے کہا کہ یہ بہت اہم موضوع ہے۔ آج کل ہمارے یہاں مصنوعی خوراک (جس میں چپس اور جوس جیسی اشیا شامل ہیں) کا استعمال زیادہ ہو رہا ہے، جو صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ ہمیں اللہ کی بے شمار نعمتیں میسر ہیں، جن میں سے صحت ایک انمول نعمت ہے۔ ہمارے جسم اور اعضاء کا ہم پر حق ہے۔ ہم اسے آرام بھی دیں اور اس سے محنت طلب کام بھی کرلیں، مگر دونوں صورتوں میں ضروری ہے کہ میانہ روی کو اپنائیں۔

محترم شہزادہ عالم خان نے کہا کہ ہمارا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم بیماری کا مکمل علاج نہیں کراتے اور بیماری کے وقتی طور پر دب جانے پہ علاج چھوڑ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے بیماری پھر زور پکڑ لیتی ہے اور اس کے علاج پر کئی گنا خرچ بڑھ جاتا ہے۔ ہماری زیادہ تر بیماریاں اور مصیبتیں ہماری اپنی ہی لائی ہوئی ہیں، کیوں کہ ہم نے صفائی اور صحت مند رہنے کے اصولوں کو ترک کر دیا ہے۔

اس موقع پر نونہال شہیر سرفراز نے ایک خوب صورت ملی نغمہ پیش کیا۔ نونہالوں نے ایک پُر اثر خاکہ پیش کیا۔ انعامات تقسیم کرنے کے بعد آخر میں دعاے سعید پیش کی گئی۔

ہمدرد نونہال اسمبلی لاہور .... رپورٹ : سید علی بخاری

عالمی ادارۂ صحت ۷- اپریل ۱۹۴۸ء سے ہر سال صحت کا عالمی دن مناتا ہے، جس کا بنیادی مقصد لوگوں کو صحت کی اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ اس دن کو منانے کا مقصد عوامی سطح پر مختلف بیماریوں سے بچاؤ کے لیے آگاہی پیدا کرنا ہے۔ ہر سال یہ ادارہ صحت کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمی سطح کے لیے ایک موضوع کا انتخاب کرتا ہے۔ صحت سے متعلق مختلف اہم موضوعات پر تواتر کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے۔

رواں سال یہ موضوع "حیاتیاتی ذرائع کے سبب پھیلنے والے وبائی امراض" تھا۔ بائیس سال پہلے شہید حکیم محمد سعید نے انٹرنیشنل چلڈرن اینڈ یوتھ ہیلتھ کانفرنس کا انعقاد شہر کراچی سے کیا۔ اب ہر سال مختلف شہروں میں اس کانفرنس کی شمع کو روشن کیا جاتا ہے، تاکہ صحت سے متعلق پاکستانی معاشرے کی ذہن سازی کی جائے۔ گزشتہ دنوں تیئسویں سالانہ انٹرنیشنل چلڈرن ہیلتھ کانفرنس منعقد کی گئی، جس کی صدارت عالمی ادارۂ صحت کے نیشنل پروفیشنل آفیسر آف ملیریا کنٹرول پروفیسر ڈاکٹر قطب الدین کاکڑ نے فرمائی۔

مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے منسٹر آف اسٹیٹ فار ہیلتھ سائنسز ریگولیشن اینڈ کوآرڈینیشن حکومت پاکستان محترمہ سائرہ افضل تارڑ اور چیئرمین ریڈ کریسنٹ سوسائٹی ڈاکٹر سعید الٰہی نے شرکت کی۔

صدر ہمدرد فاؤنڈیشن محترمہ سعدیہ راشد، متولیہ ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان محترمہ فاطمہ منیر احمد، محترمہ ڈاکٹر ماہم منیر احمد و دیگر شریک ہوئے۔ کانفرنس میں مختلف ممالک اور پاکستان بھر سے خصوصی طور پر شرکت کرنے والے نونہال مندوبین نے خطاب کیا، جن میں شانزے سرفراز، سمیت اکرام، سرمد ستار، دانیال خان، حنیفہ شیخ، عروہ شہزاد، عرج یعقوب، محمد شہریار شاہد، سدرہ امتیاز، حافظ احمد طارق، نیشا زبیر، ارباز خان، مشرف ممتاز جب کہ بیرونِ ملک سے عبدالرحیم نیوزر (سعودی عرب)، یوتھمیت میید ولد (سری لنکا)، محمد عرتزا اسرور (بنگلہ دیش)، بابیہ سلطانی (ایران)، بہادر میرت اُنور (ترکی)، نورفتین حافظ دین (ملائیشیا) شامل تھے۔

ہمدرد نونہال اسمبلی لاہور میں "صحت کا عالمی دن" کے سلسلے میں
ہونے والی تقریب میں شریک مہمان اور نونہال مقررین

محترمہ سائرہ افضل تارڑ نے کہا کہ جراثیم کے ذریعے پیدا ہونے والی بیماریاں دنیا بھر میں ہر سال دس لاکھ سے زائد اموات کا باعث بنتی ہیں۔ حکومت ڈینگی اور ملیریا کے مسئلے سے پوری طرح آگاہ ہے اور ان جراثیم پھیلانے والی بیماریوں پر قابو پانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ انھوں نے شعور و آگہی کے سلسلے میں ہمدرد فاؤنڈیشن کے کردار کو بھی سراہا۔ ☆

دیوی کی آنکھیں

انوشہ نوید

کالے کالے جسموں والے آدمی لمبے لمبے نیزے اُٹھائے ہوئے چاروں طرف دکھائی دے رہے تھے۔ مہمان کے بجائے اب میں ان کا قیدی تھا۔ میں نے اس حالت میں خود کو بہت ہی مجبور محسوس کیا۔ حماقت میری ہی تھی، جس کا نتیجہ مجھے بھگتنا پڑ رہا تھا۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے، جب بنگلہ دیش ہمارے ملک کا حصہ تھا اور مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔ سیر و تفریح کی غرض سے میں اپنے ایک دوست ارشاد کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ ایک کیمرا بھی ہم ساتھ لے گئے تھے کہ یادگار مقامات کی تصویریں کھینچ سکیں۔

ہرے بھرے ساحلی شہر چاٹگام میں ہم اپنے ایک عزیز کے گھر ٹھیرے۔ وہیں

ہمیں چکما قبیلوں کے بارے میں پہلی بار معلوم ہوا۔ یہ قبیلے چاٹگام ہلز کے دامن میں پھیلے ہوئے بہت بڑے جنگل میں رہتے تھے۔ پتا چلا کہ اس جنگل کے کئی حصے ہیں۔ اس کے ایک حصے میں خطرناک جانور پائے جاتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے وہاں نوٹس بورڈ بھی لگے ہوئے تھے کہ کوئی گھومنے پھرنے والا ادھر نہ جائے۔ قبائلیوں کی بستیاں جنگل کے اس

حصے سے دور تھیں اور وہاں تک جانا مشکل بھی نہیں تھا۔ ان میں زیادہ تر قبیلے مسلمان تھے، اس لیے بھی میری ہمت بندھی۔ شروع ہی سے مجھے سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ قبیلے مہمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، چاہے مسلمان ہوں یا ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ساری ضروری معلومات حاصل کر کے ہم ایک جیپ کے ذریعے سے اس علاقے میں پہنچ گئے۔

میں اور میرا دوست ارشاد، ہم دونوں ہی ایک قبیلے کے مہمان بن کر بہت خوش تھے۔ ہمیں اس وقت خبر نہیں تھی کہ ہم جلد ہی ایک بڑی مصیبت میں گھر جائیں گے۔ ارشاد کو بھی میری طرح تصویریں کھینچنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے اسی شوق کی وجہ سے میں اس وقت جانوروں جیسی آوازیں نکالنے والے اور زور زور سے ڈھول بجا کر ناچتے ہوئے سیاہ جسموں کے درمیان بے بس اور حیران بیٹھا تھا۔ ارشاد میرے قریب ہی بیٹھا ہوا تنکے سے زمین کرید رہا تھا۔ ملزموں کی حیثیت سے ہمارے ساتھ اسی قبیلے کے تین آدمی بھی تھے۔ ہم سب پر اس قبیلے کی دیوی بھوانی کی آنکھوں میں جڑے ہوئے قیمتی ہیرے چرانے کا الزام تھا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اللہ جانے میرا کیا حشر ہو کہ دور سے اس قبیلے کے پجاری کو آتے دیکھا۔ وہ ان کالے جسم والوں سے الگ، ہماری ہی دنیا کا آدمی تھا۔ اس

علاقے میں مجھے وہی امید کی ایک کرن معلوم ہوا۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو یہی پجاری بڑی محبت سے ملا تھا۔ اس نے چاٹگام، ڈھاکا اور دوسرے بہت سے شہر دیکھے تھے۔ وہاں وہی ایک ایسا آدمی تھا جس نے شہروں کے رہن سہن کی جھلک دیکھی تھی، جہاں لوگ سائنسی انداز میں سوچتے اور نئی ایجادات کی مدد سے کام کرتے ہیں۔

''ناصر میاں!'' پجاری نے قریب آ کر مجھے مخاطب کیا اور میرے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے بے زاری کے ساتھ پجاری سے پوچھا: ''اب ہمارا انجام کیا ہوگا؟ بھوانی دیوی کی آنکھوں سے ہیرے چرانے کے الزام میں کیا قبیلے والوں کے ساتھ ساتھ ہمارے جسموں کو بھی نیزوں میں پرو دیا جائے گا یا سر کاٹ کر......''

پجاری نے ہنس کر بات کاٹ دی اور بولا: ''نہیں، آج کی اس تقریب کا مقصد اصل مجرم کو پکڑنا ہے۔''

میں نے کہا: ''اصل مجرم کیسے پکڑا جا سکتا ہے؟ ثبوت کہاں سے لاؤ گے تم؟ نہ یہاں پولیس کا عملہ ہے، نہ انگلیوں کے نشانات دیکھ کر مجرم کا پتا لگانے والے موجود ہیں، نہ کوئی ایسا گواہ ہے جس نے کسی کو ہیرے چراتے دیکھا ہو۔''

پجاری دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہنے لگا: ''یہاں پر یہ سب نہیں چلتا۔ یہاں سیاہ اور سفید، سچ اور جھوٹ کو جانچنے کے طریقے الگ ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے معلوم ہے کہ تم اور تمھارا دوست خواہ مخواہ اس چکر میں پھنس گئے ہو۔''

قریب ہی بیٹھا ہوا ارشاد غصے سے بول اُٹھا: ''ناصر سے میں نے کہا تھا کہ اس مورتی کی تصویر کھینچنے کے لیے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں۔ تصویر رات کو یا دن میں کسی

وقت بھی کھینچی جا سکتی ہے۔ پھر بھی یہ ضد کرنے لگا کہ رات کے وقت ہی تصویریں کھینچیں گے۔ رات کو چاند کی مدھم روشنی میں مورتی زیادہ پُر اَسرار نظر آئے گی۔ اسے تو ایسی تصویریں جمع کرنے کا جنون ہے۔ رات کو قبیلے کے سردار کی اجازت لے کر یہ مجھے بھی اپنے ساتھ وہاں لے گیا۔ بدقسمتی سے اسی رات ہیرے بھی چوری ہو گئے، الزام تو ہم سب پر آیا۔ دن کو مورتی کی تصویریں کھینچ لیتے تو آج یوں قیدی بنے نہ بیٹھے ہوتے۔'' اپنی بات پوری کرنے کے بعد ارشاد بہت دیر تک بڑبڑاتا رہا۔

خوف زدہ کر دینے والی ڈھول کی تھاپ بدل گئی اور ایک نئی دُھن پر ناچ شروع ہو گیا۔ پجاری نے چونک کر میدان میں ناچنے والوں پر نظر ڈالی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

ارشاد نے ڈری ہوئی آواز میں پجاری سے پوچھا: ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

پجاری بولا: ''رسم شروع ہونے والی ہے۔ تم لوگ بھی تیار ہو جاؤ۔''

ارشاد نے جھرجھری لی اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد نعروں کا شور بلند ہوا۔ سیکڑوں اُچھلتے کودتے قبیلے والوں کے درمیان سردار مسکراتا ہوا آیا اور درختوں کے تنوں سے بنے تخت پر جا بیٹھا۔ نعروں کی آوازیں دھیمی ہوتی گئیں اور ڈھولوں کی دھمک اچانک بڑھ گئی۔ رقص کرنے والے لنگوٹیاں باندھے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں سے پسینا پانی کی طرح بہ رہا تھا۔ چند لمحے اور گزرے تھے کہ تخت کے پیچھے سے چند عورتیں سامنے آ گئیں۔ ان عورتوں کے ہاتھوں میں پیالے تھے۔ ان پیالوں کو عورتوں نے سب قیدیوں کے آگے رکھ دیا۔

تخت پر بیٹھا ہوا سردار اُٹھا تو ایک دم ڈھولوں کی تھاپ بند ہو گئی۔ ناچتے ہوئے قبائلی رک گئے۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر تک سردار قبائلی زبان میں تقریر کرتا رہا،

جس کے چند الفاظ ہی میری سمجھ میں آئے۔ یہ عام بول چال کے الفاظ تھے جو چند روز میں ہر کوئی سیکھ لیتا ہے، مگر ان الفاظ سے میں سردار کی تقریر کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ یہی حال ارشاد کا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا: ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

میں اسے چھیڑنے کے لیے بولا: ''میرا خیال ہے، اسے تم پر شبہ ہے کہ ہیروں کی چوری میں تمھارا ہاتھ ہے۔''

یہ سنتے ہی ارشاد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا: ''ناصر! مجھ سے اس طرح کا مذاق کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے وہ ہیرے نہیں چرائے۔ کسی نے تمھاری بات سن لی تو ابھی میری گردن اُڑا دی جائے گی۔''

میں بولا: ''تم تو برا مان گئے۔ میں تو ہنس بول کر اپنا اور تمھارا خوف کم کر رہا ہوں۔''

اسی لمحے سردار کی تقریر ختم ہونے پر پجاری تخت کے نیچے کھڑا ہو کر بولنے لگا:

''قبیلے کے محترم سردار نے ابھی جو تقریر کی ہے، اپنے مہمان دوستوں کے لیے میں اس کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ کل رات کسی نے اس قبیلے کی دیوی بھوانی کی آنکھوں میں جڑے ہوئے ہیرے چرا لیے ہیں۔ یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ مورتی کے وہ ہیرے اس بستی کی عزت ہیں۔ قبیلے والوں کو ان بائیس آدمیوں پر شک ہے، جن میں باہر سے یہاں آنے والے دو مہمان بھی شامل ہیں۔ بستی کے بیس آدمی کل رات عبادت کے لیے مورتی کی طرف گئے تھے۔ دونوں مہمان تصویریں کھینچنے کے لیے رات وہاں پہنچے تھے۔ سب کو معلوم ہے کہ جنگل کے اس حصے کے درخت کاٹ دیے گئے ہیں اور اسے عبادت گاہ کا درجہ حاصل ہے۔ نشانی کی خاطر وہاں ایک دیوار بنا دی گئی ہے، جس میں دروازہ ہے۔ اسی دروازے سے گزر کر

عبادت کرنے والے مورتی تک پہنچتے ہیں۔ ان بائیس آدمیوں میں سے ہر ایک نے عبادت گاہ میں کچھ الگ الگ وقت گزارا ہے۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے الگ الگ وقت میں عبادت کرنے گئے تھے۔ دونوں مہمان بھی باری باری اس عبادت گاہ میں اکیلے رہے تھے، کیوں کہ یہ مورتی کی تصویریں لینا چاہتے تھے۔ ایسی صورت میں پورے قبیلے کو ان بائیس آدمیوں پر شک ہے، کیوں کہ رات بارہ بجے عبادت گاہ میں داخل ہونے کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ دروازے کے علاوہ کسی اور طرف سے عبادت گاہ میں جانا جرم ہے اور وہاں پہرے دار بھی رہتے ہیں۔ جھوٹ اور سچ کا پتا چلانے کے لیے ایک شربت تیار کیا گیا ہے، جسے تمام ملزم پییں گے۔ قبیلے والے گواہ ہیں کہ یہ شربت برسوں سے سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرتا آیا ہے۔ یہ آدمی کی روح پر اثر کرتا ہے اور اسے سچ بولنے پر مجبور کرتا ہے۔''

پجاری کی تقریر جاری تھی کہ میں نے قریب ہی بیٹھے ہوئے ارشاد پر نظر ڈالی۔ وہ بھی میری طرح پجاری کی اس احمقانہ بات پر مسکرایا تھا، جس کے تحت اس نے شربت کو سچ اور جھوٹ کی کسوٹی بتایا تھا۔

اب وہ پجاری کہہ رہا تھا: ''یہ روحانی شربت آدمی کی روح میں سچ کی قوت کو جگا دیتا ہے۔ اس کے پینے سے آدمی کے اندر چھپا ہوا شیطان زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنے مہمانوں کو میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ شربت پینے کے بعد اصل مجرم کے پیٹ میں بہت زور کا درد ہوگا۔ اس کی آنتیں کٹنے لگیں گی اور دل کے قریب سیاہی چھا جائے گی۔ باقی ملزموں کے پیٹ میں یہ شربت پینے کے بعد ہلکا سا درد ہوگا، لیکن اصل مجرم کچھ ہی دیر میں درد سے تڑپنا شروع کر دے گا۔''

اس موقعے پر میں نے ارشاد سے سرگوشی کی: ''میں یہ شربت نہیں پیوں گا۔ نہ جانے کون کون سی جڑی بوٹیوں سے اسے تیار کیا گیا ہوگا۔ یہ شربت پی کر مجرم نہ ہونے کے باوجود بھی میں کہیں مر نہ جاؤں۔''

ارشاد نے میری بات سن کر اطمینان سے کہا: ''ذرا اپنے پیچھے نظر ڈالو۔''

میں نے مڑ کر دیکھا، نیزہ سنبھالے ہوئے ایک کالا آدمی چوکس کھڑا تھا۔

ارشاد بولا: ''شربت تو ہمیں پینا پڑے گا۔ ہم نے اگر انکار کیا تو بھی یہ ہمیں مجرم سمجھ لیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟ یہ لوگ دیوی کی آنکھیں نکالنے کے جرم میں ہماری آنکھیں نکال کر ہمیں مار ڈالیں گے۔''

میں نے بے چینی سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بولا: ''لیکن پجاری کی تقریر تم نے بھی سنی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جن لوگوں پر شبہ ہے، ان کے پیٹ میں بھی ہلکا سا درد ہوگا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ درد ہوگا تو سب کے پیٹ میں برابر ہوگا، ورنہ کسی کو تکلیف نہیں ہوگی۔''

ارشاد نے اکتائی ہوئی آواز میں کہا: ''میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں تو شربت پی لوں گا، پھر دیکھا جائے گا۔''

رقص دوبارہ شروع ہو گیا اور قبائلی ڈھولوں کی تھاپ پر تھرکنے لگے۔ ذرا دیر بعد سردار کے اشارے پر پھر خاموشی چھا گئی۔ تخت کی دائیں جانب سے ایک لمبا چوڑا آدمی سامنے آیا۔ لنگوٹی باندھنے کے علاوہ اس کی گردن میں ایک سرخ کپڑا پڑا ہوا تھا۔ اس لمبے آدمی نے کڑک دار آواز میں کوئی حکم دیا۔ اگلے ہی لمحے پجاری کی آواز گونجی، اس نے

ہمیں مخاطب کیا: "اپنے سامنے رکھا ہوا شربت پی جاؤ۔"

میں نے ارشاد کی طرف دیکھا، وہ یوں مسکرایا، جیسے اس قبیلے کی رسم کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ اس نے پیالہ اٹھایا اور شربت پینا شروع کر دیا۔ عین اسی وقت مجھے اپنی کمر میں چبھن محسوس ہوئی۔ میرے پیچھے جو کالا آدمی کھڑا تھا، اس کا نیزہ میرے جسم سے آ لگا تھا، جیسے وہ دھمکی دینا چاہتا ہو کہ اگر میں نے شربت نہ پیا تو نیزہ جسم میں پیوست کر دے گا۔

میں نے مجبوری کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لکڑی کا پیالہ اُٹھاتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میرا دل کس قدر کم زور ہے۔ مجرم نہ ہو کر بھی میں خوف زدہ تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ شربت سچ مچ جھوٹ اور سچ کو پرکھنے کا ذریعہ ہے۔

اپنی ساری ہمت جمع کر کے میں نے بے رنگ شربت کا پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیا۔ باقی ملزم اپنا اپنا شربت پی کر مجھ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، جیسے میں نے ہی ہیرے چرائے ہیں۔

درد دھیرے دھیرے شروع ہوا۔ مجھے پجاری کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ اصل مجرم کے علاوہ باقی ملزموں کے پیٹ میں بھی ہلکا سا درد ہوگا۔ میں اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے مسکرایا اور قبیلے والوں کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ شکلیں بنائے خاموش بیٹھے تھے۔ ارشاد سر جھکائے تنکے سے زمین پر لکیریں بنائے جا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنا دھیان بٹانے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔

میرے پیٹ کا درد آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ شربت نے میری آنتوں میں جلن سی پیدا

کر دی تھی۔ مجھے اپنی بے گناہی کا یقین تھا۔ اسی یقین کی وجہ سے میں وہ جلن برداشت کر گیا۔

اس مورتی کی کچھ تصویریں میں نے اور ارشاد نے کھینچی تھیں۔ باری باری ہم دونوں وہاں گئے تھے۔ مورتی کی آنکھوں سے ہیرے نکالنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں بھلا ایسی حرکت کیوں کرتا؟ ارشاد کی طرف سے بھی میرا دل صاف تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ درد زور پکڑتا گیا۔ یوں لگا جیسے کوئی میرے معدے کو ہاتھ میں لے کر مسل رہا ہو۔ میں نے ارشاد کو دیکھا۔ اس کے چہرے سے بھی تکلیف ظاہر ہو رہی تھی، مگر وہ ابھی تک سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بیں قبیلے والے ایک قطار میں بیٹھے ہوئے ایک ہی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ اِدھر ہی ان کی عبادت گاہ تھی۔ میں نے سوچا، شاید وہ اپنے عقیدے کے مطابق دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔

درد کو چھپانے کے لیے میں حوصلے کے ساتھ سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ میں پُرسکون نظر آؤں۔ اندر سے میری حالت غیر تھی۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی میرے معدے کو چاقو سے کھرچ رہا ہے۔ پیٹ میں جیسے زخم بنتے جا رہے تھے۔ درد اتنی زور کا تھا کہ مجھے اپنی چیخیں روکنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے لکڑی کے تخت پر بیٹھا ہوا سردار، تخت کے ایک طرف کھڑا ہوا پجاری اور اردگرد کھڑے قبائلی میری نگاہ میں دھندلے پڑنے لگے۔ درد اب پیٹ سے میرے دل کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے کھڑی ہوئی عورتوں کو دیکھا۔ ان کے ہیولے میری نگاہ کے سامنے کبھی دھندلا جاتے، کبھی صاف ہو جاتے۔ میں نے دعا کی اور خود کو اللہ کی پناہ میں دے دیا۔

ابھی سورۃ الناس کے آخری الفاظ میری زبان سے ادا ہوئے تھے، اسی لمحے

میرے ساتھ بیٹھا ہوا ارشاد اپنا پیٹ پکڑ کر چیخنے لگا: ''اے پجاری! اے سردار! مجھے معاف کر دو۔ میں نے اس مورتی کی آنکھوں سے ہیرے چرائے تھے۔ مجھے بچالو۔ یہ جرم میں نے ہی کیا ہے۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے چیخ ماری اور پیچھے جا گرا۔

اگلے لمحے قبیلے کی عورتوں کو میں نے قیدیوں کی طرف لپکتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں پیالے تھے۔ ان پیالوں میں کوئی اور شربت تھا۔ درد کی وجہ سے میں بے ہوش ہوا جا رہا تھا، لیکن ارشاد کا انجام دیکھنے کے لیے کسی طرح خود کو سنبھال لیا۔ ایک عورت ارشاد کو دوسرا شربت پلا رہی تھی۔ دوسری عورت نے ایک ہاتھ سے میرے بالوں کو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے شربت کا پیالہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ شربت کا رنگ سرخ تھا۔ اس میں روح افزا جیسی خوش بو، مٹھاس اور ٹھنڈک تھی۔ مجھے یہ شربت پی کر بڑی تسکین محسوس ہوئی۔

ٹھنڈک اور سکون کا احساس میرے پورے جسم میں پھیلنے لگا۔ ایسا جادو اثر شربت میں نے پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔ چند لمحوں میں درد غائب ہو گیا۔ وہ مہربان عورت سیدھی کھڑی ہو گئی اور خالی پیالہ لے کر دوسری عورتوں کی طرف چل دی۔

یہ اسی دن کی بات ہے کہ پجاری نے میرے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا: ''میں نے قبیلے کے سردار سے تمھارے دوست کو معافی دینے کے لیے بات کر لی ہے۔ تمھارے دوست نے جنگل میں جہاں وہ ہیرے چھپائے تھے، وہ وہاں سے نکال کر واپس کر دیے ہیں اور معافی مانگ لی ہے۔ تم دونوں آج ہی یہاں سے نکل جاؤ۔''

میں بولا: ''مجھے بڑی حیرت ہے کہ اس شربت کے ذریعے سے سچ اور جھوٹ کا پتا

کیسے چل گیا؟"

پجاری مسکرا کر بولا: "یہاں ابھی علم کی روشنی نہیں پھیلی۔ یہ لوگ سیدھے اور بھولے بھالے ہیں۔ یہاں ہر کام عقیدے سے ہوتا ہے۔ وہ شربت جس نے جھوٹ کا فیصلہ کیا، اس کو پی لینے سے صرف پیٹ میں زور کا درد اٹھتا ہے۔ جتنے لوگوں کو بھی شربت پلایا گیا، سب کے پیٹ میں درد ہونا ضروری تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ اصل مجرم یہی سمجھتا ہے کہ اس کے پیٹ میں اتنے زور کا درد ہو رہا ہے، باقی لوگ اس تکلیف سے بچے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے آگے موت ناچنے لگتی ہے۔ آخر وہ سچ بول دیتا ہے۔ یہ سب عقیدے کے کھیل ہیں۔ یقین کا جادو ہے۔ شاید تم ان باتوں کو نہ سمجھ سکو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تم اس جگمگاتی اور ترقی کرنے والی دنیا سے یہاں آئے ہو، جہاں سیاہ اور سفید کو پرکھنے کے طریقے الگ ہیں۔" یہ کہہ کر پجاری نے میرے کندھے پر تھپکی دی اور اس جھونپڑی سے نکل گیا جہاں مجھے ٹھیرایا گیا تھا۔

ارشاد، سردار کے جھونپڑے کے قریب ایک جھونپڑی میں قید تھا۔ اس کے آنے کا انتظار کرتے ہوئے میں اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ میرے ذہن میں مختلف خیالات آ رہے تھے۔ پہلا خیال مجھے یہ آیا کہ ارشاد جیسے لالچی انسان کو میں اب کبھی اپنا دوست نہیں سمجھوں گا۔ اس کی وجہ سے مجھے بھی رسوا ہونا پڑا۔ ایسے لوگوں کو دوست نہیں بنانا چاہیے جو اللہ کے احکام کی کھلی نافرمانی کرتے ہوں۔ ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا کہ جن لوگوں کو ہم جاہل اور بے وقوف سمجھتے ہیں، ان کے پاس بھی عقل ہے۔ وہ بھی جھوٹ اور سچ کی پہچان رکھتے ہیں، کھرے کھوٹے کو پرکھ سکتے ہیں۔ ☆

اصلی شہزادی

ڈاکٹر عمران مشتاق۔ آسٹریلیا

آپ نے عجائب گھر میں مٹر کا دانہ تو ضرور دیکھا ہوگا۔ ہے نا حیرت کی بات۔ بھلا مٹر کے دانے کا عجائب گھر میں کیا کام؟ عجائب گھر میں تو قدیم تہذیب و ثقافت کے نمونے ہوتے ہیں۔ پرانے دور کے زیورات، سکے، برتن، مجسمے، کپڑے اور دوسری چیزیں ہمیں انسانی تاریخ کی حیرت انگیز باتوں سے آگاہ کرتی ہیں۔ مٹر کے دانے سے بھی ایک کہانی جڑی ہوئی ہے۔ آج ہم آپ کو وہی کہانی سنانا چاہتے ہیں۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک بادشاہ کی سلطنت اُس سے چھن گئی۔ وہ اپنے علاقے سے نکلا اور کسی اور بستی میں جا کر آباد ہو گیا۔ اب بھی اُس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ شان و شوکت سے زندگی گزار سکتا تھا۔ اُس نے ایک بڑی سی حویلی خریدی اور آرام سے رہنے لگا۔ اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ کچھ عرصے کے بعد شکست کھائے ہوئے بادشاہ کو اپنے شہزادے کی شادی کی فکر ہوئی۔ شہزادہ ویسے تو اب نام کا ہی شہزادہ رہ گیا تھا، مگر وہ کسی شہزادی سے ہی شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا، جو واقعی شہزادی ہو۔ بادشاہ اور ملکہ سے مشورہ کر کے اور اُن کی اجازت سے وہ شہزادی کی تلاش میں نکلا۔ وہ ملک ملک، شہر شہر اور گاؤں گاؤں گھوما، مگر اُسے کوئی ایسی لڑکی نہ ملی، جو واقعی شہزادی ہو۔ ویسے تو اُس کی ملاقات کئی شہزادیوں سے ہوئی، مگر ان میں کوئی نہ کوئی کمی تھی۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ اُن میں اصلی شہزادی تھی یا نہیں۔ اُن میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوتا، جو اُسے پسند نہ آتا اور وہ پھر آگے چل پڑتا۔ مہینوں کی تلاش کے بعد بھی جب وہ

کامیاب نہ ہوا تو واپس گھر آگیا۔ وہ بے حد اُداس تھا۔ بادشاہ اور ملکہ نے اُسے تسلی دی کہ ایک نہ ایک دن اُسے اصلی شہزادی مل جائے گی۔

شام کا وقت تھا۔ موسم بے حد خراب تھا۔ طوفان کے آثار تھے۔ بجلی تھوڑی تھوڑی دیر بعد چمک رہی تھی اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ بارش جیسے ہی تیز ہوئی تو اُن کی حویلی کے بڑے دروازے کو کسی نے زور زور سے کھٹکایا۔ دروازہ کھولا گیا تو باہر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ اپنے حلیے اور لباس سے وہ کسی اچھے گھر کی لڑکی لگ رہی تھی۔ اُس کا لباس بوسیدہ ہو چکا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور تیز بارش نے اس کا حلیہ خراب کر دیا تھا۔

لڑکی نے کہا: "میں ایک شہزادی ہوں۔ میرے چچا نے دھوکے سے میرے بادشاہ باپ اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ میں نے بڑی مشکل سے بھاگ کر جان بچائی ہے۔"

بادشاہ کو اُس کی کہانی سن کر ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ خود بھی تو کبھی بادشاہ تھا اور اب اُس کے بھی حالات بدل چکے تھے۔ اُس کے کہنے پر ملکہ شہزادی کو اپنے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے دل میں یہ بات ٹھان لی کہ شہزادی کا امتحان لے گی، تاکہ پتا چل سکے کہ وہ واقعی شہزادی ہے یا نہیں؟ اُس نے شہزادی کو کھانا کھلایا اور پہننے کو نئے کپڑے بھی دیے۔

جب رات ہوئی تو ملکہ شہزادی کو ایک کمرے میں لے کر گئی۔ شہزادی کو اُسی کمرے میں سونا تھا۔ شہزادی نے حیرت سے اپنے بستر کو دیکھا، جو زمین سے بہت اونچا تھا، مگر اس نے ملکہ سے کوئی سوال نہ کیا۔

شہزادی کو ساری رات نیند نہ آئی، وہ کروٹیں بدلتی رہی اور ٹھیک طرح سے سو نہ سکی۔

اگلے دن صبح کو ملکہ نے شہزادی سے پوچھا: ''مجھے اُمید ہے کہ تمھیں رات کو اچھی اور پُرسکون نیند آئی ہوگی؟''

شہزادی نے جواباً شکایت بھرے لہجے میں کہا: ''میں تو ساری رات سو ہی نہیں سکی۔ بستر میں کوئی سخت چیز تھی، جو مجھے ساری رات چبھتی رہی۔ وہ اتنی سخت تھی کہ میرے جسم کے کئی حصوں پر نیل پڑ گئے ہیں۔''

ملکہ کے کہنے پر شہزادی نے اپنی کمر سے کپڑا اُٹھایا تو ملکہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اُس کی نرم و نازک جلد پر نیلے نیلے نشان پڑ چکے ہیں۔

ملکہ کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور پوچھنے لگی: ''آخر ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے، جس نے تمھارا ایسا حال کر دیا؟''

شہزادی نے اپنی کمر سہلاتے ہوئے کہا: ''یہ تو میں نہیں جانتی کہ میرے بستر میں وہ سخت سی چیز کیا تھی؟ مگر اتنا جانتی ہوں کہ میری نرم و نازک جلد کو اُس سے سخت نقصان پہنچا ہے۔''

ملکہ نے شہزادی کو محبت سے گلے لگا لیا اور کہنے لگی: ''میں نے مان لیا اور جان لیا کہ تم واقعی شہزادی ہو۔ کسی شہزادی کا نرم و نازک جسم تو مٹر کے دانے کی سختی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

شہزادی حیرت سے پوچھنے لگی: ''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟''

ملکہ نے بتایا: "میں نے تمھارا امتحان لیا تھا۔ میں نے تمھاری مسہری سے بستر ہٹا کر نیچے مٹر کا ایک دانہ رکھ دیا تھا۔ پھر مٹر کے دانے کے اوپر بیس رضائیاں رکھ دیں۔ یوں مٹر کا دانہ چھپ گیا۔ اگر کوئی عام سی لڑکی ہوتی تو اُسے شاید پتا بھی نہ چلتا، مگر تم تو شہزادی ہو، اس لیے تمھارے جسم کی نزاکت اُس کی سختی برداشت نہ کرسکی۔"

کہتے ہیں ملکہ اور بادشاہ نے شہزادی کو اپنی بیٹی بنا لیا اور اُس کی شادی اپنے شہزادے سے کردی، کیوں کہ یہ بات تو ثابت ہو ہی چکی تھی کہ وہ واقعی شہزادی تھی۔ بادشاہ کے کہنے پر مٹر کا دانہ عجائب گھر میں رکھ دیا گیا۔

کیا آپ نے عجائب گھر میں دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا؟ ارے ہم آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ میوزیم ڈنمارک کے اہم ترین شہر کوپن ہیگن میں ہے۔

☆☆☆

ترکیب

سولھویں صدی کا ذکر ہے۔ ہندستان کے بادشاہ شیر شاہ سوری کو کھلے میدان میں جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ دشمن اسلحے سے لیس تھا۔ مورچا بندی کے بغیر جنگ لڑنا ناممکن نظر آتا تھا۔ شیر شاہ سوری کے ساتھ اس کا سولہ سالہ پوتا بھی تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ بوریوں میں ریت بھری جائے اور ان سے مورچے بنائے جائیں۔ شیر شاہ سوری اس ترکیب پر عمل کر کے جنگ جیت گیا۔ یہ ایجاد اس وقت سے اب تک دنیا بھر میں استعمال ہوتی چلی آرہی ہے۔

مرسلہ : ثریا عبدالستار انصاری، لاہور

شاعر: محمد خورشید عالم

اے ارضِ وطن

پسند: اُمامہ عالم

اے ارضِ وطن! تیرے گناہ گار بہت ہیں
حالت پہ تیری آج شرم سار بہت ہیں

خدمت سے چُراتے ہوئے نظروں کو ہمیشہ
ہم تیری ترقی کے طلب گار بہت ہیں

سینوں میں کمی حُبِّ وطن کی ہے وگرنہ
کاغذ کے پلندوں میں تو اشعار بہت ہیں

ہم قرض کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے آہ
آزاد فضاؤں میں بھی ناچار بہت ہیں

اُمید کی شمعوں کو بجھاتا نہیں عالم
سنتے ہیں کہ روشن تیرے افکار بہت ہیں

دینی اور سبق آموز کتابیں

رسول اللہ ﷺ سب سے بڑے انسان

اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی اور آپؐ کی عالم گیر تعلیمات کو مختصر، لیکن سہل اور سادہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ نونہالوں، نوجوانوں اور عام پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی شہید حکیم محمد سعید کی ایک سبق آموز کتاب، جو طالب علموں کے لیے ایک عمدہ تحفہ ہے۔

خوب صورت ٹائٹل۔ نیا ایڈیشن

صفحات : ۴۸ —— قیمت : ۳۵ رُپے

اُمت کی مائیں

اس کتاب میں حضور اکرمؐ کی قابلِ احترام بیبیوں کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں، جو ہمارے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہیں اور مسلمان بچیوں اور خواتین کے لیے خاص طور پر مفید اور دل چسپ ہیں۔

حسین حسنی کی بچوں اور بڑوں، سب کے لیے یکساں مشعلِ راہ کتاب

صفحات : ۳۰ —— قیمت : ۲۰ رُپے

رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کے مختصر حالاتِ زندگی، جن کا ہر عمل ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ مولانا فضل القدیر ندوی کی ایک مفید اور سبق آموز کتاب۔

صفحات : ۴۰ —— قیمت : ۲۰ رُپے

☆ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی۔ ۷۴۶۰۰

جاگ اُٹھا سردار

مدیحہ ذکا بھٹی

کامو موچی خوف سے کانپ رہا تھا اور گاؤں کا سردار گرج رہا تھا: ''میں نے کہا تھا کہ سالانہ میلے کے موقعے پر نئے جوتے پہنوں گا۔ بھلا بتاؤ اتنے اہم موقعے پر جب کہ دور دور سے لوگ آئیں گے، میں پرانے جوتے پہن کر جاؤں گا! لوگ کیا کہیں گے کہ اتنے بڑے گاؤں کا سردار اور سلیقے کے جوتے بھی نہیں۔ تم نے جوتے انتہائی گھٹیا بنائے ہیں۔ ٹانکے بھی درست نہیں لگائے۔ تمھارے سفید بالوں اور پرانی خدمات کا خیال نہ ہوتا تو اتنے جوتے لگاتا کہ گنجے ہو جاتے۔ دفع ہو جاؤ، پھر کبھی منھ نہ دکھانا۔ بے وقوف! تمھاری نظریں کم زور ہو گئی ہیں تو اپنے اس بیٹے کو کام کیوں نہیں سکھا دیتے۔ اگر یہ اب بھی نہیں سیکھے گا تو تمھارے بعد ہمارے بچوں کے جوتے بنا کر کون دے گا؟''

کامو نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے بیٹے شامو کے ہاتھوں میں جوتے تھما دیے اور لاٹھی ٹیکتا ہوا سردار کی حویلی سے نکل گیا۔ شامو نے محسوس کیا کہ اس کے باپ کامو کی کمر پہلے کی نسبت اور جھک گئی ہے، سر کے بال اور بھی سفید ہو گئے ہیں، آنکھیں بھی کم زور ہو گئیں ہیں۔ دونوں اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں داخل ہوئے تو شامو کی ماں دوڑتی ہوئی آئی۔

کامو بولا: ''شامو کل سے مدرسے نہیں جائے گا، وہ جوتے بنائے گا۔ میری نظریں کم زور ہو گئیں ہیں۔ ٹانکے غلط پڑ جاتے ہیں۔ شامو کی ماں! آج میں سردار کے ہاتھوں پٹتے پٹتے بچا ہوں۔ لگتا ہے آج صبح کسی بھلے مانس کا منھ دیکھا تھا، ورنہ غصہ، وہ بھی سردار کا، اللہ بچائے۔ ایک جوتا بھی ہلکا نہ پڑتا۔ تم تو جانتی ہو وہ زبان سے کم اور ہاتھ سے زیادہ کام لیتا ہے۔''

کا مو ہانپتا ہوا جھونپڑی کے ایک کونے میں کچے فرش پر بچھی کھجور کے سوکھے پتوں سے بنی چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، شامو کی ماں پنکھا جھلنے لگی۔

کامو نے کچھ سوچ کر دل میں ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا۔

شامو نے ماں باپ کو اُداس دیکھ کر جوتے رکھے اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

چوپال پر پہنچا تو دیکھا موچھو جولاہے کا بیٹا سوکھو گھٹنوں میں سر ڈالے بیٹھا ہے۔

''کیا ہوا؟'' شامو نے قریب جا کر اس کے شانے ہلائے۔

سوکھو نے مایوسی سے کہا: ''وہی جو غریبوں کے مقدر میں ہے۔ ہفتوں کی محنت کے بعد ململ تیار کر کے بابا جب سردار کے پاس لے گیا تو تھان دیکھتے ہی سردار غصہ ہو گیا اور اُٹھا کر پھینک دیا۔ اپنے نوکروں سے بابا کو پٹوایا اور حویلی کے دروازے کے باہر پھکوا دیا۔''

شامو کچھ سوچنے لگا۔

سردار کا بیٹا کامو کے ہاں آیا اور بولا: ''جوتے تیار ہو گئے ہوں تو دے دو، بابا کو میلے میں جانا ہے۔''

کامو بولا: ''جوتے تیار ہیں، لیکن تمھارے بابا کو نہیں دوں گا۔ آج میں خود ہی پہن کر میلا دیکھنے جاؤں گا۔''

''کیا بکتے ہو، بابا سن لیں گے تو چمڑی اُدھیڑ دیں گے۔'' سردار کا بیٹا بولا۔

''مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا۔'' بوڑھے کامو نے کہا اور اپنی جھونپڑی میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سردار خود ہی جھونپڑی کے دروازے پر موجود تھا۔ وہ چلایا:

''کامو! باہر آ گستاخ! تیری جھڑی اُدھیڑ کر جس نہ بھر وا دوں تو سردار نہیں، تیری یہ مجال، میرے سامنے سر اُٹھا کے باتیں کرے، جانتا نہیں میں کون ہوں؟''

''شور کیوں مچا رہے ہو؟'' کامو جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ لہجہ نہایت نرم تھا۔

''جوتے کہاں ہیں؟'' سردار گرجا۔

''یہ بات تم دھیمے بھی کہہ سکتے ہو۔'' کامو کا لہجہ برقرار تھا: ''میں اونچا تو نہیں سنتا۔''

''بدزبان، منھ پھٹ، میں تیری زبان کھنچوا دوں گا۔''

''تم دوسروں کے کب تک محتاج رہو گے۔ کب تک اوروں سے کام کرواتے رہو گے۔ تم کام کب کرو گے مجھے انسان! کپڑا جولاہا بنتا ہے۔ درزی اسے سیتا ہے، جوتے موچی بناتا ہے، زیورات سنار بناتا ہے، مالی سبزیاں اُگاتا ہے، کسان اناج پیدا کرتا ہے،

لیکن تم کیا کرتے ہو؟''

''ارے! کوئی ہے جو اس سنکی، خبطی بڈھے کو اُٹھا کر ندی کے ٹھنڈے پانی میں ایک غوطہ دے دے، تاکہ اس کا دماغ ٹھکانے آ جائے۔''

''تم کسی کو سزا دینے کے لیے بھی دوسروں کے محتاج ہو۔ افسوس ہے تم پر۔ تمھارا وجود صرف دوسروں کے بل پر قائم ہے۔ آخر ایسے شخص کو جینے کا کیا حق ہے جو ایک ایک چیز کے لیے دوسروں کا محتاج ہو اور اپنی اس محتاجی پر شرمندہ ہونے کے بجائے فخر محسوس کرتا ہو، اپنے کو بڑا سمجھتا ہو، رعب جماتا ہو۔''

وہاں خاموشی ہو گئی۔ درخت کے بھی پتے ہلنا بند ہو گئے۔ کاموکی جھونپڑی کے گرد گاؤں کے لوگوں کی بھیڑ ہو گئی۔ کامو کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ کہے جا رہا تھا: ''کسان غلے کے بدلے جولاہے سے کپڑا، موچی سے جوتے لے سکتا ہے۔ جولاہا کپڑے کے عوض غلہ اور ضرورت کی چیزیں خریدتا ہے۔ بتاؤ تم کیا کرو گے۔ تمھارے پاس کیا ہے؟ تم کون سا ہنر جانتے ہو؟ سردار تو ہم میں سے ہی کوئی ہو سکتا ہے، کیوں کہ ہم میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی ہنر جانتا ہے اور تم..... تم تو صرف چیخنا، چلانا، گرجنا اور حکم دینا جانتے ہو۔ سردار تمھارا باپ بھی تھا اور تمھارا دادا بھی، لیکن وہ اس کے اہل تھے۔ وہ ہم سے زیادہ محنتی، جفاکش، نڈر اور بے باک تھے۔ وہ اپنے کھیتوں میں سب سے زیادہ اناج اگاتے تھے۔ وہ گاؤں کے غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ہم آج بھی ان کے احسان مند ہیں، ان کے گن گاتے ہیں۔ آج سے ہم گاؤں والے تمھیں اپنا سردار نہیں مانتے۔ ہم ایک بے ہنر انسان کو اپنا سردار نہیں بنا سکتے۔ یہ ہمارا متفقہ فیصلہ ہے۔''

سردار سر جھکائے خاموشی سے سنتا رہا۔ گویا اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ لوگ بالکل خاموش تھے۔

کامو اپنی جھونپڑی میں چلا گیا تو سردار کچھ سوچتا ہوا اپنی حویلی کی طرف بڑھ گیا۔ ہوا تیز رفتار سے چلنے لگی۔ گنگنانے لگی۔ درخت کے پتے خوشی میں آ کر جھومنے لگے۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے اس طرح چہچہانے لگے گویا وہ کامو کے حق میں تعریف کے گیت گا رہے ہوں۔

دوسری صبح گاؤں کے لوگوں نے دیکھا سردار اپنے کندھوں پر ہل لادے، بیلوں کی جوڑی ہانکتا ہوا اپنے کھیتوں کی طرف جا رہا ہے۔ ☆

ایک ٹانگ کا بادشاہ

سیدہ مبین فاطمہ عابدی
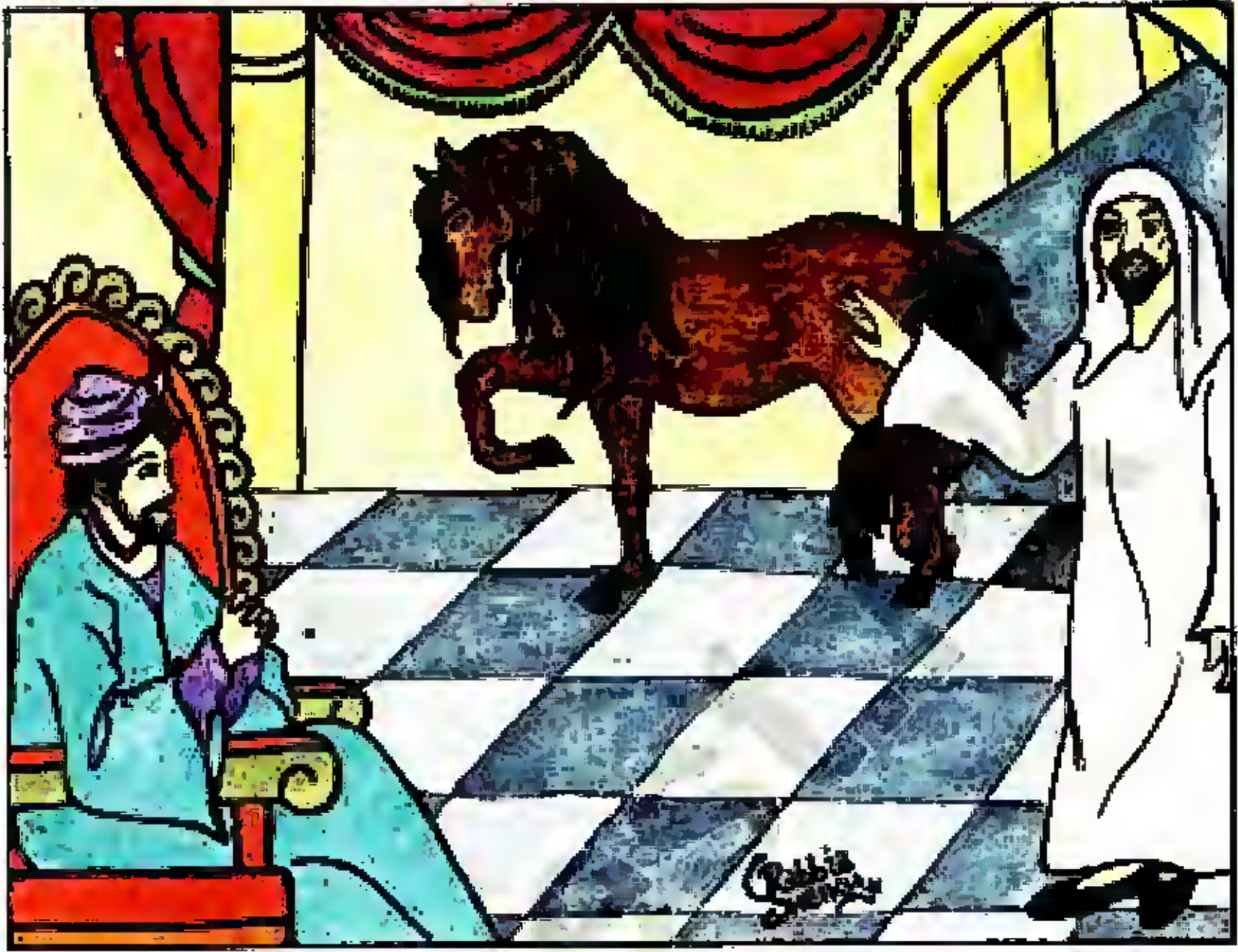
ایک بادشاہ کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ آئے دن اپنے امیروں اور وزیروں کے ساتھ آس پاس کے جنگلوں میں جاتا اور ہرنوں، ہرنیوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کا شکار کھیلا کرتا تھا۔

اس بادشاہ کو گھوڑے پالنے کا بھی بہت شوق تھا، جہاں کوئی چاق چوبند اور پھرتیلا گھوڑا دیکھ لیتا جھٹ اس کے مالک سے منھ مانگی قیمت پر خرید لیتا۔

ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس بادشاہ کے دربار میں عرب سے گھوڑوں کا ایک سوداگر آیا، بادشاہ کی خدمت میں جھک کر آداب بجا لایا اور عرض کیا: "حضور! غلام ایک

گھوڑا لایا ہے۔ ایسا پھرتیلا کہ پل بھر کو اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے، آنکھ کے اشارے پر ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے، لیکن حضور! اس میں ایک نقص ہے کہ یہ مزاج کا بہت کڑوا ہے کسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ ہر وقت دولتیاں چلایا کرتا ہے، اگر اس گھوڑے کو لینا چاہیں تو غلام حاضر کر سکتا ہے۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا: "میاں سوداگر! تم بے فکر ہو کر اپنا گھوڑا لے آؤ، یہاں بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیا گیا ہے۔"

دوسرے دن عرب سوداگر گھوڑا لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گھوڑے کو دیکھ کر بادشاہ کی باچھیں کھل گئیں۔ ایسا خوب صورت اور پھرتیلا گھوڑا بادشاہ نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خوش ہو کر سوداگر کو انعام سے مالا مال کر دیا اور گھوڑا اپنے اصطبل میں بھجوا دیا اور کہا: "کل ہم اس گھوڑے پر سوار ہو کر امیروں، وزیروں کے ساتھ شکار کھیلنے جائیں گے۔"

دوسرے دن صبح سویرے بادشاہ اپنے نئے گھوڑے پر سوار امیروں، وزیروں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا۔ کچھ دیر تو خیر گزری، لیکن جب بادشاہ ایک شیر شکار کر رہا تھا تو ایکا یک شیر بادشاہ کی طرف جھپٹا۔ اچانک شیر کے جھپٹنے سے بادشاہ کا عربی گھوڑا بھڑک اُٹھا اور بادشاہ کو زمین پر پٹخ کر سرپٹ دوڑ گیا۔ جب تک بادشاہ کے ساتھی مدد کو پہنچتے شیر نے اپنے تیز دانتوں سے اس کی بائیں ٹانگ چبا ڈالی۔ پھر بھی بادشاہ نے ہمت کر کے شیر کی گردن پر تلوار سے وار کیا تو وہ بھاگ گیا۔

وزیر، بادشاہ کو اُٹھا کر محل میں لائے اور حکیموں کو بلایا۔ انھوں نے اپنی پوری کوشش کر ڈالی، لیکن بادشاہ کی ٹانگ کے زخم نہ بھرے۔ آخر سب نے یہی فیصلہ کیا کہ بادشاہ کی

جان اسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔

ٹانگ کٹنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد زخم بھر گیا اور بادشاہ صحت یاب ہو گیا، لیکن ٹانگ کٹ جانے کا اس کو بہت رنج تھا۔ اب وہ ہر وقت اُداس رہتا، نہ کہیں جاتا نہ آتا۔ ہر وقت اپنے کمرے میں پڑا سوچتا رہتا کہ کہیں سے وہ شیر مل جائے تو میں بھی اس کی ٹانگ کاٹ لوں۔ بادشاہ کو سب سے بڑا غم یہی تھا کہ شیر نے اس کی ٹانگ چبائی ہے۔

بادشاہ کی ایک خوب صورت بیٹی بھی تھی۔ اس کا نام مہ جبیں تھا۔ یہ اپنے باپ کا دل بہلانے گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھی رہتی اور ستار بجا بجا کر اپنی میٹھی آواز سے اس کو گیت سنایا کرتی، لیکن اس کا غم کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔

بادشاہ کے محل سے کافی دور ایک پہاڑی تھی، اس پر ایک بوڑھا رہتا تھا، جو بہت

عقل مند تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس آتے اور اپنی اپنی مصیبتیں اور پریشانیاں بیان کرتے اور یہ طرح طرح کے مشورے دے کر ان کے مسائل حل کیا کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ کے وزیروں نے سوچا کہ اس عقل مند بوڑھے کو بلانا چاہیے، شاید یہ بادشاہ کا غم دور کر سکے۔

بوڑھا بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا تو بادشاہ نے کہا: ''بڑے میاں! تم میرے ملک میں سب سے زیادہ عقل مند شخص ہو، اگر تم کسی طرح میرا غم دور کر دو تو میں تم کو آدھی سلطنت دے دوں گا۔''

بوڑھے نے مسکرا کر کہا: ''حضور! میں پہاڑی پر ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتا ہوں۔ تخت تاج لے کر کیا کروں گا اور پھر میری عمر بھی اسی برس کی ہو چکی ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ اپنے ملک میں منادی کروا دیجیے کہ جو کوئی بادشاہ سلامت کی ٹانگ کے بدلے میں ٹانگ لائے گا اسے آدھی سلطنت دے دیں گے اور اپنی بیٹی کی شادی بھی اس سے کر دیں گے۔ ممکن ہے کوئی ایسا عقل مند شخص نکل آئے جو حضور کی خواہش پوری کر دے۔''

یہ سن کر بادشاہ خوشی سے اُچھل پڑا اور بولا: ''مجھے تمھاری رائے بہت پسند آئی ہے۔ میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔''

دوسرے دن بادشاہ نے سارے شہر میں منادی کروا دی کہ جو کوئی ہمارے لیے ٹانگ لے آئے گا، ہم اسے آدھا تخت تاج دے دیں گے اور اپنی بیٹی مہ جبیں کی شادی بھی اس سے کر دیں گے۔

یہ منادی سن کر سیکڑوں لوگوں کا دل للچایا اور وہ جلد جلد ٹانگیں بنا کر بادشاہ کے محل کے سامنے جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے چلا چلا کر کہنے لگے: ''بادشاہ

سلامت کے لیے ٹانگ حاضر ہے۔" ہر شخص کی یہ کوشش تھی کہ میں سب سے پہلے بادشاہ کے سامنے پہنچوں اور اپنی بنائی ہوئی ٹانگ پیش کر کے انعام حاصل کروں۔ آنے والے لوگوں نے اتنا شور مچا رکھا تھا کہ محل کے ملازموں نے انھیں ڈانٹ کر کہا: "اگر تم لوگ خاموش نہ ہوئے تو ہم ابھی تم سب کے سر اُڑا دیں گے۔"

آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ انھیں ایک ایک کر کے ہمارے سامنے لے آؤ۔

پہلا شخص بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہوا اور وہ لکڑی کی ٹانگ دکھا کر کہنے لگا: "بادشاہ سلامت! ذرا اس ٹانگ کو تو آزمایئے، اگر ٹھیک نہ آئے تو میں اپنی ناک کٹوا دوں گا۔"

جب بادشاہ نے اسے اپنی کٹی ہوئی ٹانگ پر لگایا تو وہ ایسی بھاری نکلی کہ بادشاہ کو ہلنا جلنا دوبھر ہو گیا۔ اس نے غصے سے آگ بگولا ہو کر وہی لکڑی کی ٹانگ اُٹھا کر اس کے سر پہ دے ماری اور وعدے کے مطابق اس کی ناک کاٹ لی گئی۔

دوسرا شخص ٹین کی بنی ہوئی ٹانگ لایا، لیکن جب بادشاہ نے اسے کٹی ہوئی ٹانگ پر لگایا تو وہ وہیں پھنس گئی۔ ٹانگ لانے والے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اس نے اور بادشاہ نے بہت کوشش کی کسی طرح یہ ٹین کی ٹانگ اُتر آئے، لیکن کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ آخر لوہار کو بلوایا گیا اور اس نے بادشاہ کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلوایا۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا کہ اس شخص کے گلے میں یہی ٹین کی ٹانگ باندھ کر اسے بطخوں والے تالاب میں پھینک دو۔

اس کے بعد دوسرے لوگ پیش ہوئے۔ ان میں کوئی روئی اور کپڑے کی ٹانگ بنا کر لایا تو کوئی بانس کی۔ غرض طرح طرح کی ٹانگیں بادشاہ کے سامنے پیش کی گئیں، لیکن

ان کے لانے والوں کا بھی بُرا حال کر دیا گیا اور انھیں دھکے دے کر محل سے نکال دیا گیا۔
اب پھر سے بادشاہ خاموش اور اُداس رہنے لگا۔ سارا دن غم کی صورت بنا تخت پر بیٹھا رہتا تھا۔ نہ کسی سے بات کرتا نہ کہیں آتا جاتا۔ ہر وقت فکر میں ڈوبا رہتا، اسی طرح کئی مہینے بیت گئے، مگر اس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ بھی نہیں آئی، ہنسنا تو دور کی بات ہے۔ آخر حکیموں اور ویدوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ اگر بادشاہ اسی طرح غم کھاتا رہے گا تو تھوڑے ہی دنوں میں نڈھال ہو کر ختم ہو جائے گا۔

ایک دن بادشاہ کے دربار میں ایک خوب صورت نوجوان شہزادہ آیا اور بادشاہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ بادشاہ نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ اس وقت بادشاہ کی بیٹی مہ جبیں بھی پاس ہی ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھی تھی۔ وہ شہزادے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ شہزادے نے کہا: "بادشاہ سلامت! غلام کو آپ کے دکھ کا سب حال معلوم ہے۔ کل آپ اپنے سب امیروں، وزیروں کو اپنے پاس بلالیں۔ اس وقت میں حضور کی خدمت میں ایک سچ مچ کی ٹانگ پیش کروں گا۔ لکڑی، ٹین، کپڑے کی ایسی واہیات ٹانگ نہیں، بلکہ خون اور گوشت کی بنی ہوئی ایک ٹانگ۔ ایک ایسی ٹانگ جسے دیکھ کر آپ کا غم دور ہو جائے گا۔"

بادشاہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں: "سچ کہتے ہو؟"

شہزادے نے کہا: "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، کل حضور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔" یہ کہہ کر شہزادے نے جھک کر بادشاہ کو سلام کیا اور دربار سے چلا گیا۔

دوسرے دن بادشاہ نے اپنے سب امیروں، وزیروں کو بلالیا۔ اس کی بیٹی مہ جبیں کل کی طرح آج بھی اس کے پاس ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھ گئی اور سب لوگ بڑی

بے صبری سے شہزادے کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد شہزادہ دربار میں حاضر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا بکس تھا۔ وہ بادشاہ کے تخت کے پاس پہنچ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "لیجیے بادشاہ سلامت! یہی وہ گوشت اور خون کی بنی ہوئی ٹانگ ہے، جس کا میں نے کل آپ سے وعدہ کیا تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے بکس کھولا اور ایک شیر کی ٹانگ نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دی۔

تمام دربار پر سناٹا چھا گیا۔ امیروں، وزیروں کے چہروں پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بادشاہ کا چہرہ غصے سے ایک دم سرخ ہو گیا۔ اس نے شہزادے کی طرف غصے کی نظروں سے دیکھا۔

شہزادے نے کہا: "بادشاہ سلامت! یہ اسی شیر کی ٹانگ ہے جس نے آپ کی ٹانگ چبائی تھی۔" ایک دم ہی بادشاہ کا سارا غصہ اُتر گیا اور اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ دیکھ کر دربار کے سب لوگ پہلے تو بہت حیران ہوئے، مگر جب انھوں نے بادشاہ کو ہنستے دیکھا تو خود بھی ہنسنے لگے۔ بادشاہ کی بیٹی مہ جبیں کا یہ حال تھا کہ ہنسی کے مارے اس کی پیٹ میں بل پڑ گئے۔

بادشاہ نے کہا: "اے نوجوان شہزادے! تم نے جس ہوشیاری اور عقل مندی سے شیر سے میرا انتقام لے لیا ہے، میں اس کی تمھیں داد دیتا ہوں اور اب میں کبھی بھی اُداس اور غمگین نہ رہوں گا۔ جلد ہی تمھاری شادی مہ جبیں سے ہو جائے گی۔"

دوسرے دن شہزادے اور مہ جبیں کی شادی ہو گئی۔ اس روز بادشاہ نے اپنے سب امیروں، وزیروں کی دھوم دھام سے دعوت بھی کی۔

☆☆☆

مٹی کا روشن دیا

مسعود احمد برکاتی

وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ وہ درزی کا کام کرتے تھے، مگر وہ بھی دل لگا کر نہیں۔ انھیں بیٹے کو بھی تعلیم دلانے سے دل چسپی نہیں تھی۔ ان کا غصہ بہت تیز تھا۔ انھوں نے کئی بار بیٹے کی کتابیں غصے ہو کر بھٹی میں جلانے کی کوشش کی۔ دلاور کی ماں بھی پڑھی لکھی نہ تھیں، ہاں قرآن شریف پڑھ سکتی تھیں اور روزانہ صبح پابندی سے پڑھتی تھیں، لیکن وہ ایک نیک، خدا ترس، خدمت گزار اور ایثار پیشہ خاتون تھیں۔ انھوں نے پوری زندگی اپنے سسرال کے ہر فرد کی خدمت کرنے میں صرف کی۔ وہ پہلے گھر کے ہر آدمی کو کھلاتیں، پھر جو بچ جاتا اس سے اپنا پیٹ بھرتیں۔ گھر والوں کے لیے تازہ روٹیاں پکاتیں، خود باسی روٹی سے پیٹ بھرتیں۔

دلاور کی دادی نے پوتے کو پہلے ایک بڑھئی کے سپرد کیا کہ اسے بھی اپنی طرح استاد بناؤ، لیکن مستقبل کا یہ مشہور ادیب چند دن سے زیادہ بڑھئی استاد کی شاگردی نہ کر سکا اور ایک دن اس کے حقے کی چلم توڑ کر جو آیا تو پھر واپس نہ گیا۔ اس کے بعد دادی اس کو ایک لوہار کے سپرد کر آئیں، مگر دلاور کی نازک سی جان پر رحم کھا کر اور ہتھوڑے چلانے کا اہل نہ سمجھ کر لوہار نے ساتویں روز خود ہی اس کو رخصت کر دیا۔

آخر دلاور کے پھوپھا کو رحم آیا تو انھوں نے اس کو میونسپلٹی کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ دلاور کے دادا پڑھے لکھے آدمی تھے، لیکن ان کی اولاد علم کے دانے نہ چگ سکی تھی۔ دادا کے بعد پوتے دلاور کے نصیب میں تھا کہ وہ علم کے موتی چن سکے۔ ماں نے ایک سفید

کپڑے کو نیلا رنگ کر اس کا بستہ بنا دیا اور اس میں ایک قاعدہ، سلیٹ، قلم اور کاپی ڈال دی اور پہلے دن اسکول جاتے وقت بیٹے کا ماتھا چوما اور اپنے دوپٹے سے کھول کر دو پیسے ہاتھ پر دھر دیے اور رخصت کرتے وقت کہا: ''دلاور! گندا نہ کھانا، تانگے گھوڑے سے بچ کر چلنا۔''

خود علم کی نعمت سے محروم ماں کو جہالت کے اندھیرے کا خوب اندازہ تھا۔ وہ علم سے محروم تھی، مگر علم کی محبت سے محروم نہ تھی۔ علم نہ ہونا جہالت ہے، لیکن اگر کسی کو یہ معلوم ہے کہ وہ جاہل ہے، تو یہ بھی ایک طرح کا علم ہے جو آدمی یہ جانتا ہے کہ وہ نہیں جانتا، میں اس کو جاہل نہیں کہتا۔ کم سے کم آدھا علم تو اس کو حاصل ہے۔ درزی کا بیٹا، بڑھئی اور لوہار کی دکانوں سے ناکام واپس آ جانے والا ''چوہے کی طرح کمزور'' دلاور علم کے راستے پر چلنے لگا۔

دلاور پرائمری سے ہائی اسکول اور وہاں سے کالج آیا۔ دل لگا کر پڑھا۔ یکسوئی سے امتحانات دیے۔ اس کو خوش قسمتی سے اچھے اچھے استاد بھی ملے اور لایق ساتھی بھی، جن میں بہت سے آگے چل کر خود مشہور ادیب بنے۔

دلاور کو اسکول کے زمانے ہی سے شاعری اور ادب کا شوق ہو گیا تھا۔ وہ نظمیں بھی لکھتا تھا اور کہانیاں بھی۔ اس کی تحریریں رسالوں میں بھی چھپنے لگی تھیں۔ ماں کے حوصلہ بڑھانے سے دلاور میں تعلیم کا شوق اور استادوں کے دل بڑھانے سے ادب کا ذوق بڑھتا گیا۔ یہ کم زور جسم والا لڑکا جلد ہی تعلیم سے فارغ ہو کر ادیب اور مدیر بن گیا اور مرزا ادیب کے نام سے ملک میں مشہور ہوا۔ جب اس کی پہلی کتاب ''صحرا نورد کے خط'' شائع ہوئی تو مرزا ادیب نے اس کا انتساب اپنی ماں کے نام کیا اور جب ایک پڑوسی نے ماں کو یہ بات بتائی تو ماں کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ انھوں نے پوچھا: ''دلور! تو نے میری

کتاب لکھی ہے؟''

ادیب بیٹے کی سادہ دل ماں یہ تو نہیں سمجھ سکی کہ کوئی مصنف اپنی کتاب اُس شخصیت کے نام منسوب کرتا ہے جس سے اُسے فیض پہنچا ہوتا ہے، مگر اس کو اس پر اطمینان اور فخر ضرور ہوا کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ گیا ہے اور نام والا بھی ہو گیا ہے۔

میرزا ادیب ''ادبِ لطیف'' کے مدیر رہے۔ ادبِ لطیف ان کے زمانے میں بڑا اہم ادبی رسالہ تھا۔ اس کو انھوں نے پندرہ سولہ سال تک مرتب کیا اور ادبی رسالوں کی صفِ اول میں کھڑا کر دیا۔ میرزا صاحب ریڈیو میں بھی عرصے تک رہے اور ریڈیو کے لیے بہت لکھا، مگر افسوس ان کی صحیح قدر و عزت نہ ہوئی۔ میرزا ادیب کی اب تک کوئی پچاس کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں افسانوں کے مجموعے، ڈراموں کے مجموعے، خاکے، ترجمے، ترتیبیں اور بچوں کی کتابیں شامل ہیں۔ انھوں نے اب تک بچوں کی ۲۲ کتابیں لکھی ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل کام ہے، مگر بہت بڑی خوبی بھی ہے، اس لیے کہ ہمارے اکثر ادیبوں نے صرف اپنی ابتدائی زندگی میں بچوں کے لیے لکھا، جب ذرا شہرت مل گئی تو وہ بچوں کو بھول گئے اور انھوں نے بچوں کے ادب کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا، کیوں کہ بچوں کے لیے لکھنے والے کو شاید بڑا ادیب نہیں سمجھا جاتا، لیکن میرزا ادیب کی بڑائی یہ ہے کہ وہ اب تک بچوں کے لیے بھی اسی محبت سے لکھتے ہیں جس محبت سے بڑوں کے لیے لکھتے ہیں۔ وہ ایک خاموش، شریف اور سادہ دل انسان ہیں۔ اردو ادب کی پچاس سال سے مسلسل خدمت کر رہے ہیں۔

میرزا ادیب کی بعض کتابوں کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ''صحرا نورد کے

خطوط'' دس بار''صحرا نورد کے رومان'' گیارہ باراور بچوں کی ایک کتاب ''تیس مار خان'' سولہ بار شائع ہو چکی ہے۔ صرف وہی کتاب زندہ رہتی ہے جس میں جان ہو۔ جس کتاب میں زندہ رہنے والی کوئی خوبی نہ ہو وہ کتنی ہی خوب صورت چھپے اُسے کچھ دن میں ہی لوگ بھول جاتے ہیں۔ معلوم ہے کتاب کو زندہ رکھنے والی خوبی کیا ہے؟ وہ خوبی یہ ہے کہ تحریر میں انسانوں سے محبت اور اُن کے دکھ درد کا سچا اظہار ہو اور اپنی تہذیب اور تاریخ کی محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کو سنوارنے اور آگے لے جانے کا جذبہ اور شعور ہو۔ جن تحریروں اور کتابوں میں یہ خوبی ہوتی ہے ان کے لکھنے والے بھی زندہ رہتے ہیں، چاہے لوگ ان کو کچھ دیر میں پہچانیں۔ میرزا ادیب جیسے بھلے انسان اور اچھے ادیب کے ساتھ بڑوں نے ناانصافی کی، مگر مجھے یقین ہے کہ بچے ان کو فراموش نہیں کریں گے۔ افسانے، ڈرامے اور ادبی صحافت کے علاوہ بچوں کے ادب کی تاریخ میں بھی میرزا ادیب کا نام مذحم حروف سے نہیں لکھا جائے گا۔ جس بچے نے آنکھ کھولی تو گھر میں مٹی کا دیا جلتا ہوا پایا، وہ بڑا ہو کر ادب کے چراغ روشن کرنے لگا۔ روشن کر رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ روشن کرے گا۔ اس کا نام بھی روشن ہی رہے گا۔

میرزا ادیب نے اپنی زندگی کے سچے سچے حالات ایک کتاب ''مٹی کا دیا'' میں لکھے ہیں۔ بڑی مفید اور مزے دار کتاب ہے۔ اسی لیے میں نے اس مضمون کا عنوان''مٹی کا روشن دیا'' رکھا ہے۔ میرزا صاحب ۴- اپریل ۱۹۱۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا انتقال ۳۱ جولائی ۱۹۹۹ء کو ہوا۔ (جب پہلی بار یہ مضمون ہمدرد نونہال ستمبر ۱۹۸۳ء میں چھپا تھا تو میرزا ادیب صاحب نے اسے بہت پسند کیا تھا۔

☆

ایک طالب علم ایم اے کا داخلہ فارم یونی ورسٹی میں جمع کرا کے باہر نکلا اور چپڑاسی سے پوچھا: "یہ یونی ورسٹی کیسی ہے؟"

چپڑاسی نے جواب دیا: "بہت اچھی یونی ورسٹی ہے، میں نے خود یہیں سے ایم اے کیا تھا۔"

مرسلہ : تحریم خان، نارتھ کراچی

بچہ باپ سے: "ابو! میں کل اسکول نہیں جاؤں گا۔"

باپ: "کیوں بیٹا؟"

بچہ: "آج اسکول میں استاد نے ہمارا وزن کیا تھا۔"

باپ: "تو کیا ہوا؟"

بچہ: "آج وزن کیا ہے، کل بیچ دیا تو!"

مرسلہ : محمد سلمان اقبال، لاہور

بیوی پندرہ منٹ تک اپنے خاموش شوہر پر بلند آواز سے گرجنے کے بعد بولی: "میں لڑائی ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، لیکن تمھاری گونگی ہوشیاری اور خاموش چالاکی کی وجہ سے گھر جہنم بنتا جا رہا ہے۔"

مرسلہ : سیدہ محمد شاکر، نیو کراچی

نوکر: "صاحب! آپ کی ردی کی ٹوکری سے سو روپے کا نوٹ ملا ہے۔"

مالک: "اسے پھینک دو، وہ جعلی ہے۔"

نوکر: "میں بھی تو آپ کو اسی لیے بتا رہا ہوں۔"

مرسلہ : اظہر علی، وہاڑی

تین بے وقوف ایک موٹر سائیکل پر جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ٹریفک پولیس کے اہلکار نے رکنے کا اشارہ کیا۔

بے وقوف موٹر سائیکل روکے بغیر بولا: "پاگل ہو گئے ہو کیا تم، کہاں بیٹھو گے؟"

مرسلہ : علینہ وسیم، کراچی

بلدیاتی الیکشن کا ایک اُمیدوار فٹ بال میچ میں مہمانِ خصوصی بنا۔ میچ ختم ہونے پر اس نے کہا: "مجھے افسوس ہے کہ دونوں

ٹیمیں ایک ہی فٹ بال کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ آپ مجھے ووٹ دیں، میں ہر کھلاڑی کو الگ الگ فٹ بال دوں گا۔''

مرسلہ : سمعیہ وسیم، بکھر

😊 ایک صاحب نے اپنے بے حد موٹے دوست سے کہا: ''تم جیسے موٹے آدمی عام طور پر بڑے خوش مزاج ہوتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ انھیں برا بھی کہو تو ہنس کر ٹال دیتے ہیں؟''

موٹے دوست نے جواب دیا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیے لڑنا اور بھاگنا دونوں ہی مشکل کام ہوتے ہیں۔''

مرسلہ : نام، جگہ نامعلوم

😊 مالک: ''کام کرتے کرتے تم بھاگ تو نہیں جاؤ گے؟''

ملازم: ''جی نہیں، اس سے پہلے میں تین سال ایک جگہ رہا اور بالکل نہیں بھاگا۔''

مالک: ''تین سال تک کہاں کام کرتے رہے؟''

ملازم: ''جیل میں۔''

مرسلہ : محمد طارق قاسم، نواب شاہ

😊 کرائے کے مکان کے باہر بورڈ لگا ہوا تھا کہ یہ مکان صرف ان لوگوں کو ملے گا جن کے گھر کوئی بچہ نہیں ہوگا۔

بورڈ دیکھ کر ایک بچہ مالک مکان کے پاس آیا کہنے لگا: ''یہ مکان مجھے دے دیں، کیوں کہ میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ البتہ دو ماں باپ ہیں۔''

مرسلہ : سمیہ طالب قریشی، نواب شاہ

😊 ایک صاحب نے ہوٹل میں چرغے کا آرڈر دیا۔ چرغہ آیا تو اُسے چکھنے کے بعد انھوں نے دوبارہ ویٹر کو بلایا اور پوچھا: ''تمھارے ہاں چرغہ کس طرح تیار کیا جاتا ہے، آگ پر یا گیس پر؟''

''ہمارے ہاں چرغہ بجلی کے ذریعے پکایا جاتا ہے جناب؟'' ویٹر نے ادب سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، اسے لے جاؤ اور دو تین جھٹکے اور لگا کر لے آؤ۔''

مرسلہ : عظمت حیات، پنڈ دادن خان

😊 بچہ گھر سے ڈانٹ کھا کر اسکول جا رہا

تھا۔ راستے میں کسی نے پوچھا: "بیٹا! پڑھنے جا رہے ہو؟"

بچہ غصے سے: "نہیں، اسکول کی یونی فارم پہن کر تھانے جا رہا ہوں۔"

مرسلہ : دیپا کھتری، میرپور خاص

😀 ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا: "بھئی تمھارا بیٹا انگلینڈ میں کیا کام کرتا ہے؟"

دوسرے نے جواب دیا: "وہ انگلینڈ میں D.C ہے۔"

پہلے نے حیران ہوتے ہوئے کہا: "ایک پاکستانی انگلینڈ میں D.C کیسے ہو سکتا ہے؟"

دوسرے نے جواب دیا: "بھئی D.C کا مطلب ہے ڈش کلینر۔"

مرسلہ : روبینہ ناز، کراچی

😀 ایک آدمی نے دوسرے سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "بھائی! بہت دکھ ہوا تمھارے ابا کے انتقال کا سن کر، انھیں کون سی بیماری تھی؟"

دوسرا بولا: "بھائی! بڑھاپا خود ایک بیماری ہے۔"

پہلا بولا: "ہاں بھائی! یہ بہت خطرناک بیماری ہے، پچھلے دنوں کئی بچے اسی خطرناک بیماری سے مر گئے تھے۔"

مرسلہ : راؤ محمد طاہر وقار، ملتان

😀 عابد: "مجھ میں دو خوبیاں ایسی ہیں، جو کسی میں نہیں۔"

ظافر: "کیا خوبیاں ہیں، ہمیں بھی بتاؤ۔"

عابد: "ایک تو میرا حافظہ بہت تیز ہے، ہر بات یاد رہتی ہے۔"

ظافر: "بھئی واہ، اور دوسری خوبی کون سی ہے؟"

عابد: "دوسری میں بھول گیا ہوں۔"

مرسلہ : مہر کامران، اورنگی ٹاؤن

😀 استاد نے طالب علم کو 'اگربتی' پر جملہ بنا کر لانے کے لیے کہا۔

طالب علم نے جملہ بنایا: "رات کو اگر بتی چلی جائے تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔"

مرسلہ : اسد اللہ آفریدی، قصبہ کالونی

😀 ایک ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں ہمیشہ

اپنے بل کی رقم کا خیال رہتا تھا۔ ایک مریض نے ان سے پوچھا: ''ڈاکٹر صاحب! کھجلی اور الرجی میں کیا فرق ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: ''زیادہ نہیں صرف ۳۰۰ روپے کا فرق ہے۔''

مرسلہ : دلشاد خان آفریدی، قصبہ کالونی

😊 ایک بے وقوف آدمی دوست سے بولا: ''کل کوئی میرا پرس لے گیا، جس میں دو ہزار روپے تھے۔''

دوست نے کہا: ''جھوٹ، پندرہ سو روپے تھے۔ میں نے گھر جا کر گنے تھے۔''

پہلے نے کہا: ''ارے، پیسوں کا مسئلہ نہیں ہے، تم صرف چور کا پتا کرو۔''

مرسلہ : اسریٰ خان، کراچی

😊 اسکول میں ایک بچے کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ چھٹی کے لیے کیا بہانہ کرے۔ کافی دیر بعد اس نے استاد سے کہا: ''سر! کل میرے دادا کی شادی ہے، اس لیے میں اسکول حاضر نہ ہو سکوں گا۔''

مرسلہ : حنا داد محمد بلوچ، ٹنڈو الہیار

😊 ایک بچے نے اپنے والد سے پوچھا: ''ابو! کیا ہم ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اللہ میاں کے پاس جا سکتے ہیں؟''

باپ: ''اللہ کے پاس تو ہم کار میں بیٹھ کر بھی جا سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ کار تمھاری امی چلا رہی ہوں۔''

مرسلہ : عائشہ ذوالفقار علی، سرجانی ٹاؤن

😊 ایک کنجوس آدمی نے اپنے پسندیدہ رسالے کے ایڈیٹر کو خط بھیجا: ''اگر آپ نے اپنے رسالے میں کنجوسوں کے متعلق لطیفے شائع کرنا بند نہ کیے تو میں اپنے ہمسائے سے آپ کا رسالہ مانگ کر پڑھنا بند کر دوں گا۔''

مرسلہ : ماہ نور داد محمد بلوچ، ٹنڈو الہیار

😊 تین آدمی بش کر کے ٹیکسی میں بیٹھے۔ ٹیکسی والے نے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے تھوڑی دیر بعد بند کر دی اور بولا: ''لو صاحب! پہنچ گئے۔''

پہلے نے کہا: ''شکریہ۔''

دوسرے نے پیسے دیے اور تیسرے نے ڈرائیور کو تھپڑ مار دیا۔

ڈرائیور سمجھا کہ اس کو پتا چل گیا ہے۔ بولا: ''کیا ہو گیا صاحب!''

اس نے جواب دیا: ''اتنی تیز نہ چلایا کرو، کسی دن ٹکر ہو جائے گی۔''

مرسلہ : محمد اجمل شاہین انصاری، لاہور

😃 ٹیچر، لائبہ سے: ''اے بی سی سناؤ۔''

لائبہ: ''اے بی سی۔''

ٹیچر: ''اور سناؤ۔''

لائبہ: ''اللہ کا شکر ہے آپ سنائیں۔''

مرسلہ : نادیہ اقبال، کراچی

😃 ایک بچہ رو رہا تھا۔ باپ نے رونے کی وجہ پوچھی تو بچے نے کہا: ''پہلے ایک روپیا دیجیے، تب بتاؤں گا۔''

باپ نے جلدی سے روپیا دیا اور کہا: ''بتاؤ، کیوں رو رہے تھے؟''

بچے نے کہا: ''میں اس روپے کے لیے ہی رو رہا تھا۔''

مرسلہ : اقصیٰ جاوید انصاری، سانگھڑ

😃 دروازے کی سیڑھیوں پر ایک بچے کو بیٹھا دیکھ کر ایک گشتی سیلز مین نے پوچھا: ''تمھاری امی گھر پر ہیں؟''

''ہاں۔'' بچے نے جواب دیا۔

سیلز مین: ''دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا، مگر کوئی باہر نہ آیا۔ سیلز مین نے غصے سے بچے کی طرف دیکھا اور کہا: ''تم تو کہہ رہے تھے کہ تمھاری امی گھر پر ہیں۔''

''ہاں، میری امی گھر پر ہیں، لیکن یہ گھر میرا نہیں ہے۔'' بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

مرسلہ : واجد نگینوی، کراچی

😃 ملزم نے وکیل سے کہا: ''کوشش کرنا کہ مجھے عمر قید ہو جائے، مگر سزائے موت نہ ہو۔''

وکیل: ''تم فکر نہ کرو۔''

کیس کے بعد ملزم نے پوچھا: ''کیا ہوا؟''

وکیل: ''بڑی مشکل سے عمر قید ہوئی ہے، ورنہ عدالت تو رہا کر رہی تھی۔''

مرسلہ : زینب بنت اسلام، فیصل آباد

😃 ایک بہت موٹا آدمی ڈاکٹر کے پاس دبلا ہونے کی دوا لینے گیا۔ ڈاکٹر نے پوچھا: ''تم ناشتے میں کیا کھاتے ہو؟''

اس نے جواب دیا: ''پندرہ پراٹھے اور دس چائے کے کپ۔''

ڈاکٹر: ''اب تم تین پراٹھے کھا کر ایک کپ چائے پیا کرو۔''

موٹا آدمی: ''ڈاکٹر صاحب! یہ خوراک ناشتے سے پہلے کھاؤں یا بعد میں۔''

مرسلہ : زائدہ داد محمد بلوچ، خذوالیہار

😊 راہ گیر نے بھکاری سے کہا: ''تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟''

بھکاری نے جواب دیا: ''یہ دیکھنے کے لیے کہ اس دنیا میں سخی کتنے اور کنجوس کتنے ہیں۔''

مرسلہ : اکبر علی، وہاڑی

😊 ایک صاحب چلتے چلتے ایک خشک کنویں میں گر گئے اور مدد کے لیے پکارنے لگے تو ایک آدمی نے کنویں میں جھانک کر کہا: ''کیا تم اس کنویں میں خود گرے ہو؟''

وہ صاحب جل کر بولے: ''نہیں جناب! میں یہاں کھڑا تھا، لوگوں نے میرے اردگرد دیوار بنا دی۔''

مرسلہ : مدیحہ ذکا بھٹی، شیخوپورہ

😊 ایک مسافر شہر میں نیا نیا آیا اور ایک ہوٹل میں جا بیٹھا۔ بیرے نے آ کر پوچھا تو اس نے کہا: ''ایک پلیٹ تلی ہوئی مچھلی اور ہمدردی کے دو بول بس۔''

بیرا خاموشی سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد بیرے نے مچھلی کی پلیٹ لا کر میز پر رکھی اور مسافر کے کان میں کہنے لگا: ''مچھلی نہیں کھانا، باسی ہے۔''

مرسلہ : انابیہ صوبدار، حیدرآباد

😊 شیرنی نے غار کے اندر سے اپنے بچے کو پکارا: ''بیٹا! کیا کر رہے ہو؟''

شیر کے بچے نے جواب دیا: ''امی! میں ہرن کے ساتھ درخت کے گرد چکر لگا رہا ہوں۔''

یہ سن کر شیرنی نے کہا: ''بیٹے! میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ رزق کے ساتھ کھیلا نہیں کرتے۔''

مرسلہ : سیدہ اریبہ بتول، کراچی

☆☆☆

وفادار ہاتھی

حمیرا سعید

کریم شہر سے دور ایک قصبے میں رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک ہاتھی تھا، جس کی مدد سے وہ شکار کرتا اور شہر میں بیچ دیتا۔ ایک روز کریم شکار کی غرض سے اپنی بیوی اور معصوم بیٹے احمد کو ساتھ لے کر ہاتھی پر سوار جنگل کی طرف نکل گیا۔ جنگل میں ندی سے کچھ دور اپنا خیمہ لگایا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ پانی کے لیے اس کی بیوی ہاجراں نے مٹی کا ایک گھڑا اٹھایا اور ندی سے پانی لانے کے لیے چلی گئی۔ کچھ دیر تک کریم انتظار کرتا رہا۔ جب وہ واپس نہ آئی تو کریم نے اپنے خیمہ ہی سے اُسے بلند آواز سے پکارا، مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس کے چلّانے سے جنگل میں ہر آواز بند ہو جاتی۔ آواز کی گونج سے چرند پرند سب چہچہانا بھول جاتے۔

کریم کی بیوی ہاجراں کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی، مگر وہ ابھی تک پانی لے کر نہیں چلی تھی۔ ندی کچھ دور ہی بہ رہی تھی، مگر ذرا آنکھوں سے اُوجھل ضرور تھی۔ کریم کی پریشانی اب بڑھتی جا رہی تھی۔ کریم نے ندی پر خود جانے کا فیصلہ کیا، تاکہ اپنی بیوی کو ڈھونڈ سکے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے ہاتھی کو ایک پیڑ سے باندھ دیا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھی کے اردگرد اپنے پاؤں سے ایک دائرہ بنایا اور پھر اپنے بیٹے احمد کو اس دائرے میں لٹا دیا۔ احمد ایک سال کا تھا۔

”میرے پیارے ہنی تو اس کی رکھوالی کرنا۔“

کریم اپنے ہاتھی کو پیار سے ہنی کہتا تھا۔ کریم نے اس ہاتھی کو بچپن میں اپنے ایک دوست سے خریدا تھا۔ کریم نے ہاتھی کی تربیت شکاری کے طور کی تھی۔ ہنی گھنے جنگل میں بغیر کسی خوف کے داخل ہو جاتا اور اپنے شکار کا آخر دم تک تعاقب کرتا تھا۔ ہنی کا قد دس فیٹ اور وزن چار ٹن تھا۔ اس کی موٹی موٹی ٹانگیں کسی بڑے درخت کے تنے کی مانند مضبوط

اور توانا تھیں۔ وہ مقابلے میں کئی بار ریچھوں تک کو پچھاڑ چکا تھا۔

ہنی خاص طور پر اپنے مہاوت کریم اور اس کے نونہال بیٹے احمد کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ جب کریم یا اس کی بیوی ہاجراں کو گھرداری کی طرف توجہ دینا پڑتی تو وہ یا کریم اس بھاری بھرکم چوپائے کے آگے زمین پر ایک دائرہ لگا دیتے اور پھر اس میں اپنے بیٹے احمد کو لٹا دیتے تھے۔

کریم ہاتھی کو حکم دیتا کہ وہ احمد کو اس دائرے سے باہر نہ نکلنے دے۔ یہ وفادار ہاتھی جو ایک وفادار ملازم کی طرح تھا، احمد کی رکھوالی کرتا۔ اگر احمد رینگتا ہوا اس دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو وہ اپنی سونڈ سے اُسے آہستہ آہستہ کھسکاتا ہوا مقررہ جگہ پر واپس لے آتا۔ کریم اپنے بیٹے کو اس دائرے میں چھوڑ کر خود ندی کی طرف چل دیا۔

ہنی کی سونڈ کے عین نیچے احمد بڑے مزے سے زمین پر لیٹا ہنی کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں اور ٹانگوں کو ہلا ہلا کر اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ ننھا احمد جو چاہے کر سکتا تھا، مگر جونہی وہ اس مخصوص دائرے سے باہر کھسکنے کی کوشش کرتا، یہ ہاتھی اپنی سونڈ سے اُسے دھکیل کر واپس اُسی جگہ پر پہنچا دیتا۔

ہنی نے اپنی سونڈ میں تھوڑی سی مٹی بھری اور اپنے جسم پر پھیلا دی۔ بعض دفعہ وہ مکھیاں اُڑانے کے لیے ننھے احمد پر بھی سونڈ سے تھوڑی سی مٹی پھونک دیتا اور بعض اوقات سبز گھاس کے پتے بھی احمد کے اوپر جا گرتے۔ پیڑ کے ٹھنڈے سائے میں جہاں ہنی بندھا ہوا تھا۔ وہاں ان دونوں ساتھیوں کے لیے وقت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ دوپہر ڈھلی اور جلد ہی شام کا دھندلکا شروع ہو گیا اور پھر ہلکے نیلے آسمان نے تاروں بھری چادر اوڑھ لی۔

جنگل کی ہوا میں خنکی آ چکی تھی۔ ننھے احمد نے بھوک کی وجہ سے رونا شروع کر دیا۔ کریم اور اس کی بیوی حاجراں کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ اُدھر رات کے بڑھتے

ہوئے اندھیرے میں گیدڑوں کی بھیانک آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ پرندے ڈھلتی شام میں چہچہا کر خاموش اپنے گھونسلے میں چلے گئے تھے۔ ابھی تک کریم اور اس کی بیوی کا کوئی پتا نہیں تھا۔ قریب ہی ایک لگڑ بگڑ اپنے غار سے باہر نکلا۔ وہ رات کی تاریکی میں کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اسے کچھ انسانی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ بلاشبہ لگڑ بگڑ مُردار کھاتا ہے، مگر بوقتِ ضرورت وہ چھوٹی موٹی جان دار چیزوں کو بھی شکار کر لیتا ہے، اب اس لگڑ بگڑ کے ساتھی بھی غار سے باہر نکل آئے تھے۔ جب ان درندوں نے ایک انسانی بچے کے رونے کی آواز سُنی تو وہ اپنے خوف ناک دانت نکالتے ہوئے اس آواز کی سمت چل پڑے۔

بڑھتے ہوئے اندھیرے اور خوف ناک آوازوں سے ہنی، ننھے احمد کی طرف سے پریشان ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ضرور کوئی خاص بات ہوئی ہے، جو کریم اور اس کی بیوی اب تک نہیں آئے۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے، کچھ گھاس اور پتے اپنی سونڈ میں اٹھائے اور پھر احمد کو ہوا دینے لگا، لیکن اس سے بھی بات نہ بنی۔ احمد تھا کہ چلائے جا رہا تھا۔ اب ہنی نے زور زور سے چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ وہ بلاشبہ کریم اور اس کی بیوی باجراں کو پکار رہا تھا، لیکن اس کوشش میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔ اتنے میں ہنی کو لگڑ بگڑ کے اس جوڑے کی بُو محسوس ہوئی تو وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا اور پھر اپنی سونڈ اٹھا کر مزید بُو سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ تین لگڑ بگڑ تھے۔ وہ اندھیرے میں دکھائی تو نہ دیتے تھے، مگر خاصے قریب آ رہے تھے۔ ہنی نے احمد کو اپنے اگلے پاؤں کے قریب کر لیا اور پھر ایک خوف ناک چنگھاڑ نکالی، تاکہ وہ درندے ڈر جائیں۔

ہاتھی کے سُونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے، جب کہ اس کی نظر کم زور ہوتی ہے، اس لیے ہنی ان درندہ صفت لگڑ بگڑوں کو اندھیرے میں نہ دیکھ سکا۔ جب تک کہ وہ اس کے بالکل قریب نہ پہنچ گئے۔ ان کو دیکھتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اپنے پاؤں سے بندھی زنجیر کو زور زور سے کھینچنے لگا۔ ہنی غصے سے غرّانے اور پھنکارنے لگا۔ اس کی یہ حالت

دیکھ کر لگڑ بگڑ دم بخود ہو گئے۔ ایک تو اس کے چیخ سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھ گیا اور اپنی نظریں اس معصوم احمد پر گاڑ دیں اور دوسرے درندے اس کے اردگرد چکر لگانے لگے۔

سخت غصے میں آتے ہوئے ہنی نے پیڑ کی جڑ کو ٹکریں مارنا شروع کر دیں۔ وہ اپنی پوری قوت سے پیڑ کو توڑ کر خود آزاد ہونا چاہتا تھا، تاکہ ان لگڑ بگڑوں کو مار سکے، مگر وہ کامیاب نہ ہوا، تاہم اس کی کوشش سے پیڑ اپنی جگہ سے کچھ ہل گیا تھا۔ ہنی اپنی ناکامی سے مشتعل ہو کر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس لگڑ بگڑ کی طرف لپکا، مگر وہ درندہ ایک جست لگا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

چکر لگانے والے بقیہ دو لگڑ بگڑ ہاتھی کے پیچھے سے ننھے احمد پر حملہ آور ہونے ہی والے تھے کہ ایک دم ہنی ان کی طرف مڑا۔ وہ بھی ایک جست سے اس کی پہنچ سے دور ہو گئے۔ ہنی نے پیڑ پر پھر زور آزمائی شروع کر دی۔ پیڑ کڑکڑایا۔ اب احمد بھوک کی شدت سے پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ اپنے ننھے منے ہاتھوں اور پاؤں کی مدد سے گھسٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہنی کی نظر احمد پر پڑی تو پیڑ کو چھوڑ دیا اور سونڈ کو تیزی سے ہلاتے ہوئے احمد کو اپنے قریب لے آیا۔ اب ہنی بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک طرف پیڑ سے بندھا کھڑا تھا۔ اُدھر لگڑ بگڑ بھوکے اور دلیر تھے۔ وہ ان کے قریب آنے لگے۔ وہ بڑے غور سے ہاتھی کو دیکھ رہے تھے، لیکن وہ زنجیر کی لمبائی کو بھی مدِ نظر رکھے ہوئے تھے۔

ہنی نے اچانک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حملہ کیا اور ایک لگڑ بگڑ کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل دیا۔ اپنی فتح کے جوش میں ہنی چنگھاڑا۔ اس نے اپنی سونڈ سے اس کی لاش کو ایک طرف پھینک دیا۔ اس حملے سے باقی درندے خوف کے مارے بھاگ گئے اور پھر احمد اور اس کے وفادار ہنی کو چند گھنٹوں کے لیے سکون میسر آ گیا۔ بھوک سے نڈھال ننھا احمد کچی نیند میں سسکیاں بھر رہا تھا۔ اتفاق سے قریب ہی گنے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پڑا تھا۔ ہنی نے اپنی سونڈ سے گنے کا ٹکڑا اٹھا کر احمد کے منھ کے آگے کیا۔ احمد نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں

سے اُسے پکڑ لیا اور اسے چُومنے لگا اور پھر ہنی کی سانس کی گرمی سے سکون محسوس کرتے ہوئے احمد سو گیا۔ آدھی رات سے کچھ دیر بعد ہنی کو بھی نیند آ گئی۔

صبح چڑیوں کے چہچہانے سے احمد کی آنکھ کھل گئی اور وہ رینگنے لگا۔ جب ہنی کی آنکھ کھلی تو احمد رینگتا ہوا اس کی پہنچ سے دور نکل چکا تھا۔ صبح کی روشنی میں ہاتھی نے کچھ لکڑبگڑوں کو واپس آتے دیکھا، تو ہنی نے احمد کی طرف دیکھا، جو اس سے کئی گز دور تھا۔ ہنی نے اپنے آپ کو پوری قوت سے کھینچا۔ لوہے کی مضبوط زنجیر کی کڑیاں اس کے پاؤں کی کھال میں دھنس گئیں۔ اس کے ٹخنوں سے خون بہنے لگا۔ لکڑبگڑوں کو موقع ملا اور وہ تیزی سے احمد کی طرف دوڑے اور اُسی لمحے ہنی نے زور سے اپنا پاؤں کھینچا تو بڑا پیڑ ٹوٹ کر ہاتھی اور ننھے احمد کے اوپر آن گرا۔ اس کی گھنی شاخوں اور پتوں نے دونوں کو اپنے اندر چھپا لیا۔ یہ دیکھ کر لکڑبگڑ خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔

ادھر کریم کی بیوی پھسل کر ندی میں گر گئی اور بد حواسی میں تیرتے ہوئے کنارے تک چلی گئی تھی۔ کریم بھی وہاں تک پہنچ گیا تھا، لیکن اس وقت ندی کا پانی کافی چڑھ چکا تھا۔ صبح جب کریم اور اس کی بیوی ہاجراں ہانپتے کانپتے اپنے خیمے میں واپس آئے تو انھیں صرف گرا ہوا پیڑ اور اس کے نیچے پڑا ہاتھی دکھائی دیا۔ ''اور ان کا ننھا احمد؟''

یہ دیکھ کر دونوں میاں بیوی گھبرا کر پیڑ کی شاخیں توڑ کر ہاتھی تک پہنچے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا معصوم احمد، ہنی کی سونڈ کے قریب بڑے آرام سے سویا ہوا ہے۔ ماں نے سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے بیٹے کو جلدی سے اُٹھا لیا اور پیار کرنے لگی۔ احمد مٹی میں لت پت تھا، اسے کچھ خراشیں بھی آئی تھیں، مگر وہ صحیح سلامت تھا۔

''اور ہنی؟''

وہ آنکھیں بند کیے پیڑ کے نیچے پڑا تھا

کریم غصے سے بولا: ''بے وقوف! غدار جانور! کیا ہمارا بیٹا تمھارے لیے کچھ بھی

نہیں تھا۔ جو تم نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے پیڑ ہی کو گرا دیا۔

اس نے اپنا کلہاڑا اُٹھایا اور پیڑ کی شاخیں کاٹنا شروع کر دیں، تاکہ ہاتھی کو آزاد کر سکے۔ اس کی بیوی اپنے بیٹے کو گود میں لیے ڈور کھڑی خوف ناک رات کے بارے میں سوچ کر کانپ رہی تھی، مگر وہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھی کہ وہ اور اس کا بیٹا زندہ ہیں۔

کریم نے شاخیں کاٹ کر ہاتھی کے اُٹھنے کے لیے جگہ بنائی اور اس کی زنجیر کھول دی۔ اس کی بیوی نے کہا: ''یہ زخموں کی وجہ سے اُٹھ نہیں سکتا، اس نے خود کو زخمی کیا ہوا ہے۔'' یہ سنتے ہی ہنی نے اپنے اگلے پاؤں زمین پر جمائے اور شاخوں کو توڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے، جن میں سے خون بہ رہا تھا اور وہ تکلیف سے کانپ رہا تھا۔

کریم نے نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''تم غدار اور بے وفا جانور ہو، جاؤ میں نے تمھیں آزاد کیا۔''

ہنی جھک گیا اور ندامت سے اپنی سونڈ اپنے منہ میں سمیٹ لی، جیسے وہ اپنی غلطی کی معافی مانگ رہا ہو یا کسی اور بات کا احساس دلا رہا ہو۔

''اِدھر دیکھو، کریم!'' اس کی بیوی اچانک بولی۔

جب ہنی شاخوں میں سے اُٹھا تھا، تو وہاں قریب ایک لگڑ بگڑ کی لاش پڑی تھی اور ہر طرف لگڑ بگڑ کے پاؤں کے نشان تھے۔

کریم اور اس کی بیوی کو جلد ہی احساس ہو گیا اور وہ ساری بات جان گئے کہ ہنی غدار یا بے وفا نہیں تھا۔ اس نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔

کریم ہنی کی سونڈ کو بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے بولا: ''میرے دوست! مجھے معاف کر دو، میں نے تم پر شبہ کیا۔'' ☆

دادی کی باتیں

انور فرہاد

"اے بوا! اب تو صرف دو ہی اوور رہ گئے ہیں۔"

ابھی یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ یہ کہنے والے بچے کو اس کے ساتھیوں نے دھکا دیا اور وہ پانی اور کیچڑ میں جا گرا۔ دوسری طرف دادی اماں نے دُہائی دینا شروع کر دی:
"ہائے ہائے! ان کمینے لونڈوں کو روکنے والا کوئی نہیں؟ کل بھی اسی طرح انھوں نے کیچڑ میں اسے دھکیلا تھا، آج بھی وہی کیا۔"

دادی اماں ٹی وی پر چلنے والے اشتہار کو دیکھ کر سر پیٹ رہی تھیں اور ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

"اے کم بختو! بجائے اس کے کہ تم لوگ ہی ان شریر بچوں کو روکو، منع کرو کہ اس طرح تو وہ بیمار پڑ جائے گا۔ اُلٹا مجھ پر ہنس رہے ہو۔ ہاہا کر کے قہقہے لگا رہے ہو۔"

دادی اماں کی ایسی ہی بھولی بھالی باتوں سے آج کل ہمارا گھر زبردست تفریح گاہ بنا ہوا ہے۔ اب ہم لوگوں کو تفریح کے لیے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

دادی اماں، ہماری اصلی دادی اماں نہیں۔ ہمارے ابو کی دور کے رشتے سے چچی یا پھوپی لگتی ہیں۔ پچھلے دنوں ابو اپنے آبائی گاؤں گئے تھے۔ وہاں سے لوٹتے وقت انھیں ساتھ لیتے آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا کوئی قریبی رشتے دار اب زندہ نہیں بچا ہے اور وہ اِس کے، اُس کے گھر میں پڑی رہتی ہیں، اس لیے میں انھیں اپنے ساتھ لے آیا۔ اب یہیں رہیں گی۔ امی کو ابو کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ اس گرانی کے دور میں انھوں نے

ایک شخص کا خرچ اور بڑھا لیا، مگر جب آہستہ آہستہ دادی اماں کے جوہر کھلے تو ان کی شکایت دور ہو گئی اور وہ بھی ہم بچوں کی طرح ان میں دل چسپی لینے لگیں۔

دادی اماں ٹی وی بہت شوق سے دیکھتی ہیں۔ ٹی وی اسکرین پر کوئی بھی مرد والی شکل نظر آتی ہے تو وہ فوراً لمبا سا گھونگھٹ نکال لیتی ہیں یا اپنی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ لیتی ہیں۔ پہلی بار جب ٹی وی پر انھیں ایک مرد نظر آیا تھا تو وہ منھ پر آنچل رکھ کر ٹی وی لاؤنج سے باہر جانے لگیں۔ امی نے انھیں ٹوکا: ''امی جان! آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''اے ہے، تم دیکھ نہیں رہی ہو تمھارے کمرے میں ایک مرد گھس آیا ہے۔''

''آپ بیٹھیے! میں اسے بھگا دیتی ہوں۔'' کہتے ہوئے امی نے ریموٹ کا بٹن دبا کر چینل بدل دیا۔ پھر آہستہ آہستہ انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ ٹی وی میں نظر آنے والے مردوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ ٹی وی سے نکل کر ہماری طرف نہیں آئیں گے۔ پتا نہیں انھیں ہماری باتوں کا کس حد تک یقین آیا۔ اب وہ مردوں کو دیکھ کر ٹی وی لاؤنج سے بھاگتی تو نہیں ہیں، مگر اپنے ہاتھوں یا آنچل سے اپنا چہرہ چھپا لیتی ہیں۔

شب برات کی آمد آمد تھی۔ ہم سب اپنا اپنا پروگرام امی کو بتا رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ چنے کا حلوا، کوئی مشورہ دے رہا تھا کہ گاجر کا حلوا، کوئی کہہ رہا تھا کہ لوکی کا حلوا۔ جب کہ امی نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا: ''اس بار کسی قسم کا کوئی حلوا نہیں بنے گا۔''

ہم سب تو ڈر کے مارے خاموش رہے، مگر دادی اماں بول پڑیں: ''کیوں بھئی! حلوا کیوں نہیں بناؤ گی؟''

امی نے کہا: ''اماں جی! اتنی گرانی ہے، گھی، چینی، دال، سب میں آگ لگی ہوئی ہے۔ کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ کے خرچ کی۔''

''مگر......'' دادی اماں گال پر ہاتھ رکھ کر فکر مند لہجے میں بولیں: ''تم نے یہ بھی سوچا، تم حلوا نہیں پکاؤ گی، فاتحہ نہیں دو گی، تو تمھارے گھر آنے والے مُردوں کو کیا مایوسی نہیں ہوگی؟''

''دادی اماں!'' میں جھٹ بول پڑی: ''کیا شب برات کے دن مُردے قبروں سے نکل کر گھروں میں آتے ہیں؟''

''ہاں...... کیا تم لوگوں کو نہیں معلوم؟ ہم تو بچپن سے سنتے آئے ہیں۔''

آج ہے شب برات	بہو ساس سے لڑی
سسر نے مارا ڈنڈا	بہو دھڑ سے گر پڑی
آئیں گے چار مُردے	بیٹھیں گے دو گھڑی
کھائیں گے حلوا، روٹی	چھوڑیں گے پھلجھڑی

''ہائے دادی اماں!'' شریر ابراہیم نے دادی اماں کی نقل کرتے ہوئے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''بڑا مزہ آتا ہوگا، جب مُردے حلوا روٹی کھا کر پھلجھڑیاں چھوڑتے ہوں گے؟''

پھر ایک دم مایوس ہو کر بولا: ''ہمارے گھر میں تو کوئی مُردہ نہیں آتا۔''

دادی اماں کے بجائے رومیسا پٹ سے بول پڑی: ''کوئی مُردہ آئے بھی تو کیسے؟ ہمارے قبرستانوں میں تو شب برات کے دن اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ زندہ لوگوں کے لیے ہی

آ نا جانا مشکل ہوتا ہے۔ بے چارے مُردے قبر سے نکل کر آ نا چاہیں بھی تو......"

"تم تو کہاں کھا گئی ہو۔" تسبیحہ نے رومیسا کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "انھیں قبروں سے نکل کر آنے کی کیا ضرورت پڑی ہے، جب وہیں ان کی قبروں پر پھولوں کی بارش برسائی جائے تو......"

"یہ تم لوگ کیا بکواس کرنے لگے؟" امی نے ڈانٹ پلائی تو سب خاموش ہو گئے۔ پھر جب وہ وہاں سے چلی گئیں تو سبیکا نے کانا پھوسی کے انداز میں دادی اماں کو مخاطب کیا: "دادی اماں! کیا آپ کے گھروں میں آنے والے مُردوں کو دیکھ کر آپ لوگوں کو ڈر نہیں لگتا تھا؟"

دادی بولیں: "کیسا ڈر؟"

سبیکا نے کہا: "ہم نے تو ٹی وی پر جن مُردوں کو قبر سے نکلتے دیکھا ہے وہ ہڈیوں کے ڈھانچے ہوتے ہیں، جنھیں دیکھ کر لوگوں کی چیخ نکل پڑتی ہے۔"

"پتا نہیں، ہم نے تو ایسے مُردے کبھی نہیں دیکھے۔" دادی نے کہا۔

میں نے پوچھا: "تو پھر آپ کے ہاں کیسے مُردے حلوا کھانے اور پھلجھڑی چھوڑنے آتے تھے؟"

دادی بولیں: "بھئی، ہم نے تو کوئی مُردہ کبھی نہیں دیکھا۔ مُردوں کے نام کی جو حلوا روٹی پر نیاز دلوائی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہیں رہتی پھر فقیروں کو دے دی جاتی تھی۔"

ابراہیم نے حیرت سے کہا: "تو پھر وہ پھلجھڑی بھی نہیں چھوڑتے ہوں گے؟"

دادی نے بتایا: ''یہ کام تو کلوا کرتا تھا۔''

میں نے پوچھا: ''یہ کلوا کون تھا؟''

دادی نے کہا: ''یہ ہمارا بھائی تھا۔ اور نام اس کا کلیم الدین تھا، مگر پہلے وہ کلو کہلاتا تھا، جو بعد میں کلوا مشہور ہو گیا۔ کلوا حلوا کھا کر پھلجھڑیاں چھوڑتا، پٹاخے چھوڑتا پھر گھر آ کر لمبی تان کر سو جاتا۔ ہماری اماں خوب صلواتیں سناتیں: ''اے ہے کمبخت! مُردے کی طرح آ کر ڈھیر ہو گیا۔ یہ بڑی رات ہے۔ اس رات کو سال بھر کی روزی روٹی تقسیم ہوتی ہے۔ دکھ سکھ بانٹے جاتے ہیں۔ جا، اپنے حصے کی خیر و برکت مانگ۔''

''کہاں جاؤں اماں!'' کلوا بڑی بے زاری سے کہتا۔

''اور کہاں جائے گا، مسجد جا اور رات بھر عبادت کر، پاک پروردگار سے، اپنے لیے اور اپنے گھر بھر کے لیے گڑگڑا کر خیر و برکت کی دعا مانگ۔''

''پھر وہ چلے جاتے ہوں گے؟''

''بڑا بدنصیب تھا وہ۔ جاتا بھی تو اپنے جیسے لڑکوں کے ساتھ غل غپاڑہ کرتا اور پھر وہیں مسجد میں سو جاتا۔ گھر میں بھی وہ کوئی نیک کام نہیں کرتا تھا۔ ہمارے ساتھ گھر میں چراغ بھی نہیں جلاتا تھا۔''

''چراغ جلانا بھی کیا نیک کام ہوتا ہے؟ دادی اماں!'' امتثال پوچھ بیٹھی۔

دادی نے حیرت سے پوچھا: ''اچھا تو کیا تم لوگ یہ نیک کام نہیں کرتے شب برات کو؟ ہماری اماں تو گھی کے چراغ جلاتی تھیں۔''

میں نے کہا: ''ہماری امی تو گھی مہنگا ہونے کی وجہ سے حلوا نہیں پکاتیں، وہ گھی

کے چراغ کیسے جلائیں گی؟''

''ہائے اللہ!'' دادی حیرت سے گال پر ہاتھ رکھ کر بولیں: ''تمھارے ہاں حلوا نہیں پکایا جاتا، چراغ نہیں جلایا جاتا، تو پھر تم لوگ شب برات کیسے مناتے ہو؟''

''ہم لوگ......'' میں نے انھیں سمجھایا: ''دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو عبادت کرتے ہیں۔ گھر کے سارے مرد مسجدوں میں جا کر اور عورتیں گھر میں رہ کر تلاوت کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں، اپنی صحت اور تن درستی کی دعائیں، اپنے ایمان کی سلامتی کی دعائیں، خیر و برکت کی دعائیں، ملک اور قوم کے لیے امن اور استحکام کی دعائیں۔ ہماری امی کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس برکت والی رات کو اپنے بندوں سے کہتے ہیں: ''مانگو، جو کچھ مانگنا چاہتے ہو۔''

دادی اماں منھ کھولے حیرت سے مجھے تکتی رہیں۔ وہ کچھ نہیں بولیں تو میں نے ہی اپنی بات آگے بڑھائی: ''دادی اماں! یہ نہ سمجھیے گا کہ سارے ہی گھر ہمارے گھر جیسے ہیں۔ یہاں بھی ایسے گھروں کی کمی نہیں، جہاں گلو جیسے لوگ حلوا کھا کر اور پٹاخے چھوڑ کر اور گھروں میں بجلی کے قمقمے جلا کر شب برات مناتے ہیں۔ شب برات کے اصل مقصد سے بے خبر ہیں۔ اللہ ایسے سارے گم راہ لوگوں کی ہدایت فرمائے۔''

سارے بچوں نے یک آواز کہا: ''آمین۔''

☆☆☆

شکریہ

جدون ادیب

رحمٰن صاحب شہر کے ایک بڑے صنعت کار ہیں۔ وہ فلاحی کاموں میں آگے آگے رہنے کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہیں۔ دیانت دار اور سخی انسان ہیں۔ میں ایک فیچر رائٹر ہوں، اس لیے انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں ان کی ایک خاص میٹنگ کی رکارڈنگ سن کر اس کی روداد لکھ دوں۔ کام کافی تھا۔ میں نے دس ہزار روپے معاوضہ طلب کیا، لیکن انھوں نے مجھے سات ہزار روپے پر راضی کر لیا۔

مقررہ وقت پر میں نے کام کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ انھیں کام پسند آیا۔ اگلے دن معاوضہ لینے گیا تو انھوں نے مجھے سات ہزار کے بجائے دس ہزار روپے دے دیے۔ میں نے بے دھیانی میں اس اضافی عنایت پر ان کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ وہاں سے میں ایک اخبار کے دفتر گیا اور وہاں سے کام لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس دوران میرا دوست عاصم ملا۔ وہ دکان پر موبائل کارڈ فروخت کرتا تھا۔ اس نے مجھے تین ہزار روپے دیے کہ میں آتے ہوئے اس کے لیے موبائل کمپنی سے کارڈ لیتا آؤں۔

میں گھر جانے کے لیے بس میں چڑھا تو گاڑی میں بہت ہجوم تھا۔ دروازے پر زیادہ لوگ کھڑے تھے۔ میں پھنس پھنسا کر اندر گھسا تو مجھے ایک آدمی نے دانستہ دھکا دیا، دوسرے نے میری ایک جیب سے عاصم کے دیے ہوئے تین ہزار روپے نکال لیے اور چلتی گاڑی سے اُتر گیا۔ میرے دس ہزار روپے محفوظ رہے۔ یہ سب چند لمحوں میں ہوا۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس جیب کترے کا ساتھی کون ہے۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ اس کے پاس بڑا سا تھیلا ہے، جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا ہے۔

فوری طور پر اگر میں اس کے خلاف کچھ کرتا تو بظاہر وہ بے گناہ نظر آتا کہ اس کے دونوں ہاتھ تو تھیلے پر ہیں، وہ کیسے جیب کاٹ سکتا ہے، مگر یہ وہی شخص تھا، جس نے مجھے دھکا دیا تھا۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا، مگر وہ بھی پھرتیلا نکلا اور چلتی گاڑی سے کود گیا۔ میں بے بسی سے ہاتھ ملتا رہ گیا۔

گاڑیوں میں اسی طرح جیب کترے آپس میں مل کر جیبوں کا صفایا کرتے ہیں۔ ہماری توجہ اس آدمی پر چند لمحوں کے لیے ہوتی ہے، جو ہمیں دھکا دیتا ہے یا ایک طرف دباتا ہے اور اسی ایک دو سیکنڈ میں دوسرا ماہر جیب کترا اپنا کام کر دکھاتا ہے۔

میں بہت پریشان ہو گیا۔ تین ہزار کی رقم میرے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ میرے کئی کام اس سے ہو سکتے تھے۔ پھر میں نے عاصم کے لیے اپنے دس ہزار میں سے کارڈ خرید لیے، کیوں کہ عاصم کو کارڈ پہنچانا میری ذمے داری تھی۔

اس دن رات کو جب میرے بیوی بچے سو گئے تو میں نے دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں سوچا۔ تین ہزار روپے کا صدمہ پھر محسوس ہوا اور غیر ارادی طور پر میرے منھ سے نکلا کہ واہ میرے مولا! تو نے تین ہزار روپے زیادہ دیے اور تھوڑی دیر میں ہی واپس بھی لے لیے۔

یہ بات میرے منھ سے نکل تو گئی، مگر اگلے ہی لمحے میں شرمندہ بھی ہوا۔ مجھے اپنی خود غرضی، ناشکری اور چھوٹے پن پر بہت ندامت ہوئی۔
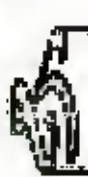
اگلے ہی لمحے میں توبہ کرنے لگا۔ جب اللہ تعالیٰ سے میں معافی مانگ رہا تھا تو میرے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میرا تین ہزار کا نقصان کیوں ہوا ہے۔

بات یہ تھی کہ عبدالرحمن صاحب نے مجھے تین ہزار روپے زیادہ اس لیے دیے تھے کہ میں نے دس ہزار مانگے تھے اور انھوں نے سات ہزار کہے اور میں نے بغیر حجت کیے ان کی بات مان لی۔ کام معیاری کیا تو انھیں لگا کہ اس کام کا معاوضہ دس ہزار ہی بنتا ہے لہٰذا انھوں نے مجھے دس ہزار دے دیے۔ میں اس وقت ان کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا۔ میں اس غرور میں مبتلا تھا کہ مجھے میرا حق ملا ہے، یہ کوئی احسان نہیں اور اس کیفیت کے زیرِ اثر میں خدا کا شکر بھی ادا نہ کر سکا۔

یہ ناشکری والی بات تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ شکرگزار بندوں کو پسند کرتا ہے اور ناشکروں سے نعمتیں واپس لے لیتا ہے اور میں نے نہ تو خدا کا شکر ادا کیا تھا اور نہ اس کے بندے کا اور میرا نقصان ہونے کی بھی یہی وجہ تھی، ورنہ میرا سارا نقصان کیوں نہ ہوا۔

میں نے سوچا کہ خدا کے بعد ان کا شکریہ بھی ادا کردوں، پھر خیال آیا کہ کافی دیر ہو چکی ہے۔ میرا ضمیر مجھے شرمندہ کر رہا تھا اور میں عجیب الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ "شکریہ" کتنا میٹھا اور خوب صورت لفظ ہے، ادا کرنا بھی کتنا آسان ہے۔ میں فقط یہ ایک لفظ ادا نہ کرنے کی سزا پا چکا تھا۔

☆☆☆

انعامی سلسلہ ۲۲۲

معلومات افزا

سلیم فرخی

معلومات افزا کے سلسلے میں حسب معمول ۱۶ سوالات دیے جا رہے ہیں۔ سوالوں کے سامنے تین جوابات بھی لکھے ہیں، جن میں سے کوئی ایک صحیح ہے۔ کم سے کم گیارہ صحیح جوابات دینے والے نونہال انعام کے مستحق ہو سکتے ہیں، لیکن انعام کے لیے گیارہ سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے نونہالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر ۱۶ جوابات صحیح دینے والے نونہال ۱۵ سے زیادہ ہوئے تو چودہ نام قرعہ اندازی کے ذریعے سے نکالے جائیں گے۔ قرعہ اندازی میں شامل ہونے والے باقی نونہالوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ گیارہ سے کم صحیح جوابات دینے والوں کے نام شائع نہیں کیے جائیں گے۔ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ جوابات صحیح دیں اور انعام میں ایک اچھی سی کتاب حاصل کریں۔ صرف جوابات (سوالات نہ لکھیں) صاف صاف لکھ کر کوپن کے ساتھ اس طرح بھیجیں کہ ۱۸- جون ۲۰۱۴ء تک ہمیں مل جائیں۔ جوابات کے کاغذ پر بھی اپنا نام پتا بہت صاف لکھیں۔ ادارہ ہمدرد کے ملازمین / کارکنان انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔ ☆

۱۔ حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ کے .... تھے۔ (بھائی ۔ والد ۔ دادا)

۲۔ حضرت اسماعیلؑ کے .... بیٹے تھے۔ (بارہ ۔ چودہ ۔ سولہ)

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت ابو طالب کے ساتھ پہلا تجارتی سفر ملک .... کی طرف کیا تھا۔ (ایران ۔ چین ۔ شام)

۴۔ نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان .... کے مقام پر جنگ ہوئی تھی۔ (پانی پت ۔ میسور ۔ پلاسی)

۵۔ روم .... کا دارالحکومت ہے۔ (اٹلی ۔ یونان ۔ مصر)

۶۔ یورپ میں مسلم اکثریت والا واحد ملک .... ہے۔ (البانیا ۔ بلغاریہ ۔ رومانیہ)

۷۔ "امونیم کلورائیڈ" (AMMONIUM CHLORIDE) کو اردو میں .... کہتے ہیں۔ (سوڈا ۔ گندک ۔ نوشادر)

۸۔ دنیا کا سب سے تیز دوڑنے والا جانور .... ہے۔ (گھوڑا ۔ کتا ۔ چیتا)

۹۔ آذربائیجان کا سکہ .... کہلاتا ہے۔ (پیسو ۔ منات ۔ روبل)

۱۰۔ موجودہ چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس .... ہیں۔ (عبدالحمید ڈوگر ۔ محمد افتخار حسین چودھری ۔ تصدق حسین جیلانی)

۱۱۔ کوٹلی .... کا ایک شہر ہے۔ (سندھ ۔ پنجاب ۔ آزاد کشمیر)

۱۲۔ حق کی جمع .... ہے۔ (حقائق ۔ حقوق ۔ حقیقت)

۱۳۔ "خان" .... زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب ہے سردار۔ (فارسی ۔ ترکی ۔ مصری)

۱۴۔ اردو زبان کا ایک محاورہ ہے: "ناک پر .... نہ بیٹھنے دینا۔" (مچھر ۔ مکھی ۔ چیونٹی)

۱۵۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کی پہلی بیوی کا نام .... تھا۔ (رقیہ بیگم ۔ ہاجرہ بیگم ۔ جہانگیرہ بیگم)

۱۶۔ مشہور شاعر میر مہدی مجروح کے اس شعر کا دوسرا مصرع مکمل کیجیے:

کیا ہماری نماز، کیا روزہ
بخش دینے کے .... بہانے ہیں (کئی ۔ یہ ۔ سو)

کوپن برائے معلومات افزا نمبر ۲۲۲ (جون ۲۰۱۴ء)

نام : ______________________

پتا : ______________________

____

____

کوپن پر صاف صاف نام، پتا لکھیے اور اپنے جوابات (سوال نہ لکھیں، صرف جواب لکھیں) کے ساتھ لفافے میں ڈال کر دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۷۴۶۰۰ کے پتے پر اس طرح بھیجیں کہ ۱۸- جون ۲۰۱۴ء تک ہمیں مل جائیں۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام لکھیں۔ کوپن کو کاٹ کر جوابات کے صفحے پر چپکا دیں۔

کوپن برائے بلا عنوان انعامی کہانی (جون ۲۰۱۴ء)

عنوان : ______________________

نام : ______________________

پتا : ______________________

____

یہ کوپن اس طرح بھیجیں کہ ۱۸- جون ۲۰۱۴ء تک دفتر پہنچ جائے۔ بعد میں آنے والے کوپن قبول نہیں کیے جائیں گے۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام اور ایک عنوان لکھیں۔ کوپن کو کاٹ کر کارڈ سائز کے کاغذ پر درمیان میں چپکا دیے۔

نونہال ادیب

لکھنے والے نونہال

فہد شاہ، زینب شاہ، نوگزئی، مانسہرہ	محمد صالح مراد، سکھر
محمد ہمایوں طارق، ملتان	ہادیہ نیاز احمد، لانڈھی، کراچی
محمد عرفان حیدر، سانگھڑ	محمد احتشام کاظم، شیخوپورہ
ایمان اسلم علی، کراچی	عبدالقادر، کراچی

اعراف نعیم الدین انصاری، کراچی

علم کی اہمیت

فہد شاہ، زینب شاہ، نوگزئی، مانسہرہ

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ علم کے معنی ہیں جاننا۔ دنیاوی اور دینی علوم دونوں حاصل کرنے چاہییں۔ جو علم حاصل نہیں کرتا وہ بعد میں پچھتاتا ہے۔ علم کے بارے میں ایک حدیث یہ بھی ہے کہ "ماں کی گود سے لے کر قبر تک علم حاصل کرو۔"

دنیا میں وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو تعلیم یافتہ ہوں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کے اسکولوں کی تعداد کم ہے۔ لڑکیوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔ اگر لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کریں تو ہماری قوم ترقی یافتہ قوم کہلائے گی۔ اسلام میں علم کی فضیلت و اہمیت بہت ہے۔

مرزا اسداللہ خاں غالب

محمد ہمایوں طارق، ملتان

مرزا اسداللہ خاں غالب شاعر تھے اور نثر نگار بھی، اس لیے انھوں نے نظم و نثر

دونوں میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ کتابیں فارسی میں ہیں اور اردو میں بھی۔ غالب کے دادا کا نام قوقان بیگ تھا۔ ان کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا۔ عبداللہ بیگ کی شادی آگرے میں عزت النساء بیگم سے ہوئی۔ عزت النساء کی ایک چھوٹی بیٹی (جسے خانم کہا جاتا تھا) اور دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام مرزا محمد اسد اللہ بیگ خاں تھا اور دوسرے مرزا یوسف اللہ خاں کہلاتے ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں نے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے ''اسد'' تخلص رکھا پھر غالب لکھنے لگے۔

غالب نے چودہ پندرہ سال کی عمر سے مستقل طور پر شاعری شروع کر دی تھی۔ پہلے فارسی کے ایک بڑے شاعر ''بیدل عظیم آبادی'' کے انداز میں غزلیں کہتے تھے، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے بیدل کی تقلید چھوڑ دی، کیوں کہ دوسروں کی تقلید یا نقالی کر کے کوئی بڑا آدمی نہیں بنتا۔ بڑا آدمی بننے کے لیے نیا راستہ اختیار کرنا اور مشکلوں کا مقابلہ کر کے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ مرزا غالب میں شوخی اور مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ پھلوں میں مرزا غالب کو آم بہت پسند تھے۔ ان کے دوست دور دور سے ان کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور غالب اپنے بعض دوستوں سے تقاضا کر کے بھی منگواتے تھے۔

مرزا کی نیت آموں سے کبھی نہ بھرتی تھی۔ نواب مصطفیٰ خاں بیان کرتے ہیں کہ ایک محفل میں مولانا فضل الحق اور دیگر احباب موجود تھے اور آم کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے دے رہا تھا کہ آم میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہییں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی رائے دے چکے تو مولانا فضل الحق نے مرزا سے

کہا کہ تم بھی اپنی رائے دو۔

مرزا نے کہا: "بھئی! میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہییں، میٹھا ہو اور بہت ہو۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔

احسان فراموش چوہا

محمد عرفان حیدر، سانگھڑ

ایک گھنے جنگل میں ایک بزرگ رہا کرتے تھے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دن جب وہ عبادت میں مشغول تھے تو اُن کی گود میں ایک چوہا آ گرا، جو ایک اُڑتے ہوئے کوے کی چونچ سے چھوٹ گیا تھا۔ بزرگ نے اسے پیار سے اُٹھایا اور شفقت سے اس کی پرورش کرنے لگے۔

ایک دن اچانک ایک بلی اس چوہے پر جھپٹ پڑی اور چوہا اپنی جان بچانے کے لیے بزرگ کی گود میں کود پڑا۔ بزرگ نے پیار سے کہا کہ کیا تمھیں بلی سے ڈر لگتا ہے؟ کیوں نا تمھیں بلی ہی بنا دوں! جاؤ اور بلی بن جاؤ۔ بزرگ نے اللہ سے دعا کی اور اسے سچ مچ بلی بنا دیا۔

مگر بلی بھی تو کتوں سے ڈرتی ہے اور وہی ہوا، ایک دن اس بلی پر ایک کتے نے حملہ کر دیا اور بلی جلدی سے بزرگ کے پاس آ گئی۔ بزرگ نے پوچھا کہ کیا اب تمھیں کتے سے ڈر لگنے لگا ہے؟ جاؤ اور تم بھی کتا بن جاؤ۔ بزرگ کے دعا کرنے کی دیر تھی اور بلی کتا بن گئی۔

لیکن کیا کتا شیر کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ اس لیے اسے بھی شیر سے ڈر لگتا تھا۔ بزرگ نے کہا میں دعا کروں گا، پھر تم بھی شیر بن جاؤ گے۔ کم از کم پھر تو تمھیں کسی سے ڈر نہیں لگے گا نا! اور پھر سچ مچ وہ کمزور کتا دیکھتے ہی دیکھتے ایک طاقت ور شیر بن گیا۔

شیر نے سوچا کہ جب تک یہ بزرگ زندہ رہیں گے مجھے بھی اپنا پرانا روپ یاد آتا رہے گا، اس لیے انھیں ختم کرنے میں ہی میری بھلائی ہے۔ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ اس سے پہلے کہ شیر بزرگ پر حملہ کرتا، بزرگ نے اس کے ارادوں کو

بھانپ لیا اور بولے: "جاؤ، احسان فراموش! دوبارہ چوہا بن جاؤ۔ تم اسی لائق ہو۔" اور وہ طاقت ور شیر پھر سے چوہا بن گیا۔

مٹھو بیٹا ہوا سویرا

مرسلہ : ایمان اسلم علی، کراچی

مٹھو بیٹا! ہوا سویرا
جاگو دیکھو گیا اندھیرا
آزادی کے گیت سناؤ
پنجرے سے اب باہر آؤ
مور ، کبوتر ، چڑیا جاگی
چوہا دوڑا ، بلی بھاگی
روشن صبح آئی ملنے
پھول لگے شاخوں پہ کھلنے
خوشبو سے مہکی ہیں فضائیں
جھوم رہی ہیں خوب ہوائیں
ہاتھ پہ بیٹھو ہاتھ نہ دھر کے
تم بھی تو ایک فرد ہو گھر کے
آؤ مل کر کام کریں ہم
محنت صبح و شام کریں ہم
اچھوں کے سب کام ہیں اچھے
سچ ہی بولیں سچے بچے
وقت جو پل میں اُڑ جاتا ہے
لوٹ کے پھر کب ہاتھ آتا ہے

حق دار چور

محمد صالح مراد، سکھر

وہ کمرے میں داخل ہوا تو سیٹھ فرحان چونک اُٹھے۔ وہ سیٹھ کو چونکتا ہوا دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔ سیٹھ فرحان کو وہ شخص جانا پہچانا لگ رہا تھا، مگر وہ اس سے باتیں کر کے بھی پہچان نہ پائے تھے۔

سیٹھ فرحان کا چوکیدار نوکری چھوڑ گیا تھا، انھوں نے ایک چوکیدار کے لیے اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ نوکری کے لیے صرف چار افراد آئے تھے۔ سیٹھ فرحان نے اس کا تجربہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کو نوکری پر رکھ لیا۔ وقت تیزی سے گزر گیا۔ سات سال گزرنے کے بعد بھی اس نے کبھی

شکایت کا موقع نہیں دیا۔

ایک بار سیٹھ فرحان کے بھتیجے کی شادی تھی، جس میں سب کی شرکت ضروری تھی، اس لیے وہ اپنے چوکیدار کو گھر کا نگران بنا کر چلے گئے۔

ایک ہفتے بعد جب وہ شادی سے واپس آئے تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سیٹھ فرحان اپنے بنگلے کی اندرونی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم سے دوسرے کمروں کی طرف دوڑ پڑے، جیسے جیسے وہ آگے جاتے جا رہے تھے، ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ چوکیدار تو سات برس سے ان کے گھر پر ملازمت کر رہا تھا۔ اگر کوئی ان کے چوکیدار کے بارے میں رائے لیتا تو وہ اس کی ایمان داری پر قسم کھانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے، مگر آج وہ غائب تھا اور ان کے بنگلے کا سارا سامان غائب تھا۔

ان کے گھر میں اب پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ انھیں فوراً اپنے گھر میں رکھی ہوئی نقدی اور قیمتی زیورات یاد آئے انھیں یقین تھا کہ وہ محفوظ ہوں گے۔ وہ اپنے بیڈ روم کی طرف دوڑے، انھوں نے لاکر کا ہینڈل گھمایا تو ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، کیوں کہ لاکر کا ہینڈل آسانی سے گھوم گیا اور لاکر کھل گیا۔ اندر نظر پڑتے ہی ان کا سر چکرانے لگا، کیوں کہ لاکر خالی تھا۔ لاکر میں ایک لفافہ پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے اس کو کھول کر دیکھا تو لکھا ہوا تھا:

"سلام! سیٹھ فرحان! میں چاہتا تھا کہ کسی طرح آپ سے اپنا حق لے لوں، مگر آپ نے ساری جائیداد بیچ کر اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ مجبوراً مجھے یہ سب کرنا پڑا۔ آپ مجھے نوکری پر رکھتے ہوئے چونکے تو میں

پریشان ہوگیا تھا۔ میرا سارا منصوبہ چوپٹ ہو جاتا، مگر آپ مجھے پہچان نہ پائے، آپ کو معلوم نہیں کہ میں کون ہوں؟ آپ بھول گئے۔ اس لیے کہ ظالم ظلم کر کے بھول جاتا ہے، مگر مظلوم نہیں بھولتا۔ میرا اصل نام ضیا یاسر ہے اور میں سیٹھ یاسر کا بیٹا ہوں۔ میں نے آپ کو ویسا ہی کر دیا جیسے آپ پہلے تھے۔"

یہ پڑھ کر سیٹھ فرحان اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکے اور دھڑام سے گر گئے۔ ان کا بیٹا ان کو فوراً اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ انھیں شدید صدمہ ہوا ہے، جس کی وجہ سے دماغ پر بہت اثر ہوا ہے اور ان کو فالج ہو گیا ہے۔ ان کا جسم حرکت کے قابل نہیں ہے۔

اسپتال آنے والے پڑوسیوں نے بتایا کہ چوکیدار چار پانچ افراد کے ساتھ سارا سامان گاڑیوں میں ڈال کر لے گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیٹھ فرحان نے دوسرے شہر میں بنگلہ لے لیا ہے۔ سیٹھ فرحان کو اسپتال میں بے حس لیٹے ہوئے وہ تمام مناظر یاد آ رہے تھے، جب وہ سیٹھ یاسر کی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ سیٹھ یاسر کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کا تین سال کا ایک ہی بیٹا ضیا تھا۔ سیٹھ یاسر نے اپنے انتقال سے پہلے ساری جائداد فرحان کے نام کر دی تھی اور اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ان کے بیٹے کی پرورش کرے گا، مگر اس نے جائداد منتقل ہوتے ہی ان کے بیٹے کو یتیم خانے میں داخل کروا دیا اور مال دار بننے کے لیے انھوں نے آٹے کے کاروبار میں ملاوٹ اور چوری کی، اس کی وجہ سے وہ فرحان سے سیٹھ فرحان بن گئے، مگر ایک چور نے ان کو دوبارہ فیکٹری میں کام کرنے والا ملازم بنا دیا۔ چوری کرتے وقت ان کو یہ احساس نہ تھا کہ دوسروں پر کیا گزرے گی، مگر آج ان کو اس بات کا اچھی طرح سے احساس ہو گیا تھا۔

دو برس کی بڑھیا

ہادیہ نیاز احمد، لانڈھی، کراچی

بہت دنوں کی بات ہے کسی جنگل میں ایک غریب لکڑ ہارا اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے۔ دونوں بوڑھے اور کم زور تھے۔ لکڑ ہارا دن بھر کلہاڑی سے لکڑیاں کاٹتا اور شام کو انھیں شہر میں بیچ آتا تھا۔ لکڑ ہارے کی بیوی گھر کا کام کاج کرتی تھی۔

ایک دن لکڑ ہارا جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ اسے زور کی پیاس لگی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی کنواں یا تالاب نظر آ جائے تو جا کر پانی پی لوں۔ اس نے کلہاڑی ہاتھ سے رکھ دی اور پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں اسے ایک تالاب نظر آیا۔ یہ تالاب اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ تالاب صاف اور ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا تھا۔ پانی کو دیکھ کر لکڑ ہارے کی جان میں جان آئی۔ اس نے تالاب کے کنارے بیٹھ کر دو تین گھونٹ پانی پی لیا۔

خدا کی قدرت، پانی پیتے ہی بوڑھے لکڑ ہارے کے بدن کی ساری جھریاں جاتی رہیں۔ سر کے سفید بال، سیاہ ہو گئے۔ پہلے منھ میں ایک دانت بھی نہ تھا اب سب دانت پیدا ہو گئے اور بوڑھا لکڑ ہارا چند لمحوں میں جوان اور طاقت ور بن گیا۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔ اس نے جھک کر تالاب کے صاف پانی میں اپنی شکل دیکھی تو وہ بالکل جوانوں کی طرح نظر آئی۔

اب لکڑ ہارے کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے لکڑیاں تو وہیں جنگل میں پھینکیں اور خوشی سے اُچھلتا کودتا گھر کی طرف چلا۔

لکڑ ہارے کی بیوی نے جو ایک جوان آدمی کو گھر میں آتے دیکھا تو پہلے ڈری، مگر جب لکڑ ہارے نے کہا کہ میں جادو کا پانی پی کر جوان ہو گیا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی

اور کہنے لگی: ''مجھے بھی جلد اس تالاب کا پتا بتاؤ، میں بھی وہاں جاتی ہوں اور جوان ہو کر واپس آتی ہوں۔''

لکڑ ہارے نے بہت کہا کہ ٹھیرو میں تمھیں اپنے ساتھ لے چلتا ہوں، مگر اس کی بیوی نے ایک نہ سنی اور کہا: ''نہیں، تم تھک گئے ہو گے۔ تم گھر میں بیٹھو اور مجھے اس کا پتا بتا دو، میں اکیلے جا کر پانی پی آؤں گی۔''

آخر لکڑ ہارے نے اسے تالاب کا پتا بتا دیا۔ وہ اسی وقت تالاب کی طرف چل دی اور تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گئی۔

تالاب اسی طرح پانی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ خوشی خوشی تالاب کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا میں جتنا زیادہ پانی پیوں گی، اتنی ہی زیادہ جوان بن جاؤں گی۔ یہ سوچتے ہی اس نے جلدی جلدی پانی پینا شروع کیا اور ذرا سی دیر میں اتنا پی لیا کہ حلق تک بھر گیا۔

ادھر لکڑ ہارے کو انتظار کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی، مگر اس کی بیوی گھر نہ پہنچی۔ آخر وہ بے چارہ اسے ڈھونڈنے نکلا۔ وہ تالاب کی طرف گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ تالاب کے پاس ہی ایک درخت کے نیچے زمین پر اسے اپنی بیوی کے کپڑے پڑے ہوئے نظر آئے۔ وہ دوڑ کر وہاں گیا، دیکھا تو ایک چھوٹی سی بچی جو کوئی دو برس کی معلوم ہوتی ہے، کپڑوں میں لپٹی ہوئی ہے۔

دراصل لکڑ ہارے کی بیوی نے لالچ میں آ کر جادو کا پانی اتنا پی لیا کہ وہ جوانی کی عمر سے گزر کر بچپن کے زمانے میں پہنچ گئی، اور جوان ہونے کے بجائے چھوٹی سی بچی بن گئی۔ اگر وہ پیٹ بھر کر پانی نہ پیتی اور دو تین گھونٹ پی کر چلی آتی تو جوان ہو جاتی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ننھی لڑکی نے لکڑ ہارے کی طرف دیکھا اور بلک بلک کر

رونے لگی۔ لکڑ ہارا اس کی صورت دیکھتے ہی ساری بات سمجھ گیا۔ اس نے بچی کو گود میں اُٹھالیا اور غمگین صورت بنائے گھر کی طرف چلا آیا۔

قاتل کون؟

محمد احتشام کاظم، شیخوپورہ

بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا۔ تمام لوگ دربار میں جمع تھے۔ بادشاہ کے تخت کے سامنے فرش پر سرخ رنگ کے قالین پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ دو نوجوان جو شاہی لباس پہنے ہوئے تھے، ایک کونے میں سر جھکا کے کھڑے تھے۔ وہ دونوں شہزادے تھے، جن پر وزیر کے قتل کا الزام لگایا گیا تھا۔ بادشاہ نہایت انصاف پسند تھا اور اس کے انصاف کا ڈنکا دور دور تک بجتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا فیصلہ کرے۔ ذیشان وزیراعظم کا بڑا بیٹا تھا، جس نے شہزادوں پر وزیر کے قتل کا الزام عائد کیا تھا۔

بادشاہ بولا: ''وزیر کے قتل پر مجھے افسوس ہے۔ حیرت ہے کہ ذیشان نے قتل کا الزام میرے بیٹوں شہروز اور اُسامہ پر لگایا ہے، مگر ان شاء اللہ میں یہ فیصلہ نہایت انصاف کے ساتھ کروں گا اور اگر میرے بیٹے قاتل ہوئے تو انھیں وہی سزا دوں گا، جو قاتل کی سزا ہوتی ہے۔''

بادشاہ نے اپنی بات ختم کی تو ذیشان نے کہا: ''بادشاہ سلامت! شہزادوں نے مجھ سے کہا تھا کہ شکار کھیلنے چلتے ہیں۔ میں مقتول وزیر کے پاس کسی کام سے جا رہا تھا، اس لیے انکار کر دیا۔ دونوں شہزادوں نے بھی شکار پر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد مقتول وزیر کوئی کاغذ لینے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں دوسرے کمرے میں تھا کہ چیخ سنائی دی، ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ یہ وہ خنجر ہیں، جن سے انھیں ہلاک کیا گیا ہے۔''

بادشاہ نے شہزادوں کی طرف دیکھ کر کہا: "تم دونوں اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"بادشاہ سلامت! ہم دونوں کے خنجر کل سے غائب تھے۔ میں نے اُسامہ کو بھی اپنے خنجر کے متعلق بتایا تو اس کا خنجر بھی غائب تھا۔ یہ ضرور کوئی سوچی سمجھی چال ہے۔ آپ ہمیں تین دن کا وقت دیں، حقیقت آپ پر خود بخود کھل جائے گی۔" اُسامہ نے رحم طلب لہجے میں بادشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں تمھیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں، اگر تین دن کے اندر اندر اپنی صفائی میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے تو تمھیں قتل کی سزا ضرور ملے گی۔" تمام لوگ دربار سے اُٹھ کر چلے گئے اور دربار خالی ہو گیا۔ بادشاہ تخت پر رنجیدہ بیٹھا ہوا تھا اور شہزادے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

تیسرے دن لوگ دربار میں ایک انوکھا فیصلہ سننے کے لیے جمع تھے۔ بادشاہ تخت پر جلوہ افروز تھا۔ دونوں شہزادوں کو دربار میں لایا گیا۔

"بولو! تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟" بادشاہ نے شہزادوں سے پوچھا۔

"بادشاہ سلامت! ذیشان کے کمرے میں کسی کو بھیجیں اور دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟" اُسامہ نے سرگوشی کے انداز میں بادشاہ سے کہا۔

"جاؤ اور جا کر ذیشان کا کمرا دیکھ کر آؤ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟" بادشاہ نے ملازموں کو بھیجا تو وہاں بادشاہ سلامت کا قیمتی مرغ جو بادشاہ نے دوسرے ملک سے منگوایا تھا، مرا پڑا تھا اور اس کے سینے میں خنجر گڑا ہوا تھا۔ دونوں ملازم مرغ کو اُٹھا کر بادشاہ کے پاس لے آئے اور کہا: "بادشاہ سلامت! آپ کے مرغ کو کسی نے مار دیا ہے۔"

ایک شہزادے نے ادب سے کہا: ''بادشاہ سلامت! اس کے سینے میں جو خنجر اترا ہوا ہے، کیا آپ اسے پہچان سکتے ہیں کہ یہ کس کا ہے؟''

بادشاہ نے انکار کیا تو بڑا شہزادہ بولا: ''یہ خنجر ذیشان کا ہے۔''

''کیوں ذیشان! یہ خنجر تمھارا ہے؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''جی ہاں، بادشاہ سلامت!'' ذیشان نے جواب دیا۔

''تم نے کیوں اس مرغ کو مارا، تم جانتے ہو، اس مرغ کی قیمت کیا ہے؟'' بادشاہ نے غصے سے پوچھا۔

ذیشان بولا: ''بادشاہ سلامت! میرا خنجر کل سے مجھے نہیں مل رہا تھا۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا، مگر نہیں ملا۔ یہ میرے ساتھ کھلی سازش ہے۔'' ذیشان نے اپنی صفائی بیان کرتے ہوئے کہا۔

شہزادہ شہزور نے کہا: ''بس بادشاہ سلامت! ایسا ہی ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ ہمارے خنجر چرا کر ذیشان نے خود وزیر کو قتل کر دیا اور الزام ہم پر لگا دیا، تاکہ ہمیں پھانسی یا عمر قید ہو جانے کے بعد ذیشان آپ کو راستے سے ہٹا کر تخت و تاج پر قبضہ کر لے، مگر میں ذیشان کے ملازم کرم الٰہی کا شکر گزار ہوں، جس نے مجھے یہ خط دکھایا، جس میں تحریر ہے کہ آپ کی کنیز پروین نے وزیر اعظم کے بیٹے ذیشان کے ساتھ مل کر یہ سازش تیار کی ہے۔''

بادشاہ نے کہا: ''خط پڑھ کر سنایا جائے۔''

بڑے شہزادے نے خط پڑھنا شروع کیا: ''ذیشان! ابھی تک تم نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ شہزادے راستے سے ہٹ جائیں۔ اب میں تمھیں ایک ترکیب بتاتی ہوں۔ شہزادوں کے خنجر چوری کر کے وزیر خزانہ کو قتل کر دو، تا کہ الزام

شہزادوں پر لگ جائے۔ وزیر خزانہ گھر میں اکیلے رہتے ہیں، اس لیے ان کو مارنا آسان ہوگا۔ جب دونوں شہزادوں کو پھانسی ہو جائے گی تو ہم شادی کرلیں گے اور بادشاہ کو قتل کرکے خود تخت و تاج کے مالک بن جائیں گے۔''

خط سن کر بادشاہ نے کہا: ''دونوں کو گرفتار کرلو۔ انھوں نے ہمارے ساتھ غداری کی اور ہمارے ایک قابل وزیر کو قتل کیا۔ انھیں سزائے موت دی جاتی ہے اور شہزادوں کو باعزت بری کیا جاتا ہے۔''

آم مزے دار

عبدالقادر، کراچی

بازار میں آیا ہوں ، مجھے آم ہیں درکار
ٹھیلوں پہ نظر آتے ہیں آم کے انبار
آموں کے مناظر ہیں، خوشبو ہے فضا میں
محسوس یہ ہوتا ہے ، لگا آم کا دربار
''انور ریٹول'' اور ''دسہری'' کے ہیں جلوے
کھاتے ہیں انھیں شوق سے آموں کے طلب گار
''سندھڑی'' یہاں موجود ہے، ''لنگڑا'' بھی ادھر ہے
لذت ہے جدا سب کی ، ہر آم مزے دار
دادا کو پسند ''چونسا'' ہے، پوتے کو ''سردلی''
ہر شخص ہے آموں کی محبت میں گرفتار
لذت کی یہ زنبیل ہے اور سب کو پسند ہے
کرتا ہی نہیں کوئی بشر آم سے انکار
یہ تحفۂ قدرت ہے اور سب کو میسر
ہر عمر کا انسان ، ہو زردار یا نادار
کھاتا ہے اسے شوق سے ہر طبقے کا انسان
حاکم ہو یا محکوم ہو، استاد یا لوہار
میں آم کا شیدا ہوں ، مجھے آم ہیں درکار
ارمان یہی ہے کہ ملیں آم لگاتار

بونا، غار اور ہیرے

اعراف نعیم الدین انصاری، کراچی

بہت عرصہ گزرا کسی شہر میں دو بچے راجا اور گڑیا رہا کرتے تھے۔ یہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ ایک سال کے بعد ان کے والد نے دوسری شادی کرلی، مگر افسوس کہ وہ بھی زیادہ

عرصے تک زندہ نہ رہ سکے۔ جب ان کے والد کا آخری وقت آیا تو بچوں نے محسوس کیا کہ وہ انھیں اپنے قریب بلا کر کچھ کہنا چاہ رہے ہیں، لیکن موت نے ان کو اتنی مہلت نہ دی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکے کہ ''کالے غار کے اندر ایک بونا......'' پھر وہ وفات پا گئے۔

والد کے مرتے ہی سوتیلی ماں نے دونوں بچوں پر ظلم کرنا شروع کر دیے۔ وہ معصوم بچوں سے کپڑے دھلواتی، برتن صاف کرواتی اور گھر کے سارے کام کرواتی۔ کام کرتے کرتے ننھی گڑیا کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے، لیکن سوتیلی ماں کو معصوم بچوں پر ذرا بھی ترس نہ آتا، بلکہ وہ ان کو بُرا بھلا کہتی اور مارتی پیٹتی رہتی۔

ایک دن اس نے بچوں کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کا حکم دیا۔ بچے جنگل میں جاتے ہوئے بہت ڈر رہے تھے، کیوں کہ جنگل بہت گھنا تھا اور طرح طرح کے جانوروں سے بھرا ہوا تھا، مگر بچوں کا وہاں جانا ضروری تھا، ورنہ ماں ان کو مار مار کر اَدھ مُوا کر دیتی۔

وہ دونوں جنگل میں آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک ان کو سامنے ایک غار نظر آیا۔ دونوں بچے غار کو دیکھ کر ڈر گئے، لیکن راجو نے گڑیا کی ہمت بندھائی: ''میری پیاری بہن! تم باہر کھڑی رہنا میں اندر جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر راجو گڑیا کا جواب سنے بغیر ہی غار میں چلا گیا۔ راجو غار میں آگے آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ تاریکی زیادہ ہو گئی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے راجو کا دم گھٹ رہا تھا کہ اچانک اس کا ہاتھ کسی نرم چیز پر پڑا۔ راجو زمین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

جب راجو ہوش میں آیا تو اس نے محسوس کیا وہ کسی نرم بستر پر پڑا ہوا ہے۔

سامنے ایک بونا اس کے پلنگ کے قریب کھڑا ہے۔ راجو کو پریشان دیکھ کر بونے نے کہا: ''ذرو مت، میں تم کو سب کچھ بتا دوں گا۔ آج سے بہت سال پہلے کی بات ہے کہ میں درخت سے گر کر زخمی ہو گیا تھا اور نیچے پڑا کراہ رہا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے اُٹھایا اور میری مرہم پٹی کی، جس کی وجہ سے میں بہت خوش ہوا اور کہا کہ اگر کبھی تم کو کوئی مشکل پیش آئے تو میرے پاس ضرور آنا۔ اس طرح کافی دن گزر گئے کہ اچانک ایک دن وہی آدمی میرے پاس آیا اور کہا کہ بادشاہ نے میرے ایک کام سے خوش ہو کر مجھے چار نہایت ہی قیمتی اور خوب صورت ہیرے دیے ہیں جو میں تمھارے پاس امانت کے طور پر رکھوانا چاہتا ہوں۔ جب میرے بچے بڑے ہو جائیں گے تو تم سے آ کر لے جائیں گے۔

فی الحال میں ان کو اس لیے نہیں دے سکتا ہوں کہ وہ ابھی بچے ہیں اور ان کی سوتیلی ماں ان سے یہ ہیرے چھین لے گی۔

اب راجو چپ نہ رہ سکا اور اس نے پوچھا: ''وہ آدمی کون تھا؟''

بونے نے بتایا: ''وہ تمھارا باپ تھا۔ اب ان ہیروں کو تم لے جا سکتے ہو اور اگر ان ہیروں پر کوئی بری نظر ڈالے گا تو اس کا انجام بھی خود دیکھ لے گا۔''

اتنے قیمتی ہیرے دیکھ کر راجو اور گڑیا کی سوتیلی ماں کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا۔ رات کو جب راجو اور گڑیا سو گئے تو اس نے ہیرے چرانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی اس نے ہیروں کو ہاتھ لگانا ہی چاہا تھا کہ ایک سانپ اچانک کہیں سے نکل آیا اور اس کو ڈس لیا۔ ماں کی چیخ سن کر دونوں اُٹھ گئے، لیکن ماں ان سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے بغیر ہی ختم ہو چکی تھی۔ ☆

دنیا کے نامور ادیب

حسن ذکی کاظمی کے قلم سے

ولیم شیکسپیئر انگریزی ادب کے عظیم ڈراما نگار شیکسپیئر کے حالاتِ زندگی، جس کے ڈرامے ساری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ان کے کارناموں سے واقف کرانے میں بہت مددگار ہے۔

شیکسپیئر کی تصویر کے ساتھ خوب صورت ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۲۵ روپے

سیموئل ٹیلر کولرج انگریزی کے اس عظیم شاعر نے محنت، شوق اور صلاحیتوں سے خود علم سیکھا اور شعر و ادب کی دنیا میں اپنا اہم مقام بنایا۔ اس کتاب میں اس کے حالاتِ زندگی دیے گئے ہیں۔

کولرج کی تصویر کے ساتھ خوب صورت ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۲۵ روپے

ولیم ورڈز ورتھ ورڈز ورتھ نے انگریزی شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ سانیٹ بھی لکھے اور مضامین بھی۔ اس کتاب میں اس کی زندگی کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔

ولیم ورڈز ورتھ کی تصویر کے ساتھ خوب صورت ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۲۵ روپے

برونٹے سسٹرز تین برونٹے بہنوں نے اپنی شاعری اور ناولوں کے ذریعے سے عورتوں کے حقوق اور آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ یہ ایک دل چسپ معلوماتی کہانی ہے، جو اس کتاب میں پڑھیے۔

برونٹے بہنوں کی خوب صورت تصویر کے ساتھ رنگین ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۲۵ روپے

چارلس ڈکنز عظیم ناول نگار جسے کتابیں پڑھنے کے شوق نے دنیا کے نامور ادیب کا اعلا مقام عطا کیا۔

ٹائٹل پر ڈکنز کی خوب صورت تصویر صفحات : ۲۴ قیمت : ۲۵ روپے

ٹامس ہارڈی انگریزی کا پہلا ناول نگار جس نے گاؤں کی حقیقی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

ہارڈی کی تصویر سے سجا ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۲۵ روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی ۷۴۶۰۰

آدھی ملاقات

یہ خطوط ہمدرد نونہال شمارہ اپریل ۲۰۱۴ء کے بارے میں ہیں

● میں پیشے کے لحاظ سے ایک استاد ہوں۔ مئی ۲۰۱۱ء کے مہینے میں ہمارے اسکول کے تمام اساتذہ کو ایک ہوم ٹاسک دیا گیا کہ ہر ایک استاد جب ۳۰ دن کے بعد واپس آئے گا تو ایک کتاب پڑھ کر آئے گا اور اس کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرے گا۔ میں ریاضی کے علاوہ کوئی کتاب نہیں پڑھتا تھا۔ مجھے کسی طرح سے ہمدرد نونہال پڑھنے کا موقع ملا اور یہ مجھے اتنا پسند آیا کہ جون ۲۰۱۴ء میں تین سال ہو جائیں گے۔ اس وقت سے آج تک باقاعدہ ایک اخبار والا میرے گھر پر ہمدرد نونہال دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں نونہال پڑھنے سے جو تسکین و تازگی ملتی ہے، اس کا اندازہ کوئی لگا نہیں سکتا ہے۔ میری نظر میں اس کے لکھنے والے نہایت ہی عمدہ اور بہت دل چسپ طریقے سے اپنی تحریر پیش کرتے ہیں۔ زاہد، لیاقت آباد، کراچی۔

● میں ہمدرد نونہال کا مطالعہ تیسری جماعت سے کر رہا ہوں اور آج میں سندھ یونی ورسٹی میں پڑھ رہا ہوں۔ لائبریری سائنس میں ماسٹر کا طالب علم ہوں، مگر آج بھی میں ہمدرد نونہال کا مطالعہ اسی شوق سے کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ ہمدرد نونہال اسی طرح روشنی پھیلاتا رہے۔ محمد عدیل رشید، حیدر آباد۔

● سرورق بہت ہی پسند آیا، جس میں ننھے منے بچے کو سبز رنگ کے پس منظر کے ساتھ بڑی خوب صورتی سے سیٹ کیا گیا تھا۔ مستقل سلسلوں کے بعد بلا عنوان سلسلے کی کہانی تو بہت ہی اچھی تھی، بدشگونیاں بھی ایک منفرد کہانی تھی۔ علم دریچے سے قانون پسند ماں کا چور بیٹا بہت ہی خوب تھی۔ نظموں میں بھائی چارہ (ضیاء الحسن ضیا)، اپنا شاعر ہے اقبال (فنی دہلوی) پیاری تھیں۔ محمد اجمل شاہین انصاری، لاہور۔

● ہمیشہ کی طرح اس بار کا شمارہ بھی رنگا رنگ و دل چسپ تحریروں سے سجا ہوا تھا۔ آ بیل مجھے مار، ننھی مسکراہٹ لاجواب تھیں۔ زینب ناصر، بجگہ نا معلوم۔

● اپریل کا شمارہ بہت ہی اچھا لگا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ کہانیاں ننھی مسکراہٹ اور بدشگونیاں اچھی لگیں۔ بلی کمر کے بل آگے سے تو ہمیں ہنسا ہنسا کر پیٹ میں درد کر دیا۔ انکل! کیا ہم نونہال اسمبلی میں شرکت کر سکتے ہیں؟ عزیر احمد، حذیفہ احمد، حفصہ نوید، کراچی۔

فون ۳۶۶۱۲۳۸۲ پر رابطہ کر کے طریقہ معلوم کر لیں اور نونہال اسمبلی میں شرکت کر لیں۔

● اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ علم بادشاہ ہے، آ بیل مجھے مار، ننھی مسکراہٹ، میرے ابا جان، احمق کی بیوی اور بلا عنوان کہانی بہت زبردست تھیں۔ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ جاذب گل اشرف، لانڈھی، کراچی۔

● مجھے ہمدرد نونہال بہت پسند ہے، مگر مجھے اس میں کسی چیز کی کمی لگتی ہے اور وہ ہے ڈراؤنی کہانیاں۔ میں آپ سے گزارش کرتی ہوں کہ مہربانی کر کے ہمدرد نونہال میں ڈراؤنی کہانیوں کا اضافہ کر دیا جائے۔ سعود نور، بجگہ نا معلوم۔

● اپریل کا شمارہ بہت اچھا اور عالی شان تھا۔ سرورق کی تصویر کچھ اچھی نہیں تھی۔ باقی ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ کہانیوں میں علم بادشاہ ہے، آ بیل مجھے مار، احمق کی بیوی، جا کر بھگاؤ، پہلی بات، میں نہ بھولوں گا، جھوٹ کا تہوار اور دیگر کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ نظمیں بھی کافی اچھی تھیں۔ ہر بار کی طرح معلومات افزا سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہ سب کچھ پڑھ کر مزہ دوبالا

ہو گیا۔ منیب احمد رشد عاد، سا قمر۔

● اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ علم بادشاہ ہے (مسعود احمد برکاتی)، آ گئی سائیکل (عبدالرؤف تاجور)، ننھی مسکراہٹ (محمد اقبال شمس) اور بلا عنوان کہانی تو زبردست تھی۔ طلحہ محمد اسلم، میرپور خاص۔

● اپریل کا شمارہ ہمیشہ کی طرح بہت دل چسپ تھا۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ہر تحریر قابلِ تعریف تھی۔ انکل! بچوں کا عالمی دن کب منایا جاتا ہے؟ آو جیہہ، عائشہ آمنہ قیصر، کراچی۔

بچوں کا عالمی دن ۲۰ نومبر کو منایا جاتا ہے اور یہ ۱۹۵۹ء سے منایا جا رہا ہے۔

● اپریل کی تمام کہانیاں اور تحریریں اچھی تھیں۔ ثاقب جنید، احمد جنید، جویریہ کرن، منشی خان، چکوال۔

● اپریل کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ اس مرتبہ کی پہلی بات واقعی ایک خاص بات تھی۔ لطیفے تو بہت ہی چٹ پٹے تھے۔ واحد بھائی کی کہانی ایک بار پھر بازی لے گئی۔ کہانی احمق کی بیوی بھی اچھی تھی۔ اسماء جبین، کراچی۔

● اپریل کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ احمق کی بیوی، آ گئی سائیکل، ننھی مسکراہٹ اور میرے ابا جان بہت چٹ پٹی اور مزے دار کہانیاں تھیں۔ نوشاد عادل کی کہانی "بدشگونیاں" پھر نمبر لے گئی۔ لبنیٰ جبین، کراچی۔

● جاگو جگاؤ پڑھ کر جانے کیوں لگتا ہے کہ حکیم سعید زندہ ہیں اور واقعی وہ زندہ ہیں۔ پہلی بات پڑھی، اس مہینے کا خیال اچھا تھا۔ بلا عنوان نمبر ون تھی۔ دوسرے نمبر پر ننھی مسکراہٹ تھی، تیسرے نمبر پر احمق کی بیوی، چوتھے نمبر پر آ گئی سائیکل۔ مزاح میں تو نوشاد عادل کمال رکھتے ہیں۔ ان پر ہم کیا لکھیں۔ مضامین میں علم بادشاہ ہے ٹاپ پر تھی۔ اپریل فول پر نسرین شاہین اور ادیب حسن کی کوشش اچھی، بہت اعلا تھی۔ نظمیں اور لطیفے سب اچھے تھے۔ محمد توقیر اعزاز، کراچی۔

● ہمدرد نونہال طالب علموں کا رہنما، بچوں کا ساتھی، غم زدوں کا غم خوار، ہماری خوشیوں کا ساتھی، بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہے اور ہمارا استاد بھی ہے۔ ہم نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہم شہید حکیم محمد سعید کا بہت شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے ہمیں نونہال جیسا دوست دیا۔ حافظ محمد سعد تونسوی، کراچی۔

● کہانیاں نہایت عمدہ تھیں۔ واحد بھائی کی کہانی پڑھ کر پھر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ آ گئی سائیکل ہم کو سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر کہانی میں کیا تھا۔ جاگو جگاؤ سے جاگتے ہوئے پہلی بات سن کر خیالات روشن کیے۔ نظمیں ساری اچھی تھیں۔ مدیحہ رمضان بھٹ، اوتھل لسبیلہ۔

● آپ کی تحریر علم بادشاہ ہے نے سچ مچ علم کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ آ گئی سائیکل پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مسکراتی لکیریں بھی ہنسی سے بھرپور تھی۔ کہانی "بدشگونیاں" پڑھ کر تو میں زور زور سے ہنسنے لگی۔ صبا عبدالغنی، کراچی۔

● اپریل کے شمارے کی زبردست کہانی بدشگونیاں (نوشاد عادل) یعنی واحد بھائی والی تھی۔ دوسری کہانیاں کچھ خاص نہیں تھیں۔ اپریل فول کے متعلق کہانیاں سبق آموز تھیں۔ خاص کر "میں نہ بھولوں گا" کہانی پڑھ کر ہم نے وعدہ کیا کہ کبھی اپریل فول نہیں منائیں گے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کریں گے۔ کرن فضا حسین، فوجی کالونی۔

● اس ماہ کا شمارہ شان دار تھا۔ احمق کی بیوی کہانی بہت پسند آئی۔ فاخرہ ساجد منوڑہ، کراچی۔

● اس بار شمارہ بہت شان دار تھا۔ سرورق بہت دل کش تھا۔ تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ آ گئی سائیکل (عبدالرؤف تاجور)، ننھی مسکراہٹ (محمد اقبال شمس)، احمق کی بیوی (ابرار محسن) اور بلا عنوان کہانی بہت دل چسپ تھیں۔ بدشگونیاں (نوشاد عادل)

پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ فہد حسین، کراچی۔

● ہمدرد نونہال بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اپریل کے شمارے میں سب کہانیاں بہت زبردست تھیں، لیکن لطیفے کچھ خاص نہیں تھے۔ کنول کیریو، کراچی۔

● اپریل کا شمارہ طلوع ہوا، دل باغ باغ ہو گیا۔ جاگو جگاؤ سے دماغ کو جگایا۔ اس مہینے کا خیال بہت خوب تھا، پھر روشن خیالات سے مستفید ہوئے۔ نظمیں اور کہانیاں سب اچھی تھیں۔ احمق کی بیوی، ننھی مسکراہٹ، آہنی سائیکل، علم بادشاہ ہے اور بدشگونیاں زیادہ اچھی تھیں۔ مسکراتی لکیروں نے ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی۔ باقی سب سلسلے اچھے تھے۔ شاہ رول، چوہدار سے والا۔

● اپریل کا شمارہ بہت عمدہ تھا۔ حکیم محمد سعید کی باتیں بہت پسند آئیں۔ اس مہینے کا خیال تو واقعی بہت زبردست تھا۔ مجھے ہمدرد نونہال بہت پسند ہے، کیوں کہ اس نے میری اردو کو بہتر بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ کہانیوں میں سب سے مزے دار کہانی "بدشگونیاں" تھی۔ اس کے علاوہ تمام تحریریں بہت دل چسپ تھیں۔ نظموں میں نظم "بھائی چارہ" بہت پسند آئی۔ صوبیہ عمران، کراچی۔

● ساری کہانیاں، نظمیں، سب کچھ اچھا تھا اور بدشگونیاں (نوشاد عادل) کی تو کیا ہی بات ہے۔ فرحین علی خان، صوابی۔

● ہمدرد نونہال کا تازہ شمارہ روح کو تازہ کر گیا۔ جاگو جگاؤ، پہلی بات اور حمد کی کیا بات ہے۔ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک ہے، لیکن آہنی سائیکل، ننھی مسکراہٹ، بدشگونیاں، میں نہ بھولوں گا اور بلاعنوان کہانی خاص طور پر پسند آئیں۔ نظمیں اور لطائف بھی اچھے تھے۔ محمد حسیب نواز قادری، کاموکی۔

● کہانیوں میں علم بادشاہ ہے، آہنی سائیکل، جھوٹ کا تہوار، میرے ابا جان، احمق کی بیوی، اور بلاعنوان کہانی بہت ہی مزے دار تھیں۔ ہنسی کہر پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ نظمیں بھی بہت خوب صورت تھیں۔ محمد حامد رضا قادری، کاموکی۔

● ہمیشہ کی طرح اس بار بھی نونہال کا شمارہ بہترین تھا۔ علم بادشاہ ہے اور میرے ابا جان سبق آموز مضامین تھے۔ بلاعنوان کہانی پہلے نمبر پر رہی۔ نوشاد عادل کی بدشگونیاں میں دل چسپی کا سامان وافر مقدار میں تھا۔ اس کے علاوہ حمد باری تعالیٰ (مشتاق حسین قادری)، جاگو جگاؤ، پہلی بات، آہنی سائیکل اور میں نہ بھولوں گا بے حد پسند آئیں۔ خدیجہ نشان، کاموکی۔

● اپریل کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ علم بادشاہ ہے، ننھی مسکراہٹ، بلاعنوان کہانی تو سب سے اچھی تھی۔ انکل! نونہال مصور کے لیے اپنی ڈرائنگ کیسے بھیجیں؟ عروج اسلام اختر، فاطمہ اسلام اختر، کراچی۔

جس طرح یہ خط بھیجا ہے، اسی طریقے سے بھیج دیں۔

● مشتاق حسین قادری کی خوب صورت حمد نے دل موہ لیا۔ علم بادشاہ ہے (مسعود احمد برکاتی)، آہنی سائیکل (عبدالرؤف سمیجو)، احمق کی بیوی (ابرار محسن) بہترین تحریریں تھیں۔ بلاعنوان کہانی (جاوید بسام) سب پر بازی لے گئی۔ نوشاد عادل کی "بدشگونیاں" اتنی دل چسپ اور مزاحیہ تھی کہ میں نے گھر والوں کو جب پڑھ کر سنائی تو سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ حسن رضا سردار، کاموکی۔

● علم بادشاہ ہے، ننھی مسکراہٹ، احمق کی بیوی، بلاعنوان کہانی، بدشگونیاں اور میں نہ بھولوں گا شمارے کی جان ہیں۔ صدام حسین قادری، کاموکی۔

● علم بادشاہ ہے، بدشگونیاں، میں نہ بھولوں گا اور بلاعنوان کہانی بہترین تحریریں ہیں۔ نور فاطمہ قادری، کاموکی۔

● ہمدرد نونہال کا ہر شمارہ پچھلے شمارے سے بہتر ہوتا ہے۔ آپ کی پوری ٹیم پوری تندہی کے ساتھ نونہالوں کی تربیت کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اس مہینے بہترین کہانی کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ بدشگونیاں، آہنی سائیکل، علم بادشاہ ہے اور میں نہ

بھولوں کا یادگار تحریریں ہیں۔ محمد معین الدین قادری، کاموکی۔

● اپریل کا شمارہ عام شماروں کی طرح زبردست تھا۔ جسے پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ خاص طور پر آسیبی سائیکل (عبدالرؤف تابور) بہت اچھی لگی۔ سہیل احمد یوسف زئی، مردان۔

● مجھے نونہال ادیب پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ اس دفعہ بلاعنوان کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ معلومات افزا کے جوابات ڈھونڈنے میں بھی بہت مزہ آتا ہے۔ کیا میں نونہال مصور میں ڈیک ساتھ دو تصویریں بھیج سکتی ہوں؟" عنبرکامران، اورنگی ٹاؤن۔

ضرور، لیکن ہوں دونوں علاحدہ علاحدہ۔

● اپریل کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ کہانیاں سب اچھی لگیں، جن میں احمق کی بیوی، بلاعنوان، ننھی مسکراہٹ شامل تھیں۔ ہنسی گھر بور لگا۔ زونش منیر، دعا، عبیر، پورخاص۔

● میں ہمدرد نونہال بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس بار سب کہانیاں پسند آئیں اور ہنسی گھر بھی ٹھیک تھا۔ عشا، انعم، اقصیٰ، میرپورخاص۔

● اپریل کا تازہ شمارہ بہت زبردست تھا۔ جاگو جگاؤ میں ایک اچھا سبق تھا۔ آفتاب ہدایت بھی ایک اچھا مضمون تھا۔ علم بادشاہ ہے زبردست تحریر تھی۔ کہانیوں میں آسیبی سائیکل، ننھی مسکراہٹ، بدشگونیاں، احمق کی بیوی، میں نہ بھولوں گا اور بلاعنوان کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ میرے ابا جان بھی ایک زبردست مضمون تھا۔ نظموں میں اپنا شاعر ہے اقبال، بھائی چارہ اور بہار کا موسم اچھے تھے۔ غرض پورا رسالہ زبردست تھا۔ حافظ عبدالعزیز بن عمر خطاب، کراچی۔

● اپریل کا شمارہ ماشاء اللہ سے بہت اچھا تھا۔ ننھی مسکراہٹ (محمد اقبال شمس)، میں نہ بھولوں گا (ادیب سمیع چمن)، احمق کی بیوی (ابرار محسن)، میرے ابا جان (ڈاکٹر جاوید اقبال) اور آسیبی سائیکل (عبدالرؤف تابور) بہت پسند آئی۔ سب سے ٹاپ پر بدشگونیاں (نوشاد عادل) رہی۔ اس کے علاوہ لطیفے اور علم در یچے بہت شان دار تھے۔ صبا اعجاز، لانڈھی، کراچی۔

● اپریل کا شمارہ بھی تمام شماروں کی طرح بے حد خوب صورت اور معلوماتی تھا۔ علم بادشاہ ہے، میرے ابا جان، معلوماتی تحریریں تھیں۔ احمق کی بیوی اور بدشگونیاں تو پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اس مہینے کا خیال بھی اچھا تھا۔ نادیہ اقبال، کراچی۔

● اپریل کا نونہال بہت زبردست تھا۔ سرورق بھی اچھا تھا۔ کہانیوں میں بلاعنوان کہانی (جاوید بسام)، احمق کی بیوی (ابرار محسن)، آسیبی سائیکل (عبدالرؤف تابور) اور علم بادشاہ ہے (مسعود احمد برکاتی) اچھی تھیں۔ نظموں میں بہار کا موسم اور نونہال بہت اچھی تھیں۔ منیبہ حبیب الرحمٰن، کراچی۔

● ہمیشہ کی طرح اس ماہ کا رسالہ بھی خوب تھا۔ پڑھنے میں بہت مزہ آیا۔ جاگو جگاؤ سے لے کر نونہال لغت تک بہت دل چسپ اور بہترین تھا۔ فہد شاہ، منتصب شاہ، مانسہرہ۔

● بدشگونیاں بہت اچھی اور مزاحیہ تحریر تھی۔ ننھی مسکراہٹ بھی اچھی کہانی تھی۔ مضمون میرے ابا جان نے تو دل جیت لیا۔ ایسی کہانیاں ضرور شائع ہونی چاہئیں جن میں سبق اور مزاح دونوں ہوں۔ باقی تمام کہانیاں لاجواب تھیں، البتہ آسیبی سائیکل کچھ خاص نہیں تھی۔ عروج فریدہ سلطان، تسیم اختر، ذیروغازی خان۔

● اپریل کا شمارہ بہت بہترین تھا۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ خاص طور پر علم بادشاہ ہے، آسیبی سائیکل، ننھی مسکراہٹ، احمق کی بیوی اور بلاعنوان کہانی۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات بہت اچھے سلسلے ہیں۔ روشن خیالات کے تو کیا کہنے۔ مسکراتی لکیریں بھی اداس چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیے جا رہی ہیں۔ واحد بھائی کے بارے میں بدشگونیاں نے خوب گدگدایا۔ محمد قمر الزماں، خوشاب۔

● تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ خاص طور پر احمق کی بیوی پسند

آئی۔ علم در یچے اور نونہال ادیب بھی اچھے لگے۔ روشن خیالات نے تو ہمیں روشن کر دیا۔ حبیب الرحمن، حیدرآباد۔

● ہمدرد نونہال بہترین رسالہ ہے۔ اپریل کا شمارہ بھی بہترین تھا۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ علم بادشاہ ہے (مسعود احمد برکاتی) بہت اچھی تحریر تھی۔ ننھی گھر کے لطیفے تو شاندار تھے۔ باقی تو پورا شمارہ ہی اچھا تھا۔ کس کس کی تعریف کروں۔ سیف الرحمن، حیدرآباد۔

● اپریل کے شمارے کی ہر چیز بہترین تھی۔ جاگو جگاؤ نے تو ہمیں جگا ہی دیا۔ پہلی بات کیا زبردست لکھتے ہیں آپ۔ روشن خیالات بھی اچھے لگے۔ علم دریچے بھی بہترین سلسلہ ہے۔ کہانیاں تو تمام ہی اچھی تھیں، لیکن احمق کی بیوی بہت ہی اچھی لگی۔ برکاتی صاحب کی تحریر علم بادشاہ ہے بہت ہی اچھی تھی۔ رمیدہ محجبین خلیل الرحمن، حیدرآباد۔

● جاگو جگاؤ میں حکیم صاحب کی ہمیشہ یاد رہنے والی سادہ اور آسان الفاظ میں پیاری باتیں دل کو لگتی ہیں۔ اس مہینے کا خیال اور پہلی بات سب سے پہلے پڑھتے ہیں۔ روشن خیالات، حمد باری تعالیٰ اور محمد عبداللہ کی تحریر آفتاب ہدایت بہت ہی بہترین رہیں۔ آپ کی تحریر علم بادشاہ ہے پُر اثر اور سادہ الفاظ میں تھی۔ آپ کی تحریر تو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے۔ بہادر علی حیدر بلوچ، ٹنڈو باگو۔

● تمام تحریریں زبردست تھیں۔ کہانیوں میں آدھی سائیکل، ننھی مسکراہٹ، بدشگونیاں اور معمولی معمولی سپرہٹ تھیں۔ لطائف بھی اچھے تھے۔ میرے ابا جان بہت اچھی تحریر تھی۔ سلمان صفدر، فیصل آباد۔

● جاگو جگاؤ اور پہلی بات نے بہت اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی، جب کہ روشن خیالات ہمیشہ کی طرح روشن تھے۔ آدھی سائیکل اور مسکراتی لکیریں اچھی کاوشیں تھیں۔ بدشگونیاں نے رسالے میں مزاح اور روح پھونک دی۔ ننھی مسکراہٹ، میرے ابا جان، احمق کی بیوی، میں معمولوں کا انتخاب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ بامحاورہ کہانی اور ننھی گھر نے تو خوش کر دیا۔ سیدہ عائشہ خلیق الرحمن، کراچی۔

● اپریل کے شمارے میں تو شاد عادل کی کہانی "بدشگونیاں" سب پر حاوی رہی اور اسے اول نمبر قرار دے سکتے ہیں۔ جاوید بسام کی "بامحاورہ" بھی تجسس سے بھرپور انوکھی کہانی تھی۔ ادیب "تیج جھن کی" میں معمولوں کا "بھی کچھ کم نہ رہی۔ عبدالرؤف تاجور کی "آدھی سائیکل" محمد اقبال شمس کی "ننھی مسکراہٹ" بھی قابلِ تعریف کاوشیں رہیں۔ آپ کی "پہلی بات" مشتاق قادری کی "حمد باری تعالیٰ" ضیاء الحسن ضیا کی نظم "بھائی چارہ" اور آپ کا مضمون "علم بادشاہ ہے" کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔ اگلی مرتبہ سرورق کے لیے موبائل فون سے لی گئی فوٹو ارسال کر سکتے ہیں؟ ہیر حیدر علی شاہ، حیدرآباد۔

سرورق فوٹو گراف سے ہی اچھا چھپتا ہے۔ موبائل فون کی تصویر زیادہ اچھی نہیں ہوتی۔

● اپریل کا شمارہ بہت ہی اچھا لگا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں زبردست تھیں، لیکن سرورق کچھ اچھا نہیں لگا۔ طارق محمود کھوسو، کشمور۔

● سرورق سے لغت تک سب زبردست تھا۔ کہانیاں سب اچھی تھیں۔ آدھی سائیکل (عبدالرؤف تاجور)، ننھی مسکراہٹ (محمد اقبال شمس)، میرے ابا جان (جاوید اقبال)، احمق کی بیوی (بہار حسن)، بامحاورہ کہانی (جاوید بسام) اور لطیفوں نے تو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ اس مہینے کا خیال بہت اچھا تھا۔ شہزادی حور عین، جگہ نامعلوم۔

● بدشگونیاں زبردست کہانی تھی۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ آدھی سائیکل، احمق کی بیوی بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ آفتاب ہدایت، علم بادشاہ ہے اور علم دریچے بھی پسند آیا۔ مجھے بدشگونیاں اتنی پسند آئی کہ میں نے اپنی آپا کو بھی سنائی اور ہم دل کھول کر خوب ہنسے اور اسی وجہ سے میں خط لکھنے پر مجبور ہوگئی۔ ادیبہ علی، اٹک۔

● اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ کہانیوں میں پہلے نمبر پر ننھی مسکراہٹ، دوسرے نمبر پر بلا عنوان کہانی، جب کہ تیسرے نمبر پر احمق کی بیوی اور میں نے بھولوں کا زبردست تھیں۔ نونہال ادیب میں لائق شاگرد اور نپولین بونا پارٹ کہانیاں اچھی تھیں۔ نظموں میں "نونہال" نظم اچھی لگی۔ انکل! پیاری سی پہاڑی لڑکی اور موتی کرشنو کا خواب کی کیا قیمت ہے؟ میں یہ کتابیں منگوانا چاہتی ہوں۔ عرشیہ فرید، کراچی۔

پیاری سی پہاڑی لڑکی ۹۵ روپے کی اور موتی کرشنو کا خواب ۲۰ روپے کی ہے اور دس روپے ڈاک خرچ یعنی کل ۱۱۵ روپے کا منی آرڈر بھیج کر منگوا سکتی ہیں۔

● ہر ماہ کی طرح اس ماہ کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ مجھے بچوں کے رسالوں میں ہمدرد نونہال بہت پسند ہے۔ نام نامعلوم۔

● ہر ماہ کی طرح اس ماہ بھی جاگو جگاؤ اور پہلی بات نے دل پر اثر کیا۔ روشن خیالات اور حمد باری تعالیٰ سے مستفید ہوتے ہوئے آفتاب ہدایت اور ظلم بادشاہ سے پہنچے، دونوں مضامین دل پر اثر کرنے والے تھے۔ اپنا شاعر ہے اقبال خوب صورت نظم ہے اور بھائی چارہ بھی اچھی لگی۔ میرے ابا جان معلوماتی مضمون تھا۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ آ بیل سائیکل اچھی نہیں لگی۔ ننھی مسکراہٹ، بدشگونیاں، جھوٹ کا تہوار، میں نے بھولوں کا اچھی کہانیاں تھیں۔ آمنہ صفیہ، عائشہ حسن، نارتھ ناظم آباد۔

● کہانیوں میں ننھی مسکراہٹ (محمد اقبال شمس)، بلا عنوان کہانی (جاوید بسام) اور آ بیل سائیکل اچھی تھیں۔ نظمیں تو تمام ہی پسند آئیں اور تمام سلسلے ہی زبردست ہیں۔ ثریا کوثر عبدالستار انصاری، لاہور۔

● اپریل کا شمارہ بہت دل چسپ تھا۔ ہنسی گھر کے لطیفے بہت مزے دار تھے اور نظم میں حمد باری تعالیٰ اور کہانی میں بدشگونیاں بہت اچھی تھی۔ ایمان اسلم علی، کراچی۔

● اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات سبق آموز تھی۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ فاطمہ اطہر، اسلام آباد۔

● اپریل کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ خاص طور پر آ بیل سائیکل، میرے ابا جان اور احمق کی بیوی بہت زبردست تھیں۔ حنظلہ فاروق، جگہ نامعلوم۔

● اپریل کا شمارہ بہت ہی دل چسپ اور مزے دار تھا۔ احمق کی بیوی (ابرار محسن) پڑھ کر بہت ہی مزہ آیا۔ غرض ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ محمد راز عالم خان، کراچی۔

● اپریل کا شمارہ بہت مزے دار تھا۔ ساری ہی کہانیاں مثلاً احمق کی بیوی، ننھی مسکراہٹ، آ بیل سائیکل وغیرہ بہت پسند آئیں۔ یہ رسالہ بہت ہی معیاری ہے۔ مریم صابر، کراچی۔

● تمام سلسلے چمک دمک لیے موجود تھے۔ کہانیاں تو سب ہی پسند آئیں۔ بدشگونیاں، احمق کی بیوی اور میں نے بھولوں کا اچھی تھیں۔ نظم نونہال اور بہار کا موسم زبردست تھیں۔ محمد افضل انصاری، چوہنگ سٹی۔

● اپریل کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ بدشگونیاں (نوشاد عادل)، آ بیل سائیکل (عبدالرؤف سمرو)، بہت مزے دار کہانیاں تھیں۔ انھیں پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ ننھی مسکراہٹ، جھوٹ کا تہوار، میں نے بھولوں بھی بہت سبق آموز تحریریں تھیں۔ بلا عنوان کہانی طویل، لیکن بہت خوب صورت تھی۔ مریم زیدی، کراچی۔

● بلا عنوان کہانی (جاوید بسام)، ننھی مسکراہٹ (محمد اقبال شمس)، یہ دونوں کہانیاں بہت اچھی لگیں اور انکل! آپ تو لکھتے ہی خوب ہیں۔ میرے ابا جان (جاوید اقبال) پڑھ کر اچھا لگا۔ آفتاب ہدایت (محمد عبداللہ) بھی اچھی تحریر تھی۔ علم دریچے کے تمام اقتباسات بہترین لگے۔ نظمیں بھی سب عمدہ تھیں۔ غرض پورا رسالہ ہی آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ماہ نور جان، نیو کراچی۔

☆☆☆

جوابات معلومات افزا — ۲۲۰

سوالات اپریل ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئے تھے

اپریل ۲۰۱۴ء میں معلومات افزا-۲۲۰ کے جو سوالات دیے گئے تھے، ان کے جوابات ذیل میں لکھے جا رہے ہیں۔ ۱۶ صحیح جوابات بھیجنے والے نونہالوں کی تعداد صرف چند رہ تھی، اس لیے قرعہ اندازی نہیں کی گئی۔ ان چند رہ نونہالوں کو انعامی کتاب بھیجی جائے گی۔ باقی نونہالوں کے نام شائع کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ۳۳ سال کی عمر میں آسمان پر اٹھا لیا گیا۔
۲۔ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان صلح حدیبیہ سنہ ۶ ہجری میں طے پائی تھی۔
۳۔ سب سے پہلے پولیس کا محکمہ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ حکومت میں قائم کیا گیا تھا۔
۴۔ عظیم مسلمان سائنس داں بوعلی سینا نے ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔
۵۔ عربی زبان کے حروفِ تہجی کی تعداد ۲۸ ہے۔
۶۔ پاکستان میں سب سے طویل دورِ صدارت محمد ایوب خاں کا تھا۔
۷۔ پاکستان میں تیار کردہ پہلی جیپ کا نام نشان رکھا گیا تھا۔
۸۔ ''رستمِ پاکستان'' کا خطاب بھولو پہلوان کو دیا گیا تھا۔
۹۔ ''کاسا بلانکا'' مراکش کا ایک شہر ہے۔
۱۰۔ ترکی کے قدیم شہر ''سمرنا'' کا نام تبدیل کر کے ازمیر رکھا گیا ہے۔
۱۱۔ شہری دفاع کا عالمی دن یکم مارچ کو منایا جاتا ہے۔
۱۲۔ مغل بادشاہ شاہجہاں کے سب سے بڑے بیٹے کا نام دارا شکوہ تھا۔
۱۳۔ ''حزب'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں، گروہ، جماعت، جتھا۔
۱۴۔ ''WALLNUT'' انگریزی زبان میں اخروٹ کو کہتے ہیں۔
۱۵۔ اردو زبان کا ایک محاورہ ہے: اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھنا۔
۱۶۔ مرزا داغ دہلوی کے اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح درست ہے:

خبر سن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے — خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

قرعہ اندازی میں انعام پانے والے خوش قسمت نونہال

☆ کراچی: ناعمہ تحریم، اریبہ امجد، حافظ عبدالعزیز، سمعیہ شفیق تحریم خان

☆ سانگھڑ: محمد ثاقب منصوری، منیب احمد رندھاوا ☆ پشاور: ہانیہ شہزاد، عبدالمعز اسلم خان

☆ تلہ گنگ: عاطف ممتاز ☆ حیدرآباد: ماہ رخ ☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعدیہ کوثر مغل، عاتکہ طاہر

☆ ڈیرہ اللہ یار: شیراز سکندر رلنگی ☆ کرک: روحین زمان۔

(اس بار سولہ درست جواب دینے والے نونہال صرف پندرہ تھے۔)

۱۵ درست جوابات بھیجنے والے سمجھ دار نونہال

☆ کراچی: سمعیہ محمد شاکر، عائشہ قیصر، ماثورہ بلال، مریم عبدالرب، سارہ مظفر، سید اعظم مسعود ☆ گوجرانوالہ: خدیجہ نشان، حسن رضا سروار، صدام حسین قادری، نور فاطمہ قادری، محمد حامد رضا قادری، محمد محسن الدین قادری، محمد حسیب نواز قادری ☆ حیدرآباد: حسنین خان، سید محمد عمار حیدر ☆ راولپنڈی: فارعہ عافیہ، محمد ارسلان ساجد ☆ لاہور: امتیاز علی ناز، وہاج عرفان، صفی الرحمٰن، مطیع الرحمٰن ☆ میرپورخاص: بلال احمد ☆ ڈیرہ اللہ یار: عمران خان کنبار ☆ ملتان: ثمینہ کاشف شجاع ☆ اسلام آباد: فرمین ☆ میانوالی: مجیرہ حسنہ ☆ پشاور: شبیر احمد ☆ خوشاب: محمد قمر الزماں ☆ بہاول پور: مبشرہ حسین ☆ صوابی: فرحین علی خان۔

۱۴ درست جوابات بھیجنے والے علم دوست نونہال

☆ کراچی: سید عفان علی جاوید، سیدہ جویریہ جاوید، سید بازل علی اظہر، سید شہظل علی اظہر، عائشہ عمران احسن، کرن مرسلین، علیزہ سہیل، شمسہ کنول عثمانی، حسن رضا قادری، ملیکہ زیدی، رضی اللہ خان، سیدہ مریم محبوب، سیدہ سالکہ محبوب، سید سبطین احمد، عشنا فلک، منیحہ لطیف، نور الصباح محمد ادریس، سید حسن جمیل، سیدہ عائشہ خلیق الرحمٰن، بنت محمد طارق عبدالباری، لقمان، سید حسن جمیل ☆ حیدرآباد: عائشہ ایمن عبداللہ، اریبہ انجم ☆ ٹنڈو الہیار: مدثر اختر، شازمہ اختر ☆ اوتھل، لسبیلہ: مدیحہ رمضان بھٹہ ☆ سیالکوٹ: صبیح الحسن ☆ میرپورخاص: خالد محمد اکرم

☆ واہ کینٹ: محمد شعیب انور ☆ بھکر: محمد مجیر خان ☆ اسلام آباد: حسین ☆ کوٹ ادو: فاکہہ شیراز خان ☆ راولپنڈی: شایان علی، سہیل ناصر ☆ سبی نظیر آباد: فخرہ سعید خانزادہ ☆ سرگودھا: زرین خان ☆ اوتھل: مدیحہ رمضان بھٹ ☆ آزاد کشمیر: محمد جواد چغتائی ☆ پشاور: محمد حیات خان۔

۱۳ درست جوابات بھیجنے والے تخلیق نونہال

☆ کراچی: سید محمد شعیب، ماہم شہباز احمد، لاعبہ راحیل، سید زین العابدین، مدیحہ، محمد سلمان شاہد، جاوش نیر قریشی، اریبہ، محمد منصب علی، اقرا فصیح، نوید احمد فرید، معیز احمد، انوین جاوید خانزادہ، محمد آصف انصاری، مانیہ حبیب، حمزہ ایمان، نوید احمد فرید، معیز احمد ☆ بھکر: عمر رضا ملک، رانا بلال احمد ☆ اٹک شہر: اسامہ عثمان ☆ میرپور خاص: تابش محمد اکرم، روضہ محمود ☆ حیدرآباد: مانک خان ☆ ٹنڈو الہیار: محمد صمیان خان ☆ گھوٹکی: زینب اشتیاق ☆ جامشورو: حافظ مصعب سعید ☆ سرگودھا: ارفع افتخار ☆ راولپنڈی: فاطمۃ الزہرا ☆ بہاول پور: محمد احمد شاکر ☆ لاہور: محمد شاداب صابر۔

۱۲ درست جوابات بھیجنے والے پُر امید نونہال

☆ کراچی: آسیہ جاوید، مریم سرور، فہد فدا حسین کیریو، عریشہ بنت حبیب الرحمٰن، عریشہ نوید، حمنہ رحمٰن، عائشہ افضل، محمد انعام خان، واجد نگینوی، آسیہ جاوید احمد شیخ ☆ ملتان: محمد طلحہ صفدر، ایمن ☆ ساہیوال: حافظ خدیجہ آمنہ ☆ دریا خان: عبداللہ شاہ ☆ بھکر: محمد ارسلان تبسم ☆ نواب شاہ: حفصہ محمد طاہر قریشی ☆ کشمور: طارق محمود کھوسو ☆ صادق آباد: مقدس لطیف ☆ شیخوپورہ: احسان المحسن ☆ سکھر: قلزہ مہر، عمارہ ثاقب ☆ راولپنڈی: عبدالرحمٰن ☆ اٹک: بی بی سارہ شعیب۔

۱۱ درست جوابات بھیجنے والے پُر اعتماد نونہال

☆ کراچی: دردہ نور، تحلیل ارشد، جبیر کامران، ردا حسن، طاہر مقصود، محمد فیضان ملک، رضوان ملک، اقبال احمد خان، ایمان اسلم علی، مزمل عبدالعزیز، ولید ☆ راولپنڈی: حاجرہ ابراہیم ورک ☆ لاڑکانہ: اظہر علی پٹھان ☆ میرپور خاص: حفصہ اکرم ☆ واہ کینٹ: عبداللہ ☆ بھکر: محمد حنظلہ فاروق ☆ دادو: صائمہ ارشد ☆ حیدرآباد: پیر حیدر علی شاہ ☆ سرگودھا: محمد علیان جاوید۔

☆

بلاعنوان کہانی کے انعامات

ہمدرد نونہال اپریل ۲۰۱۴ء میں جناب جاوید بسام کی بلاعنوان انعامی کہانی شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی کے بہت اچھے اچھے عنوانات موصول ہوئے۔ کمیٹی نے بہت غور کرنے کے بعد ایک عنوان "تصویر کی حقیقت" کا انتخاب کیا ہے۔ یہ عنوان ہمیں مختلف جگہوں سے تین نونہالوں نے ارسال کیا ہے۔ ان نونہالوں کو انعام کے طور پر ایک کتاب بھیجی جا رہی ہے:

۱۔ امامہ حسن، کراچی

۲۔ سیدہ سبیکہ زہرہ، کراچی

۳۔ محمد طٰہٰ صفدر، ملتان

﴾ چند اور اچھے اچھے عنوانات ﴿

جعلی تصویر۔ خواب اور حقیقت۔ مصنوعی خواب۔ تصویر کا دھوکا۔

تصویر کی دنیا۔ ناکام منصوبہ۔ پُراسرار تصویر۔ تصویر کے دیس میں۔ سچا خواب۔

ان نونہالوں نے بھی ہمیں اچھے اچھے عنوانات بھیجے

☆ کراچی: وریشا جرات، بلال احمد، عائشہ الیاس، اریبہ امجد رندھاوا، سمعیہ محمد شاکر، ثمرہ اقبال، سیدہ سبیکہ زہرہ، عیشہ عظیم، واجد نگینوی، کنول فدا حسین کیریو، فاخرہ ساجد، محمد نبیل افتخار، حسن رضا قادری، صبا عبدالغنی، عائشہ قیصر، محمد سعد تونسوی، منشا فاطمہ، رضی اللہ خان، خدیجہ الشفا، کرن مرسلین، مصامص شمشاد غوری، محمد توقیر حسین، محمد سلمان شاہد، ماریہ بنت فیض، صدف آسیہ، ماہم خان، ایمان اسلم علی، محمد فارس خان، ناعمہ تحریم، حانیہ فاطمہ، لبنیٰ

جبیں، حمد رحمٰن، احمد نبال، شمسہ کنول عثمانی، عبیرہ صابر، ہانیہ شفیق، محمد اسفند یار خان، علیزہ سہیل، مریم عبدالرب، ثمین جاریہ، احزم جاوید، سید مرتضیٰ حسین رضوی، وردہ نور، زوبیہ جاوید رانا، عشا فلک، سید باذل علی اظہر، سید شہتل علی اظہر، سیدہ جویریہ جاوید، سید عفان علی جاوید، محمد عزیر، محمد فہد الرحمٰن، فضل قیوم خان، احمد حسین، احسن محمد اشرف، محمد اویس، طاہر مقصود، محمد ذیشان ریاض، محمد فیضان ملک، رضوان ملک، علی حسن نواز، فضل ودود خان، محمد عثمان نواز خان، مریم سرور، رمیز لطیف، عریشہ نوید، صارم بن وسیم، سیدہ مریم محبوب، سیدہ سائکہ محبوب، ایمن شہباز احمد، سید حسنین احمد، خلیل الرحمٰن، سویا خان، ربیعہ توقیر، محمد صہیب علی، فاطمہ عمران احسن، عبدالوہاب خان، زاہد محمود، بریرہ، حافظ عبدالعزیز، قراۃ العین ادریس، عبہر کامران، محمد ذیان خان، مریم حسن خان، عریشہ بنت حبیب الرحمٰن، فضیلہ فصیح، عرلیش علی، ثمین بابال، سید محمد فیضان، سید محمد حذیفہ، نادیہ اقبال، لاعبہ اعجاز، نوین جاوید خانزادہ، سیدہ عائشہ خلیق الرحمٰن، ازما جویریہ، حانیہ اشرف، عروج اسلام اختر، سیدہ نمیرہ مسعود، مومنہ عمران، فائز محمد فاروق، امامہ حسن ☆ حیدرآباد: ملائکہ خان، سید محمد عمار حیدر، مقدس، آفاق اللہ خان، ماہ رخ، اریبہ انجم، سیرونیہ شاہ، عبداللہ ضیاء الدین، عائشہ ایمن عبداللہ، پیر حیدر علی شاہ، انوشیہ سلیم الدین ☆ میرپور خاص: طلحہ محمد اسلم، دیپا کھتری اوم پرکاش، وقار احمد، زونش رندھاوا، نازش محمد اکرم، طلحہ محمد اکرم، احمد عبیدالرحمٰن ☆ سانگھڑ: علیزہ کاز منصوری، منیب احمد رندھاوا ☆ نواب شاہ: محمد طارق قاسم، حفصہ محمد طاہر قریشی، ایمن فاطمہ ظفر اقبال ☆ ٹنڈو الہیار: شاہ زین اختر، شبازمہ اختر، محمد سیف اللہ خان ☆ ڈیرہ اللہ یار: عمران خان کتیار، شیراز سکندر ملنگی ☆ ملتان: ثمینہ کاشف شجاع، ربیعہ

نعیم، محمد طٰہٰ صفدر، ایمن ☆ فیصل آباد: زینب ناصر، سارہ حامد ☆ لاہور: دیاج عرفان، ثریا کوثر انصاری، زویا زاہد، عطیہ جلیل، ماہین صباحت ☆ گجرانوالہ: خدیجہ شان قادری، حسن رضا سردار، صدام حسین قادری، نور فاطمہ قادری، محمد معین الدین قادری، محمد حامد رضا قادری، محمد حبیب نواز قادری ☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعدیہ کوثر مغل، محمد ولید طاہر ☆ ڈیرہ غازی خان: ایمان فاطمہ، عروج خان ☆ بھکر: رانا بلال احمد، محمد حنظلہ فاروقی ☆ پشاور: شبیر احمد، مانیہ شہزاد، محمد حمدان خان ☆ راولپنڈی: حور شمائل، مہر محمد احمد، ماہ نور ایمان، فاطمۃ الزھرہ، ماہین گلنار، داؤد ابراہیم ملک، عبدالرحمٰن ☆ اسلام آباد: عیشا مریم، فاطمۃ الزہرہ، فرحین ☆ اوتھل: محمد سبطین حاشر بھٹہ، شفق محمد علی ☆ سکھر: عمارہ ثاقب، فلزہ مہر ☆ بہاول پور: محمد احمد شاکر، مبشرہ حسین ☆ آزاد کشمیر: درشہوار خان، شہریار احمد چغتائی، اصباح احمد ☆ کنڈیارو: بہادر علی حیدر بلوچ، محمد ضرار بن عز احمد ☆ چوآ سیدن شاہ: عاقب جنید ☆ جامشورو: حافظ مصعب سعید ☆ بھکر: محمد مجیر خان ☆ صادق آباد: مقدس لطیف ☆ اٹک: عائشہ اعوان، بی بی سارہ شعیب ☆ واہ کینٹ: محمد شعیب انور ☆ سرگودھا: عبدالرحمٰن افتخار ☆ نوشہرہ کینٹ: محمد مجتبیٰ صدیق ☆ تلہ گنگ: عاطف ممتاز ☆ مردان: سہیل احمد یابوزئی ☆ بے نظیر آباد: فضہ سعید خانزادہ ☆ گھوٹکی: زینب رانیہ ☆ بدین: ماہ نور فاروق ☆ کشمور: طارق محمود کھوسو ☆ سیالکوٹ: صبیح الحسن ☆ میلسی: شاہ رودل ☆ گوجر خان: مریم لاثانی ☆ میانوالی: عبیرہ شمسہ ☆ کوہاٹ: ولید اللہ خان ☆ سرگودھا: زین خان ☆ دریا خان: عبداللہ شاہ ☆ صوابی: فرحین علی خان ☆ چار سدہ: رنزا ظفر ☆ خوشاب: محمد قمر الزماں۔

☆

نونہال خبرنامہ

سلیم فرخی
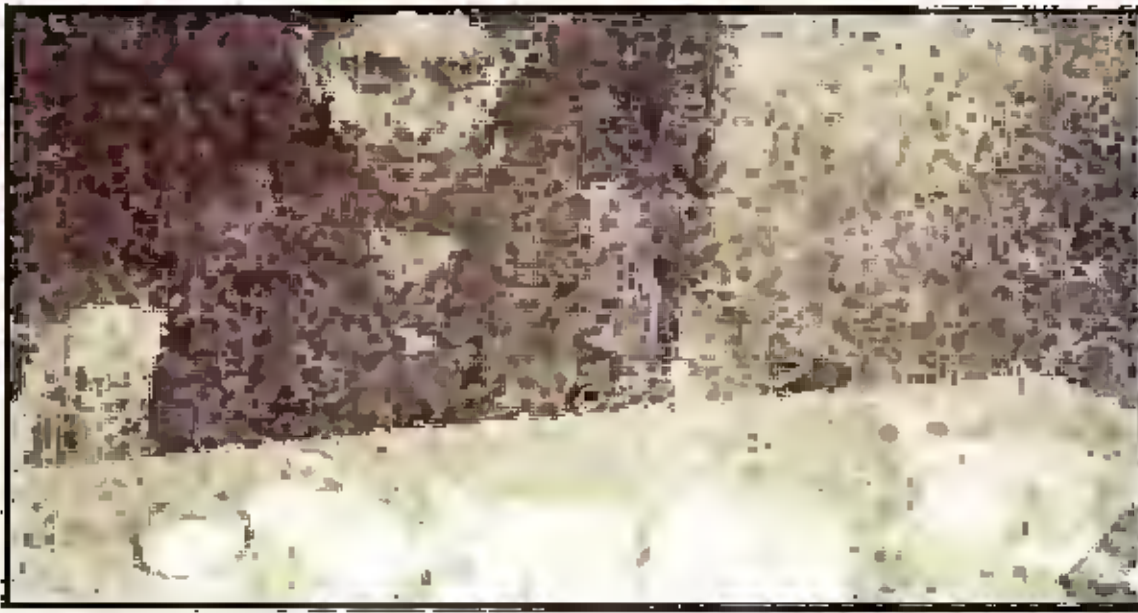
۲۵ سال سے ٹھوس غذا نہیں کھائی

بھارت میں ایک ۲۵ سالہ لڑکی پیدائش کے بعد سے اب تک ٹھوس غذا کے بغیر زندہ ہے۔ دارالحکومت نئی دہلی کے قریب "سونی پت" نامی قصبے میں رہنے والی "سونجو دھرُ دو" کو پیدائشی طور پر "اشالاسیا" نام کی ایک انوکھی بیماری لاحق ہے، جس کے نتیجے میں وہ ٹھوس غذا نہیں نگل سکتی۔ اس مرض کے شکار مریض کی خوراک کی نالی بند ہونے کی وجہ سے ٹھوس چیز معدے میں نہیں جا سکتی ہے۔ سونجو کے خاندان میں تین بہن بھائیوں میں سے کسی کو یہ بیماری لاحق نہیں ہے۔ اس انوکھے مرض میں مبتلا مریض اگر ٹھوس غذا کھانے کی کوشش کرے تو اسے خوراک معدے میں پہنچنے سے قبل ہی قے ہو جاتی ہے۔ البتہ دودھ، چائے اور پانی وغیرہ معدے تک پہنچ جاتا ہے۔

پانچ سال سے خوراک کے بغیر زندہ رہنے والا سری لنکا کا شہری

دنیا میں عجیب و غریب قسم کے انسان پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے مطابق آدمی خوراک کے بغیر صرف دو مہینے زندہ رہ سکتا

ہے، لیکن سری لنکا میں ایک ایسا شخص ہے، جس نے پانچ سال سے کوئی چیز نہیں کھائی، لیکن پھر بھی زندہ ہے۔ "ڈی ریزول" نامی اس نوجوان نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ اس کی خوراک صرف ہوا ہے۔ اسے جب بھوک لگتی ہے تو کسی باغیچے میں جا بیٹھتا ہے اور وہاں تازہ ہوا کو غذا کے طور پر استعمال کرتا ہے اور اس کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ وہ سری لنکا کے قومی کھیل کے مقابلوں میں "میرا تھن" میں گولڈ میڈل حاصل کر چکا ہے۔

دنیا کا سب سے غلیظ آدمی

کہا جاتا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے، لیکن ۸۰ سالہ "اموہاجی" نامی اس ایرانی شخص کو وہم ہے کہ صفائی اسے بیماری میں مبتلا کر دے گی اور اسی وجہ سے وہ گزشتہ ۶۰ سالوں سے نہایا نہیں ہے۔ اخبار تہران ٹائمز کے مطابق اموہاجی کو پانی چھونا تک پسند نہیں ہے اور جب کوئی اس سے نہانے کے لیے کہتا ہے تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ ۶۰ سال تک پانی اور صفائی ستھرائی سے دوری کے اثرات اموہاجی پر پوری طرح نمایاں ہیں اور اس کی جلد کی رنگت زمین کی طرح ہو چکی ہے۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ یہ کوئی انسان نہیں، بلکہ مٹی کا ڈھیر ہے۔ اخبار کا مزید کہنا ہے کہ صرف نہانا ہی وہ چیز نہیں ہے جو اموہاجی کو سخت ناپسند ہے، بلکہ وہ صاف کھانے اور پانی سے بھی دور بھاگتا ہے۔ وہ سڑے ہوئے بدبودار جنگلی جانوروں کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے۔ اموہاجی کو دنیا کا سب سے غلیظ انسان ہونے کا اعزاز دیا جا رہا ہے جو کہ اس سے قبل ایک بھارتی شخص کو حاصل تھا۔ ☆

ہنڈکلیا

ڈرم اسٹک مرسلہ : سمعیہ خلیل الرحمٰن، جھڈو

مرغی : ران کے پیس چار عدد
کالی مرچ پسی ہوئی : ایک کھانے کا چمچہ
لہسن (پیس لیں) : ایک پوتھی (درمیانی)
پودینہ پسا ہوا : تین چائے کے چمچے
اورک پسی ہوئی : دو چائے کے چمچے
کارن فلور : حسب ضرورت
ہری مرچ : ایک عدد (پیس لیں)
تیل : تلنے کے لیے
نمک : حسب ضرورت

ترکیب: مرغی کی ران کے بڑے ٹکڑے دھو کر خشک کرلیں۔ اب تمام مسالوں کا آمیزہ بنا کر اس میں آدھا کپ پانی ڈال دیں، پھر ران کے ٹکڑے ڈال کر ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ پانی خشک ہونے پر ٹکڑوں کو باہر نکال لیں۔ اب حسب ضرورت کارن فلور لے کر اس کا آمیزہ بنالیں اور ان ٹکڑوں کو اُن میں ڈبو کر ڈیپ فرائی کرلیں۔ مزے دار خستہ ڈرم اسٹک تیار ہیں۔ کیچپ یا املی کی چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

کھجور کے لڈو مرسلہ : نادیہ اقبال، کراچی

کھجور (بغیر گٹھلی) : ایک کپ
کشمش : آدھا کپ
پھیکا کھویا : آدھا کپ
ناریل (کدوکش کیا ہوا) : ایک کپ
پستے، بادام، اخروٹ وغیرہ کی باریک کٹی ہوئی گری : آدھا کپ

ترکیب: کھجور اور کشمش پیس لیں اور اس میں کھویا مسل کر ملا دیں۔ حسب ضرورت آمیزہ ہاتھ میں لے کر دبائیں۔ درمیان میں کٹی ہوئی گری رکھ کر ناریل میں لپیٹ کر پلیٹ میں رکھ دیں۔ تمام لڈو اسی طرح بنالیں اور غذائیت سے بھرپور ان لڈوؤں سے لطف اُٹھائیں۔☆

نونہال لغت

تہنیت	تَ ہ نِ یَت	مبارک باد۔ مبارک باد دینا یا لینا۔
آلکسی	آ لْ کَ سِی	سستی۔ کاہلی۔ کام سے جی چرانا۔
سحاب	سَ حا ب	بادل۔ ابر۔ گھٹا۔
حرب	حَ رْ ب	لڑائی۔ جنگ۔ کارزار۔
اختصاص	اِ خْ تِ صا ص	کسی چیز سے غیر معمولی وابستگی۔ تعلق یا نسبت۔ کسی شخص سے خاص ربط۔ تقرب۔ کسی بات میں امتیاز و برتری۔
نبرد آزما	نَ بَ رْ دْ آ زْ ما	جنگ آزمودہ۔ جنگی۔ بہادر۔ شجاع۔ دلیر۔ دلاور۔
گراں	گِ رَ ا ں	ثقیل۔ وزنی۔ بھاری۔ بوجھل۔ مہنگا۔ ناگوار۔ تکلیف دہ۔
کانا پھوسی	کا نا پھُ سِی	چپکے چپکے باتیں کرنا۔
برہان	بُ رْ ہا ن	دلیل۔ قطعی دلیل۔ جس میں شک و شبہ نہ ہو۔
سوانح	سَ وا نِح	سانحہ کی جمع۔ حادثات۔ حالات۔
رموز	رُ مُو ز	رمز کی جمع۔ اشارہ۔ نکتہ۔ باریکی۔ راز۔ مخفی یا پوشیدہ بات۔
معتمد	مُ عْ تَ مَ د	اعتبار کیا گیا۔ بھروسا کیا گیا۔ قابل اعتبار۔ سیکریٹری۔
لسان	لِ سا ن	زبان۔ بولی۔ بھاشا۔
لسّان	لَ سْ سا ن	بہت بولنے والا۔ چرب زبان۔ چکنی چپڑی باتیں بنانے والا۔
خانم	خا نُ م	خان کی مؤنث۔ اعلا خاندان کی عورتوں کا لقب۔ امیرزادی۔ بیگم
خستہ حال	خَ سْ تہ حا ل	پریشان۔ آزردہ۔ شکستہ دل۔ رنجیدہ۔ ناخوش۔
آہو	آ ہُو	ہرن۔

نہیں ایک ہی فٹ بال کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ آپ مجھے ووٹ دیں، میں ہر کھلاڑی کو الگ الگ فٹ بال دوں گا۔"

مرسلہ : سمیہ وسیم، سکھر

ایک صاحب نے اپنے بے حد موٹے دوست سے کہا: "تم جیسے موٹے آدمی عام طور پر بڑے خوش مزاج ہوتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ انھیں برا بھی کہو تو ہنس کر ٹال دیتے ہیں؟"

موٹے دوست نے جواب دیا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیے لڑنا اور بھاگنا دونوں ہی مشکل کام ہوتے ہیں۔"

مرسلہ : نام، جگہ نامعلوم

مالک: "کام کرتے کرتے تم بھاگ تو نہیں جاؤ گے؟"

ملازم: "جی نہیں، اس سے پہلے میں تین سال ایک جگہ رہا اور بالکل نہیں بھاگا۔"

مالک: "تین سال تک کہاں کام کرتے رہے؟"

ملازم: "جیل میں۔"

مرسلہ : محمد طارق قاسم، نواب شاہ

کرائے کے مکان کے باہر بورڈ لگا ہوا تھا کہ یہ مکان صرف ان لوگوں کو ملے گا، جن کے گھر کوئی بچہ نہیں ہوگا۔

بورڈ دیکھ کر ایک بچہ مالک مکان کے پاس آیا، کہنے لگا: "یہ مکان مجھے دے دیں، کیوں کہ میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ البتہ دو ماں باپ ہیں۔"

مرسلہ : سمیہ طالب قریشی، نواب شاہ

ایک صاحب نے ہوٹل میں چرغے کا آرڈر دیا۔ چرغہ آیا تو اسے چکھنے کے بعد انھوں نے دوبارہ ویٹر کو بلایا اور پوچھا: "تمھارے ہاں چرغہ کس طرح تیار کیا جاتا ہے، آگ پر یا گیس پر؟"

"ہمارے ہاں چرغہ بجلی کے ذریعے پکایا جاتا ہے جناب؟" ویٹر نے ادب سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، اسے لے جاؤ اور دو تین جھٹکے اور لگا کر لے آؤ۔"

مرسلہ : عظمت حیات، چنڈوادن خان

بچہ گھر سے ڈانٹ کھا کر اسکول جا رہا